اوراقِ معانی

غالب کے فارسی خطوط (مشمولہ پنج آہنگ کا)

اُردو ترجمہ

مترجم و مرتب:

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

اوراقِ معانی

غالب کے فارسی خطوط (مشمولہ پنج آہنگ) کا

اردو ترجمہ

اوراقِ معانی

[illegible]

مترجم و مرتب

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

اردو اکادمی دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۷۰

AURAAQ-E-MAANI

Translated & Compiled by

Dr. Tanveer Ahmed Alvi

Pub.by

URDU ACADEMY, DELHI

Prints

1992, 2001, 2010

Rs. [redacted]

ضابطہ

سنین اشاعت

۱۹۹۲ء، ۲۰۰۱ء، ۲۰۱۰ء

ایک سو پچیس روپے

اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی ۲

اردو اکادمی، دہلی۔ سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-084-8

مُشتملات

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہرِ بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور

انھیں رو بہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

زیرِ نظر کتاب اوراقِ معانی غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام وہی انجام دے سکتا ہے جو ہر دو زبانوں پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہو۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اکادمی کی درخواست پر یہ گوہر آب دار یکجا کی ہے، ان کا ترجمہ کیا اور اپنے عالمانہ مقدمے میں ان خطوط کی ادبی اور ثقافتی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے لیے ہم ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی علمی کاوشوں کے ممنون ہیں۔ غالب کے خطوط کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئر پرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں پسند کی جاتی رہے گی۔

مرغوب حیدر عابدی

سکریٹری

مقدمہ

غالب کے فارسی خطوط

مرزا غالب کی شخصیت اپنے عہد کی شناخت اور ان کا شعورِ زیست آنے والے دور کے لیے ایک نشانِ منزل ہے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کی پیدائش ارضِ تاج (اکبر آباد) میں اس وقت ہوئی جب اٹھارھویں صدی عیسوی اپنے عہدِ آخر کے انقلابات اور دور رس تاریخی تغیرات کے ساتھ اپنا سفر ختم کر رہی تھی۔ بدلتے ہوئے زمانے اور نئے مستقبل کی طرف بڑھتی ہوئی زندگی نے اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے تاریخ کا ایک اور اہم ورق الٹ دیا تھا۔

سنہ ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم کے معرکے میں ٹیپو سلطان (شہید) کو سرکارِ انگریزی کمپنی بہادر کے فوجی عمال کے ہاتھوں شکست ہوئی اس کے بعد جنوب میں ایسی کوئی طاقت نہ رہی جو مغربی اقتدار کے بڑھتے ہوئے سایوں کے مقابلہ میں روشنی کی دیوار ثابت ہو خود شمالی ہند میں بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مستحکم ریاست کے ماسوا کوئی ایسی مقامی و علاقائی حکومت نہ تھی جسے انگریزوں کا حریف قرار دیا جا سکے۔

سنہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی کمان میں پیش قدمی کرتی ہوئی انگریزی افواج نے مغلوں کے شاہی شہر جہاں آباد پر قبضہ کیا نیز شہر اکبر آباد کا تاریخی قلعہ

مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے انگریزوں کے حوالے کیا، اپنی چار سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ ان کی پناہ میں آ گئے اور جاگیر و تنخواہ سے ممتاز ہوئے۔

اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کا قیام بھی عمل میں آیا جس کا بنیادی مقصد تو مغربی عمّال و افسران کو ہندوستانی زبان اور اس ملک کی تہذیب و روایت سے آشنا کرنا تھا لیکن اس کالج کے اثراتِ مابعد کے نتیجہ میں، اردو زبان ایک نئے تہذیبی و لسانی رجحان کے سانچہ میں ڈھلتی چلی گئی۔

اس نئی تہذیبی عملداری کے تمدنی ثمرات اور مثبت اثرات کو ہم جن ادبی و ثقافتی رویوں میں نمود پزیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں ان کی بازیافت غالب کے شعر و شعور اور ان کی عصری حسیت کے مطالعہ میں ممکن ہے۔ اس دید و دریافت کا ایک خصوصی پہلو غالب کے فارسی خطوط کی سیر سے متعلق ہے۔

غالب نے ان خطوط میں جو کچھ لکھا ہے اور جس طرح لکھا ہے اس کی بازدید تاریخ و تہذیب کے اس دور کی ایک "نیم رُخ تصویر" سہی مگر یہ تصویر غالب کے زاویۂ نگاہ کے حسن اور طرفگی کے باعث محض "نظرے خوش گزرے" کی سی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ اس دورِ زندگی کے ذہنی انقلاب اور اس موجِ خوں کے شناور بھی ہیں جو اس عہد کے سر سے گذر رہی ہے۔

اس زمانۂ زندگی میں جاگیرداری نظام کی شکست و ریخت کا عمل انگریزی عملداری کے منطقہ میں زیادہ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے غالب جس کے قدر شناس اور مزاج داں ہیں مگر جس کے تحفظ و بقا کا مسئلہ اب زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ ڈھلتے ہوئے سورج کے نقرئی بازوؤں کی طرح اب اس کے اثرات سمٹ رہے ہیں محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے مدِمقابل مغربی اقتدار کے سائے برابر پھیلتے اور بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں

غالب اس نظام سے نسبتاً ایک کم قوت و غیر موثر جزو کے طور پر وابستہ ہیں مگر اس کی شاندار روایات کے ادبی مورّخ اور تہذیبی مرقع نگار ہیں ان کا معاشرتی

انداز نظر اور نئی حقیقتوں سے دو چار طبقاتی ذہن گویا خود بھی دھوپ چھاؤں کے اس کھیل کی بازی گاہ ہے۔ ان کے فارسی مکتوبات میں اس جہانِ گذراں کی متحرک پرچھائیاں عجیب پُرکار و پرکشش انداز سے در آئی ہیں۔

محفلیں درہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

غالب کے جدِ بزرگ مرزا قوقان بیگ اور ان کے پیشہ سپہ گری سے متعلق معلومات کا ماخذ بیشتر غالب کی اپنی تحریریں ہیں ان کے والد ماجد عبداللہ بیگ خاں بحیثیت ایک مہم جو اور تقدیر آزما کے اودھ اور حیدر آباد کی ریاستوں سے بھی وابستہ رہے بالآخر اپنی سپاہیانہ قدرت کار کے ساتھ وہ مہاراجہ الور کی فوج میں رسالدار تھے ـــ راج گڈھ کے مقام پر کسی محاربہ میں کام آئے اور وہیں مدفون ہوئے غالبؔ نے مہاراجہ الور کے لیے اپنے ایک قصیدہ میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاکِ راجگڈھ، پدرم را بود مزار

مرزا عبداللہ بیگ کی وفات غالبؔ کی بہت ہی کم سنی میں ہوئی اس کے بعد ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے ان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا یہ مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد آگرہ کے قلعہ دار تھے۔ پھر حالات کا رخ دیکھ کر اور اپنے برادر نسبتی فخر الدولہ نواب احمد بخش کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے انگریزوں کے طرف دار ہو گئے اس کے صلہ میں پرگنہ سونک سونسا اُن کو جاگیر میں عطا ہوا۔

زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ انھوں نے بھی ہاتھی سے گر کر وفات پائی۔ غالبؔ نے ایک خط میں اس کا تذکرہ اس طور پر کیا ہے کہ وہ انگریزوں کی حمایت میں اُن کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے کسی معرکہ میں کام آئے .... کمپنی بہادر کی سرکار نے جاگیر کے بدلے میں ان کے وارثوں کے لیے پنشن مقرر

کردی جس میں غالب بھی شریک تھے۔

بعد میں نواب احمد بخش خاں نے انگریز کمپنی بہادر کے کمانڈر اعلیٰ لارڈ لیک بہادر سے کوئی نیا معاملہ کیا جس کے تحت وارثانِ نصراللہ بیگ خاں کو دی جانے والی رقم میں تخفیف ہو گئی اور پنشن فیروز پور جھرکہ کے ریاستی خزانے سے ادا کی جانے لگی۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس سے آگے چل کر غالبؔ نے اختلاف کیا اور فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں کی وفات سے پہلے ہی سرکارِ انگریزی میں مرافعے اور اس کے بعد امرزبان فیروزپور نواب شمس الدین احمد خاں سے مخالفت اور مقدمہ بازی کی نوبت آئی جس کے لیے غالب کی طرف سے سفر کلکتہ کی مہم کا آغاز نہ کہیے نواب فخرالدولہ کی اواخر زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔

غالبؔ کی شادی نواب فخرالدولہ کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں مرحوم کی بیٹی امراؤ بیگم سے اس صورت حال کے پیدا ہونے سے تقریباً چودہ پندرہ برس پہلے ہو چکی تھی نواب ضیاءالدین احمد خاں (نیرؔ، رخشاں) نواب امین الدین احمد خاں اور نواب علاءالدین احمد خاں سے خاندانی تعلق کی بنیاد خاص طور پر یہی خوش دامانی رشتہ تھا، خود نواب نصراللہ بیگ خاں بھی اسی خاندان میں بیاہے گئے تھے اور نواب احمد بخش خان و الٰہی بخش خاں معروف کے بہنوئی تھے۔ غالب کی والدہ نواب غلام حسین خاں کمیدان کی دخترِ نیک اختر تھیں جو سرکار سہارنپور میں عسکری خدمات پر مامور رہ چکے تھے۔

غالب کے رئیسانہ ذہن اور جاگیر دارانہ مزاج میں اسی جاگیر دارانہ روایت اور آبائی پیشہ سپاہ گری کو دخل تھا اور یہی خاندانی روایت اور جاگیر دارانہ رشتوں سے وابستہ پنشن ان کے لیے گوناں گوں الجھنوں کا باعث بھی بنتی رہی۔ غالب کے اردو خطوط کے ماسوا فارسی مکتوب میں بھی یہی داستان بے ستون و کوہ کن بکھری پڑی ہے۔ اسی کا ایک حصہ غالب کا سفر کلکتہ بھی ہے جس کے دوران وہ گوناں گوں مشاہدات و تجربات سے گزرے۔ ان تجربات و توقعات

کا بیان، احباب سے ذہنی قربتوں کا ذکر اور ان کا اثر و تاثر تادیر و تا دور بصورت تحریر یا بزبانِ قلم گفتگوؤں میں جھلکتا رہا۔

کلکتہ کے اس سفر کے آغاز میں غالب فیروز پور جھرکہ پہنچے اور وہاں سے واپسی میں دلّی آنے کے بجائے سیدھے دیارِ مشرق کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس سفرِ در سفر میں مرزا کی چند در چند مالی مشکلات کو خصوصیت سے دخل تھا مرزا نے اپنے ایک خط میں اس طرف اشارہ بھی کیا ہے جو میر اعظم علی مدرس مدرسۂ اکبر آباد کو لکھا گیا ہے:

"ہنگامۂ دیوانگی برادر یک طرف و غوغائے دام خواہاں یک سو آشوبے پدید آمد کہ نفس راہِ لب و نگاہ روزنۂ چشم فراموش کرد۔ گیتی بدیں روشنی روشنائی تیرہ و تار گشت۔ با لبے از سخن دوختہ و چشمے از خود فرو بستہ جہاں جہاں شکستگی و عالم عالم خستگی با خود گرفتم، و از بیداد روزگار نالاں و سینہ بر دمِ تیغ مالاں، بکلکتہ رسیدم۔"

لیکن مرزا سیدھے کلکتہ نہیں پہنچے پہلے لکھنؤ گئے وہاں سے کانپور کا رُخ کیا کچھ دن کے لیے باندا (بندیل کھنڈ) ان کی آرام گاہ بنا رہا کہ ان دنوں میں ان کی طبیعت بھی کچھ ماندی تھی یہاں سے رخصت ہو کر الہ آباد اور وہاں سے بنارس پہنچے اور بنارس سے عظیم آباد اور مرشد آباد ہوتے ہوئے واردِ کلکتہ ہوئے جو ان کا امید گاہ اور حصولِ مراد کے لیے مرکزِ دل و نگاہ تھا۔ اس سفر کے مرحلے بہت دلچسپ تھے اور ان کے فارسی خطوط میں ان کا بیان بہت ہی پرلطف انداز سے آتا ہے۔

وسائل سفر میں کوئی چھکڑا نما شے بھی ان کے ساتھ رہی تھی جسے غالب "گردونہ" کہتے ہیں اور مقامی زبان میں اُسے وہاں "لڑھیا" کہا جاتا ہے یہ بقول غالب

"آہستہ خرام بلکہ مخرام" کی قسم کی کوئی چیز تھی۔

سفر کا بڑا حصہ کشتیوں میں طے ہوا جو اس زمانہ میں زیادہ آرام دہ صورت رہی ہوگی۔ یہ بیان اُنھیں کی زبان قلم سے سنیئے:

"از گردونِ دون ستوہ آمدہ خود را بدریا انداختم یعنی ازیں مقام کشتی بکرایہ گرفتہ و آدم و متاع ہمہ درو وے گنجیدہ "بسم اللہ مجریہا و مرسا ہا" خواندہ سفینہ در رو و جمن را ندم و امید اینکہ بہ الہ آباد رسیدہ توقفے کردہ در بنارس می خواستم بہ دریں لقعہ کار بندم، و روزے چند اسایشے کردہ و مایحتاج بہ امصار سانیدہ ربگرا شوم۔"

یہ "حکایتِ سفینہ و سفر" یہیں ختم نہیں ہوتی کشتی کا لمبا چوڑا کرایہ خود اپنے طور پر ایک بارِ گراں ثابت ہوا جس کے ساتھ سفر کرنا آسان نہیں رہا اس لیے مرحلۂ سفر کے بجائے راحلۂ سفر کو بدلنے کی صورت سامنے آئی۔

"امروز کہ آدینہ بقول جمعے نہم ماہ و باظہار گروہے دہم ست در بند بستن رختِ سفرم۔ اگر شب بخیر گزشت و وجودِ موہوم راجع بعدمیتِ اصلی خود نگشت فردا بروز شنبہ از بنارس می پویم۔

ہفتہ نماند کہ ناخدایان خدا ناشناسِ بنارس در باب کشتی مضائقہ کردند چہ ہر کہ بہ خوردم تا کلکتہ کم از صد روپیہ نہ طلبید و تا پٹنہ افزوں از بست روپیہ خواست، ناچار ہماں اسپ سوارہ تابداں لقعۂ صحرا (راہ) خواہم رفت (و لے) ہنوز ہوائے کشتی از سر بدر نرفتہ در پٹنہ نیز جستجو خواہم نمود"

کلکتہ اس دور تاریخ کی ایک نئی سیاسی ادبی اور تہذیبی علامت ہے۔ اس سے پیشتر کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ہندوستان کے شمالی مشرقی صوبے (بنگال) کا ایک شہر جس کی ابھی کوئی تاریخ بھی نہ رہی ہو کسی گیتی ستان اور ہندوستان گیر قوت کا مرکز ریاست بن جائے۔ یہ ایک معنی میں نو آباد شہر اس

وقت مغرب کی ایک تاجر پیشہ، توسیع پسند اور صنعت کار قوم (انگریز) کا مرجع و مرکز بنتا جا رہا تھا اور یہیں سے ہندوستان کے لیے تاریخ و تہذیب کی ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔

غالب جب وہاں پہنچے تو اس کی ترقیات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے یہاں آنے کے فوراً بعد انھوں نے اپنے برادر نسبتی مرزا علی بخش بہادر کو جو خط تحریر کیا ہے اس میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلمبند کیے ہیں؛

"غالب رہ رو را روزگار بادیہ نوردی بسر آمدہ در رخت سفر بہ سر منزل کلکتہ کشودہ شد، چہ کلکتہ جہانے از ہر گونہ کالا مالامال بجز چارۂ مرگ، ہر چہ گوئی پیش ہنروا نش سہل و جز بخت خوش، ہر چہ خواہی بہ بازارش فراواں"۔

غالب نے اس شہر کی صفائی ستھرگی عمدہ آب و ہوا اور خوش حالی کا ذکر کیا ہے اس سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہاں آبادی کی وہ ہما ہمی اور گھما گھمی نہ تھی کہ سر چھپانے کو جگہ نہ مل سکے۔ انھیں اپنی رہایش کے لیے شملہ بازار میں جو مکان دس روپے ماہانہ کرایہ پر ملا تھا، اس سے بھی اس صورت حال کا پتہ چلتا ہے۔

یہاں سے جانے کے بعد بھی وہ اس شہرستانِ حسن کی خوش گوار فضا اور پرکشش ماحول کو نہ بھول سکے

ایک اور خط میں بھی انھوں نے وابستہ تعلقِ خاطر کے ساتھ اس جلوہ گاہِ مشرق کو یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ دنیا میں ایسا پر فضا شہر اور کہاں ملے گا اس دیار کی "خاک نشینی" دوسرے علاقوں کی مسند نشینی سے بہتر ہے۔ میں جانتا ہوں اور میرا خدا اگر میں آزادانہ زندگی گزار رہا ہوتا اور عیال داری کا طوق میری گردن میں نہ پڑا ہوتا تو جو کچھ میرے پاس تھا بے تکلف اسے اڑا دیتا اور اس بقعۂ زمین میں پہنچ جاتا۔

چونکہ وہ داد خواہی کے لیے وہاں پہنچے تھے اور ان کے خیال سے معاملہ حکام بالا سے متعلق تھا اس لیے اس بارۂ خاص میں جو کچھ دیکھا اور سنا اس کی طرف بھی اپنے مکتوب میں خصوصیت کے ساتھ اشارے کرتے رہے ہیں علی بخش بہادر کو ایک دوسرے خط میں لکھا ہے۔

"مخفی نماناد کہ از جاہ منداں ایں دیار علی اکبر خاں نام بزرگ ست گراں مایہ و بلند پایہ دانش مند و نکوئی پسند۔ چوں دانستہ است کہ بالادستان کونسل کار مرا کہ داد خواہ آمدہ ام بفرماروائے دہلی سپردہ اند سپارش نامۂ اندریں باب رقم کردہ است و من آں را بر نوردنامۂ خود بہ لالہ ہیرالال وکیل فرستادہ ام و شنیدہ ام کہ آں نامہ بنظر شاں گزشت۔"

اسی کے ساتھ انھوں نے یہ اطلاع بھی فراہم کی کہ کرنل ہنری املاک کہ سپاہ انگریزی کے افسران میں اسی طرح ممتاز ہے جیسے ستاروں میں "ماہ" اور صاحب ریزیڈینٹ دہلی کا قریبی دوست ہے میرے لیے اس نے کلماتِ خیر لکھے ہیں اس سے یہ توقع ہے کہ حاکمِ دہلی کی توجہ مجھ داد خواہ کی طرف مبذول ہوگی۔ اور اس کی رپورٹ آنے پر یہاں کوئی کارروائی عمل میں آئے گی۔

ایک خط میں سیمین فریزر اسسٹینٹ سکتر سے اپنی ملاقات اور اس سلسلہ کے بعض آداب و رسوم کا تذکرہ کیا ہے۔

"ملاقات شائستہ روے داد و استقبال و مشایعت و معانقہ و عطاے پان درمیان آمد طرزِ ملاقاتِ ایں ستودہ خو، خورسند و توانا دلم کرد"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں انگریز افسران بھی رئیس زادوں کے احترام میں کھڑے ہوجاتے استقبال کے لیے آگے بڑھتے چند قدم برسم مشایعت ساتھ چلتے معانقہ کرتے اور عطر و پان پیش کرتے تھے۔ مشرقی آداب

کی یہ پاس داری اور "عوائد رسمیہ" کی یہ نگہداشت قابل توجہ ہے۔

یوں بھی اس وقت کے انگریز افسران نواب کہلاتے مشرقی طرز کی بڑی بڑی حویلیوں میں رہتے رقص طوائف سے محظوظ ہوتے اور بعض شعر و سخن سے بھی دل چسپی کا اظہار کرتے اور اس طرح اس دور میں مسند نشینی کے آداب و رسوم کو نباہتے۔ مرزا غالب نے ان کے شکار پر نکل جانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ نیز جیساکہ مذکورہ ملاقات کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے بعض انگریز افسران اور سر برآوردہ افراد سے مرزا کے تعلقات بہت خوش گوار تھے اور وہ مرزا سے خندہ پیشانی و شگفتہ خاطری کے ساتھ ملتے تھے۔

یہ دوستانہ مراسم اپنے طور پر ایک بامعنی اور نتیجہ خیز رویہ بھی تھا انھیں ذہنی ہم آہنگیوں کے تاریخی موثرات میں اس کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے کہ راجہ رام موہن رائے اور سر سید جیسے بالغ نظر ہندوستانیوں نے نئے تہذیبی تقاضوں اور تمدنی ماحول کو "خوش آمدید" کہا۔

اسی خط کے ذیل میں غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو درخواست نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے تیار کی گئی تھی اُسے انگریزی سرکار کے دستور کے مطابق صاحب سکتر بہادر نے کسی دوسرے انگریز افسر کو سپرد کیا کہ اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرا دیا جائے۔ اس سے انگریزی انتظام اور اس کے قایم کردہ نظام عدل و داد میں انگریزی زبان کی اعلیٰ حیثیت اور اس کو جاننے کی ضرورت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

غالب کلکتہ کوئی توقع لے کر گئے تھے وہاں کے اہل دانش و داد نے ان سے ہمدردانہ و مخلصانہ سلوک بھی کیا لیکن مقدمہ کی کارروائی اور اس کے وسیلہ سے ان کی مقصد برآری حسب دلخواہ عمل میں نہ آئی۔ اس کے لیے حاکم دہلی سے رپورٹ مانگی گئی اس طریقہ کار نے ان کی راہ میں نئی دشواری پیدا کردی اور دہلی سے دور رہتے ہوئے وہ مجبور ہوئے کہ یہاں اپنا کوئی وکیل مقرر کریں۔

رائے چھجمل بھی اسی سلسلہ میں ان کا ایک وسیلہ تھے۔ جن کے نام ایک سے زیادہ خط اس مجموعہ میں شامل ہیں منشی جواہر سنگھ انھیں رائے چھجمل کے بیٹے تھے۔

حکام والاشان تک پہنچنا آسان نہ تھا ان کے دورے اور دربار کے موقع پر ہی ان تک رسائی کی کوئی صورت پیدا ہوتی تھی اسی حصولِ ملازمت (رسائی دربار) کی غرض سے وہ کلکتہ سے رواں دواں دہلی واپس آئے اپنے ایک خط میں انھوں نے لارڈ ولیم بنٹنگ بہادر کی دہلی میں آمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

(ترجمہ) .... آج جمعہ کا دن ہے اور ماہ اپریل کی ۱۲ تاریخ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں کہ وقت فرصت ہے .... معلوم ہونا چاہیے کہ لارڈ ولیم بنٹنگ بہادر مارچ کی ۲۶ تاریخ کو اس دیار میں پہنچے اور کوٹھی ریزیڈینسی میں فروکش ہوئے بعد دو دن کے لشکر اور بازار لشکر کی جمعیت درہم برہم ہوگئی اور لوگوں کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ ڈیرۂ خاص شملہ کے لیے روانہ ہوگیا صاحبانِ سکرتر نے شہر میں جابجا طرح اقامت ڈال دی مولوی محمد محسن و مولوی سید محمد مجھ ناچیز کے غم کدے میں آرام فرما رہے اس کے بعد ریزیڈینسی کے پاس اپنی گنجایش کے مطابق ایک کاشانہ کرایے پر لے لیا اور وہاں فروکش ہے ....

بادشاہ دہلی نے نواب عالی جناب سے ملاقات نہیں کی صاحب سکرتر بہادر ریزیڈینٹ کی معیت میں بارگاہ خسروی میں پہنچے اور مختارانِ شاہی نے گورنر جنرل کے حضور میں شرف باریابی حاصل کیا باریابی عام کی صورت یہ تھی

.... اپریل کی ۵ تاریخ کو باریابی کی اجازت عام ملی اور لوگوں نے جوق در جوق اور گروہ در گروہ اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق زمین

بوسی کی سعادت حاصل کی وہ ہما ہمی دیکھنے میں آئی کہ قاعدہ و دستور کے مطابق کوئی ممانعت جیسے باقی نہ رہی تھی۔ کچھ پوچھ گچھ بھی نہیں ہوئی جس نے چاہا نذر پیش کی اور جس نے چاہا صرف کورنش بجالایا۔"

اسی طرح ایک خط میں نواب گورنر جنرل کی آمد آمد کی خبر سے متعلق لکھا ہے "نواب گورنر جنرل بہادر جیسا کہ آئین ہے سفر کرتے اور دادگستری فرماتے ہوئے ادھر (دہلی) آتے ہیں اور یہاں سے گزر کر آفتاب کے برج حمل میں تحویل کے وقت کوہستان شملہ کی طرف نہضت فرماتے ہیں، گرمی کے ایام وہیں گزارتے ہیں۔۔۔ نواب گورنر جنرل بہادر کی اس گام فرسائی اور جلوس فرمائی کے وقت ہر شہر و دیار سے لوگ آ کر شرفِ ملازمت حاصل کرتے ہیں اور ہر ایک کو اس کے مرتبہ کے مطابق کارِ لائقہ تفویض کیے جاتے ہیں۔

اب ناگاہ یہ سننے میں آیا کہ کوکبۂ گورنری کی آمد صرف الہ آباد تک ہوگی۔ کچھ لوگوں کا خیال کہ اور وہاں سے خیام دولت کلکتہ کی طرف واپس لوٹ جائینگے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ الٰہ آباد میں ٹھہریں گے اور دو تین ہفتے اس بقعۂ زمین میں آرام فرمائیں گے۔

سرکار انگریزی کے دستور اور حکومت کی روش کے باب میں غالب نے اپنے متعدد فارسی خطوط میں لکھا ہے اور اس عہد کے حکمرانہ رویے اور انتظام عدل و داد کا ایک متحرک منظر نامہ پیش کیا ہے۔ انھیں توقع تھی کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا کسی نہ کسی طرح رخ بدل سکیں گے اور ان کا جائز حق ان کو مل جائے گا، جس کے لیے وہ برسوں تک دوڑ دھوپ کرتے رہے، لیکن شدہ شدہ اس کی طرف سے ناامید ہوگئے۔ تاہم انگریزوں کے نظام دانش و داد کے خلاف ان کے یہاں کوئی ایسا رویہ سامنے نہیں آتا جسے مخالفانہ تنقید کہا جا سکے ہاں وہ اس کی طرف سے اپنی مایوسی اور احساسِ محرومی کا اظہار ضرور کرتے ہیں اور بڑے غم ناک لہجہ میں کرتے ہیں۔

"... منم کہ معاشِ من از گوناگوں رنج در رنگ رنگ عذاب، بہ معادِ کفار ماند، خوں در جگر و آتش در دل و خار در پیراہن و خاک بر سر، ہیچ کس بدیں روزگار مباد"

اس ذہنی کوفت اور قلبی اذیت کو انھوں نے لارڈ ولیم بینٹنگ کے رویے اور حاکمانہ روش پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا ہے۔

(ترجمہ)

اس زمانہ میں حاکمِ حقیقی کے فرمان کے مطابق میری بدخوئی، خام طبعی اور ہوسناکی کے تباہ کن عناصر جن سے میرا خمیر تیار کیا گیا ہے، رنگ لا رہے ہیں، پہلے مجھے غصہ میں تپایا گیا، اس کے بعد ایک میانہ قد اور بزرگ شکم شخص کو مسلط کر دیا گیا، جس نے میرے جامِ زندگی میں زہر گھول دیا اور میرے دل کی دنیا میں عجیب طرح تباہی مچا دی اب وہ ہندوستان میں گھوم رہا ہے اور اس ویرانۂ آباد میں بے تکلف دشت نوردی اور کوہ پیمائی کر رہا ہے۔ مرحلہ بہ مرحلہ منزل بہ منزل ظلم کی آگ کے شعلے بڑھ رہے ہیں اور اللہ کی مخلوق ان پر کالے دانے کی طرح جل رہی ہے۔

اسی گورنر جنرل کے بارہ میں اس کے ایک دربار کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے۔

(ترجمہ) لارڈ ولیم بینٹیگ بہادر نے تیسری مرتبہ دہلی میں نزول اجلال فرمایا ہے۔ زمیندار، سرکار سے وظیفہ پانے والے شہر کے رئیس اور سر برآوردہ لوگ وہاں پہنچے عطر و پان سے ان کی تواضع کی گئی۔ غالب مستمندے جو کشتۂ صورت اعمال ہے، اس میں شرکت نہ کی اور بارگاہ گورنری میں باریاب نہ ہوا۔

غالب اس زمانہ میں اپنے پنشن کے اس مقدمہ اور اس سے متعلق اخراجات سے زیر بار

تھے ظاہر ہے کہ یہ وقت ان کے اور ان کے متعلقین کے لیے انتہائی مشکلات اور صبر آزمائیوں کا ہو گا۔ زیر نظر فارسی مکتوبات کی سیر میں بھی حالات کی ان سنگینیوں کو دیکھا جا سکتا ہے ایسے نازک اوقات میں انکے اپنے مخیر احباب اور کرم فرما و عزیز بطور خدمت و حسن سلوک جو کچھ بھیجدیتے ہونگے بہت کچھ انسی نذر وفتوح پر انحصار رہتا ہو گا۔

انھوں نے تیر شکستہ، آباؤ کو اپنا قلم بنا لیا تھا اور قلم کی یہ خدمت بعض دوسرے اہل قلم کے حصہ میں بھی آئی اور آتی رہی بعض، یہ کہیے، کہ خوش قسمت شعراء اہل ثروت کے دربار سے بصیغۂ شاعری وابستگی اختیار کیے رہتے تھے۔ صلہ وانعام کی توقع کے ساتھ یہ سلسلہ بھی کتنا ہی کمزور ۔ یا بیشتر صورتوں میں تکلیف دہ سہی، غالب نے اس دور میں اختیار نہیں کیا۔

وہ قصیدے اور قطعاتِ تہنیت لکھ کر رؤسائے والا تبار اور احباب ذوی الاقتدار کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے، فارسی خطوط میں اس کی متعدد و متنوع مثالیں مل جاتی ہیں اس سے غالب اور اس عہد کے شہری ماحول کی ادبی دلچسپیوں کا بھی کچھ حال معلوم ہوتا ہے اور ان اشعار کی شان نزول کا بھی پتہ چلتا ہے۔ غالب کے ایسے ممدوحین میں بعض ممتاز انگریز افسر بھی ہیں۔

مرزا ان ادبی تحائف کی پیش کش کے نتیجہ میں صلہ وعطا و بخشش کی توقع بھی رکھتے تھے مولوی سبحان علی خاں کے نام تحریر کیے جانے والے خطوط میں واضح طور پر یہ صورت سامنے آتی ہے۔

اس وقت کے دربار اودھ کو مشرقی روایت کی، معارف پروری اور ادب نوازی کے حوالے سے ارباب فن اور اصحاب شعر و شعور کے لیے سب سے بڑا مرکز کشش قرار دیا جا سکتا ہے، وہ ہوس سیر و تماشا کی تسکین کی خاطر سے نہیں سچ پوچھیے تو زادِ سفر کی فراہمی کی توقع، سے لکھنؤ پہنچے تھے۔ اور منزل مراد کلکتہ میں تھی۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس اجمال کی تفصیل ان کے فارسی مکتوبات میں ملتی ہے۔ سبحان علی خاں کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

(ترجمہ) اس تلاش و تجسس میں مخانِ رفیع الشان (سبحان علی خاں) کی طرف رجوع کرنے کے ماسوا میں نے کسی اور سے بہ امیدِ التفات کوئی خواہش نہیں کی۔ اس آرزو کا کانٹا میرے دل سے الجھا ہوا ہے اور اس تمنا کا شور میرے اندر ایک قیامت کا سا ہنگامہ برپا کیے ہوئے ہے کہ یہ عرض داشت مشرقستان اودھ کے آصف ثانی کی نگاہِ قبول تک پہنچ جائے۔

اور یہ قصیدہ اس عہد کے سلیمان جم نشان کی بارگاہ میں پڑھا جائے تاکہ میں کہ ایک شاعر شیریں نوا اور ستایش گر سخن پیرا ہوں خسروانہ بخشائشوں سے عزت و امتیاز پا سکوں، اور یہ صلہ و عطا اس درجہ گراں قدر ہو کہ مجھے اہلِ زمانہ کی نظر میں گراں مایہ بنا دے اور خود میری اپنی نگاہ میں بلند پایگی بخشے۔" اسی سلسلہ میں ایک اور خط میں لکھا ہے۔

"میں اس قطعۂ ستایش کے بدلے میں خود کو توقعات کی اس میزانِ قدر میں تول رہا ہوں کہ مجھے اس شاہی دربار کی طرف سے روشناسیٔ شرفِ قبول، نوید التفات اور عطائے فتوح سے نوازا جائے۔۔۔ لیکن اس مدعائے دلی کی طلسم کشائی اس پر منحصر ہے کہ ستایش گر کے مقام اور مرتبہ کو ممدوح کے گوش گزار کیا جائے تاکہ وہ اسے عطیۂ لائقہ

سے سرفرازی بخشے ورنہ ظاہر ہے کہ ہم ایسے بادخوانوں کا صلہ کیا اور ستایش گری کی آبرو چہ"۔

(خط بنام مولوی کرم حسین خاں وکیل شاہ اودھ)

اُدھر سے مایوس ہوکر مرزا نے اپنے اس تاثر اور احساس محرومی کو، دانشگاف انداز میں پیش کرتے ہوئے آغا میر پر لعن طعن کی ہے۔

.... جو کچھ اس بلاد میں اس گدا طبع سلطان صورت امیر کے بارہ میں سنا جاتا ہے بخدا کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ابتدائے دور امارت میں اس نے جس کسی کو اپنے حصول مدعا کا ذریعہ سمجھا اُسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور اس طرح کچھ لوگوں نے اس سے فائدہ بھی اٹھایا لیکن اب کہ وہ استحکام دولت اور جاہ مندی کے اس مرحلہ سے گزر گیا روپیہ سمیٹنے کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔

سبحان علی خاں کی یہ شکایت بھی ان خطوط میں موجود ہے کہ انھوں نے غالب کا تعارف بہ انداز بایست نہیں کرایا۔

"ایشاں آبروئے خاکسار بیہاے سائل در نظر ندارند و بجز شاعر صلہ جو ہیچ نہ شمارند" (خط بنام مولوی کرم حسین خاں وکیل شاہ اودھ)

اس خط میں مرزا نے اپنی خوے آزادہ روی و آشکارا گوئی سے کام لیتے ہوئے اس کا بھی اظہار کیا کہ اگر شاہ اودھ کا مرتبہ وہ ہے کہ مجھ ایسا کوئی شخص اس کی بارگاہ سپہر اشتباہ میں لب کشائی کی جسارت کرے تو میں اس شیوۂ خاص میں کہ ثنا خوانی سے عبارت ہے اپنے دودمان والاشان کے لیے وجہ فخر و امتیاز ہوں۔

غالب کی اپنی زندگی اور ان کے معاملات و مشاغل کے علاوہ یہ خطوط گوناگوں معلومات اور رنگا رنگ اطلاعات کا سر چشمہ ہیں غالب کی شخصیت و شعور کے اس نگار خانے میں عصری کوائف اور معاصر رویوں کے بارہ میں بھی گویا متنوع تصویریں اور پرچھائیاں عکس فگن اور رقص کناں نظر آتی

ہیں۔

مولوی فضل حق خیر آبادی جو اپنے وقت کے بڑے عالم و فاضل شخص تھے سررشتہ داری عدالت دہلی سے مستعفی ہوئے تو اہل شہر کو عموماً اور مولانا سے تعلقِ خاطر رکھنے والوں کو خصوصاً بہت افسوس ہوا مرزا نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ان تاثرات کا دل آویز مرقع پیش کیا ہے۔

(ترجمہ) حکام کی قدر ناشناسی اور بے تمیزی نے یہ صورت حال پیدا کردی کہ فاضل بے نظیر و عالم یگانہ مولوی فضل حق نے عدالت دہلی کی سررشتہ داری سے استعفےٰ دیدیا اور اپنے آپ کو اس ننگ و عار سے الگ کرلیا۔ (آگے چل کر لکھا ہے)

سچ یہ ہے کہ اگر مولانا کے مراتب علم و فضل اور درجات دانش و بینش کو دس گنا کم کرکے بلکہ یہ کہیئے کہ سو میں سے ایک درجہ بھی لیا جائے تو بھی سررشتہ داری عدالت دیوانی جیسا عہدہ' یہ کہیے کہ مولانا کے دونِ ہمت ہے۔

نواب فیض محمد خاں نے پانسو روپیہ ماہوار حضرت کے لیے مقرر کردیا ہے اور اپنے پاس بلالیا ہے۔

مولانا جس دن' اس دیار سے رخصت ہو رہے تھے' میں کیا کہوں کہ اس شہر کے باشندوں پر کیا قیامت گزر رہی تھی' مسند آرائے دہلی کے ولی عہد' صاحب عالم مرزا ابو ظفر بہادر نے' مولوی صاحب کی رخصت سے پہلے' انھیں اپنے یہاں دعوت دی اور اپنے ملبوس خاص کا دوشالہ مولانا کے زیب دوش کیا اور آب دیدہ ہو کر کہا۔

جب آپ فرماتے ہیں کہ میں رخصت ہو رہا ہوں تو میرے لیے اسے قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں لیکن اللہ جانتا ہے کہ جبر ثقیل" کے ساتھ بھی لفظ " وداع " میری زبان پر نہیں آتا"

اس واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے غالب نے " آئینۂ سکندر " کے مالک

و مدیر سے یہ خواہش کی ہے کہ وہ اس خبر کو نہ صرف یہ کہ شایع کریں بلکہ اسے نمایانی کے ساتھ اخبار کے صفحات میں جگہ دیں۔

اس زمانہ میں اخبارات نکلنے لگے تھے مرزا غالب کو بھی ان سے دلچسپی تھی وہ ان کے صحافتی کردار اور اداراتی معیار کے بارہ میں بھی ایک رائے رکھتے تھے اور اس معنی میں یہ سمجھیے کہ ہمارے پہلے صحافتی نقاد تھے انھوں نے "جام جہاں نما" کلکتہ کے بارہ میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

"بسکہ از نا معتمدی اخبار "جام جہاں نما" ملول اند ذوق بہ اخبار ندارند"

اور اس ضمن میں لکھا ہے کہ ایسا کم ہی اتفاق ہوتا ہے کہ جام جہاں نما ایک ہفتہ میں جو خبر شایع کرے اگلے ہفتہ میں خود ہی اس کی تردید نہ کر دے۔ ایک ہفتہ سرکار انگریز کمپنی بہادر کی والی لاہور کے ساتھ، موسم بہار کے آنے سے پہلے، جنگ شروع کر دینے کی بابت خبر چھاپتا ہے اور پھر دوسرے ہفتہ میں، خود ہی اس کی تردید کرتے ہوئے یہ اطلاع دیتا ہے کہ وہ خبر جھوٹ تھی۔

اسی طرح ایک ہفتہ کی اشاعت میں یہ خبر آتی ہے کہ قلعۂ اکبر آباد کی مسجد اور روضۂ تاج محل کو اس قیمت پر فروخت کیا جا رہا ہے پھر دوسرے ہفتہ میں خبر دیتا ہے کہ نظمائے کونسل نے اس بیع و شرا کو جائز نہیں سمجھا۔

بہر حال آج کہ یک شنبہ کا دن اور ماہ ستمبر کی چار تاریخ ہے آپ کا والا نامہ اور اخبار کے اوراق پہنچے۔ (خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

تذکرہ نگاری اس دور کے نہایت اہم ادبی رجحانات میں سے ہے مرزا غالب کے ایک سے زیادہ فارسی خطوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے نواب مصطفٰی خاں شیفتہ نے اپنے تذکرے "گلشن بے خار" کا مسودہ مرزا غالب کے پاس بھیجا۔ تو انھوں نے اس کی ثنا و ستایش فرمائی کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ مفتی صدر الدین صاحب کا ترجمہ اس میں آخر کیوں شامل نہیں کیا گیا۔

"شما گرد ہے را بہ سخن زندگیٔ جاوید بخشیں۔ امید جاودان ہو ساخر رہمنہ

گویا ازشما زندۂ جاوید شد عندوہم را بہ نیکوئی نام برآمد۔ بارے گرہ چیدن خامہ در ردیف الف در نگارش اشعار پردین شعار (حضرت) آزردہ از چہ روست؟

اسی کے ساتھ آشوب کے ترجمہ کے سلسلہ میں نواب شیفتہ سے جو فروگزاشت ہوئی اس کی طرف بھی توجہ دلائی۔

"در باب گزارش حال حضرت آشوب فرو ماندۂ کشاکش خیالم۔ بدانست نامہ نگار از دودمان سادات ہست نامش میر امداد علی و نام پدرش میر روشن علی است و اندریں نسخہ بہ امداد علی بیگ مذکور شدہ"

عمدۂ منتخبہ میر محمد خاں سرور کا مبسوط تذکرہ ہے اس کے حوالہ سے مرزا احمد بیگ خاں تپاں ابن ہادی بیگ خاں کے بارہ میں لکھا ہے۔

"بکلکتہ دریافتم کہ ریختہ می گفت و تپاں تخلص می کرد و آداب سخن پیوندی از مرزا جان تپش فرا گرفتہ بود در فن کلام سادہ گوئے بود بکلکتہ جاہ مندانہ می زیست چار ساست کہ بہ آغاز جا خرامیدہ۔

جز دے چند از نتائج طبع خود بہ من داد تا چوں بدہلی رسم بہ میر محمد خاں سرور بدہم۔ چوں اعظم الدولہ بدیدن من آید آں سفینہ پیش کش می کنم و پیام آشنا می گزارم"۔ (خط بنام مصطفےٰ خاں شیفتہ)

قاضی محمد اختر جوناگڈھی کے لیے اپنے مجموعہ اشعار غزل کے ساتھ اپنے خاندانی حالات بھی لکھ کر بھیجے۔

"دیوانے ترتیب دادہ جا بہ جا بہ نظر گاہ التفات یاراں فرستادہ ام۔ ہر غزلے کہ خواہند از اں اوراق بردارند انتخاب و انتقاد اشعار حوالہ بر رائے نامہ گرد آورست نہ باشارہ و ایمائے سخن ور"

اپنے ترجمۂ احوال کے سلسلہ میں خاصی تفصیل سے بات کی ہے اور کہا ہے کہ میں ترک نژاد ہوں اور میرا سلسلۂ نسب افراسیاب اور پشنگ سے جا کر مل جاتا ہے میرے بزرگ سلجوقیوں کے ساتھ رشتۂ ہم گوہری رکھتے تھے۔ ان

کے عہد میں انھوں نے سپہ داری و سرفرازی کے پرچم بلند کیے۔
جب ان کی جاہ مندی کا یہ دور ختم ہوا اور بے نوائی و بے روائی کا زمانہ آیا تو کچھ لوگ راہ زنی و غارت گری کی طرف مائل ہو گئے اور بعض نے کشاورزی کو وسیلۂ معاش کے طور پر اختیار کیا۔ توران زمین و شہر سمرقند میرے آبا و اجداد کا مسکن ٹھہرا۔

انھیں لوگوں میں سے میرے دادا مرزا قوقان بیگ نے کسی بات پر اپنے باپ سے ناخوش ہو کر ہندوستان کا رُخ کیا۔ کچھ دنوں تک نواب معین الملک کے ساتھ رہا اور جب وقت کے ہاتھوں اُن کی بساط الٹ گئی تو میرے جد بزرگوار نے دلّی آکر نواب ذوالفقار الدولہ سے توسّل اختیار کیا۔

میرے والد عبداللہ بیگ خاں دلّی میں پیدا ہوئے اور خود میری ولادت اکبر آباد میں ہوئی۔ ابھی عمر کے پانچ سال ہی گزرے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے یہ چاہا کہ وہ ناز و نعم کے ساتھ میری پرورش کرے تو مرگ نے امان نہ دی اور اپنے بڑے بھائی کی موت کے پانچ سال بعد انھیں کے نقشِ قدم پر چل کر راہی مُلکِ بقا ہوئے اور مجھے اس خرابے میں تنہا چھوڑ دیا۔

عمِّ محترم افرنگیوں کے دامن دولت سے وابستہ اور چار سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ لارڈ لیک کی کمان میں سرکشوں سے مصروف جنگ تھے۔

مضافات اکبر آباد میں سرکار انگریزی کے عطا فرمودہ دو سیر حاصل پرگنے ان کی جاگیر میں تھے بنا بریں دولت انگلشیہ نے خوں بہائے آفتاب کے بدلے ہم بے نواؤں کے کلبۂ تاریک کے لیے چراغ مہیا کر دیا اور جاگیر کے بدلے میں تنخواہ مقرر کرکے ہم بے کسوں کو وجہ معاش کی کشمکش سے نجات دی۔ (ترجمہ)

" بہ خوں بہائے آفتاب کلبۂ تاریک گدایاں را چراغ دمابے نوایاں را

بہ عوض جاگیر بہ مشاہرہ از خار خارِ جستجوے معاش فراغ بخشید"

غالب کے اپنے قلم سے ان کے خاندانی حالات کے سلسلہ میں یہ (فارسی) خط ایک نہایت اہم ماخذ کا درجہ رکھتا ہے مرزا قوقان بیگ کے حالات کے ضمن میں کوئی دوسرا ماخذ موجود نہیں نواب معین الملک کی صوبہ داری اور شاہ عالم ثانی کے دور کی تاریخیں بھی ان کے حوالہ سے خالی ہیں۔

غالب ایرانی ثقافت اور اس کی قدیم تاریخ سے بے حد متاثر تھے قدیم پارسی نسل اُن کے نزدیک انسانی خوبیوں اور بشری شرافتوں کا بے مثال نمونہ تھی لیکن ان کے اپنے عہد کے پارسی تو برائے نام ہی پارسی تھے۔۔۔۔ وہ اپنے بزرگوں کے صحیح وارث کہلانے کے بھی مستحق نہیں تھے۔

ویسے ایران قدیم سے ان کی دل چسپی عشق و عقیدت کا سا انداز رکھتی ہے انھوں نے اپنی بیشتر تشبیہیں، آگ سے لی ہیں یہ ان کے فکر کی شعلگی کی بھی ایک علامت ہے۔

اپنے زمانے کے جن وقوعات کی پرچھائیاں اور ان کی طرف اشارے ان خطوط میں موجود ہیں ان میں ولیم فریزر زیزیڈینٹ دہلی کا واقعۂ قتل بھی ہے نواب شمس الدین احمد خاں، والی فیروز پور جھرکہ کو اس کی سازش میں ملوث پایا گیا جس کی پاداش میں انھیں بالآخر پھانسی دیدی گئی۔

غالب نے شیخ امام بخش ناسخ کے نام اپنے خط میں اس کی بعض تفصیلات کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"والی فیروز پور مجرم قرار یافت و بحکم سرکار باتنے چند از خاصان خود زیر شدند تھا دو سرکار بجاگیرش رفت چوں میاں من و وے ناسازگاری بود واہل شہر آں را می دانستند ہمگی در من افتادند و گرفتاری آں کافر نعمت داد و کشش را بگردن من بستند"

اسی ضمن میں آگے چل کر تحریر کیا ہے۔

"شنبہ ہفدہم صفر بود، حاکمے از حکام سنت، مقام الہ آباد بدیں دیار رسیدہ ..... کہ خلاصۂ تحقیقات حکام دہلی را بہ امعان نظر بنگرد و بعد ثبوت جرم تعزیر پایہ بپایہ قرار دادہ کار یک سو کند"

ولیم فریزر کے واقعۂ قتل سے متعلق سے غالب کا بیان اس دور تاریخ سے متعلق اہم خبر ناموں میں سے ہے۔

مرزا غالب کے ان خطوط اور ان کی فارسی عبارت و اشارت میں اس زمانۂ زندگی کے واقعات، حالات اور حادثات کی کوئی نہ کوئی ایسی کڑی ملتی ہے جس سے مرزا (غالب) کے اپنے سوانحی کوائف، اس دور کے معاشرتی مسائل، انتظامی امور اور تاریخی و تہذیبی تناظر کا ایک نہ ایک سلسلہ آکر مل جاتا ہے۔ ادبی ماحول اور اس سے وابستہ تصورات و تاثرات کو اس میں خصوصیت کے ساتھ شامل سمجھنا چاہیے۔

مرزا کے اردو مکتوبات کے مقابلہ میں فارسی خطوط کے مکتوب الیہم کی تعداد کہیں زیادہ ہے اس میں بعض ان کے بے تکلف دوست ہیں بعض کا شمار اکابرِ علم و ادب میں ہوتا ہے بعض انگریز افسران اور حکام بالا میں سے ہیں اور بعض اہل دولت و ثروت ہیں ان میں دو عرضداشتیں وہ بھی ہیں جو نواب حسام الدین حیدر خاں کی طرف سے سریر آرائے سلطنت اودھ کی بارگاہ میں پیش کیے جانے کی غرض سے تحریر کی گئی ہیں ان کی زبان اسی نسبت سے پر تکلف اور آرائش گفتار کا دلکش نمونہ ہے۔

جب بھی ایسے مواقع آتے ہیں غالب کا قلم سادگی سے پرکاری اور پرکاری سے مرصع نگاری کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطب و مکتوب الیہ کے لیے اس کے مزاج، معیار اور مرتبہ کے مطابق آداب و رسوم کی پاسداری خود، آئینِ بلاغت بھی ہے۔

لیکن ایسے کچھ مواقع سے آگے اور الگ، جہاں مرزا غالب کا اپنا آئین

نگارش و دستور گزارش سامنے آتا ہے بزبانِ قلم ان کا طرزِ سخن غیر معمولی طور پر شگفتہ، شور انگیز و دل آویز ہے اور فارسی ادب نگاری کے بہترین نمونوں میں سے ہے۔ — غالبؔ معمولی معمولی باتوں اور جزئی جزئی سچائیوں کو اس خوبصورتی حسنِ زبان و لطفِ بیان کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"۔ کلاسیکی نثر اور پر تکلف اسلوبِ ادا کے سلیقے طریقے اور درباری گفتگو کے "عوائد رسمیہ" انھوں نے ابوالفضل اور ظہوری جیسے نثر نگاروں اور فارسی ادب عالیہ کے اساتین کے یہاں دیکھے تھے وہ خود بھی اس کے قدر آشنا و نکتہ شناس تھے۔ علاوہ بریں یہ وہ دور بھی تھا جب اختراع پسند طبیعتیں نئی نئی شگوفہ کاریوں اور حسن آفرینیوں کی طرف مائل تھیں خود اردو میں نت نئے تجربوں کا سلسلہ جاری تھا۔

غالب کے ان فارسی مکتوبات میں بھی ان کی طبع ایجاد پسند کی نادرہ کاریوں کے نمونے موجود ہیں۔

انھوں نے "فارسی نیامیختہ بعربی" کی بھی خوبصورت مثالیں اپنی نثر میں پیش کی ہیں دوسری نوعیت کی ادبی طرفہ کاریوں کے شگفتہ نمونے بھی ان کے یہاں بہ آسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ نئے اندازِ نظر کے ساتھ نکتہ یابی و معنی آفرینی کی کوشش بھی جسے گل کاری و حسن آفرینی کہنا چاہیے ان خطوط میں مل جائیگی لفظوں کے انتخاب میں ایک خاص سلیقے اور پیش کش کے عمدہ طریقے کے بغیر کسی بھی نثر نگار یا شاعر سے اس کی امید کرنا مشکل ہے۔

نئے الفاظ کے استعمال کا شوق ان کے ان نثری فن پاروں کی ایک مختص خوبی ہے لیکن ہر موقع پر یہ ان کی ادبی حسیت اور تخلیقی شعور کا کوئی قابل دید رُخ اور لائق شنید حصہ ہو یہ ضروری نہیں۔ غالب بھی ہندوستان کے فارسی نگاروں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے ایک سخنورانہ اجتماع میں جس طرح ایک تازہ وارد ایرانی کو اہلِ ہند کی شعری تخلیقات پر خندہ

دنداں نما کے ساتھ طنز کرتے ہوئے دکھلایا ہے اس سے اور ان کے بعض دوسرے سے اس کا پتہ چلانا دشوار نہیں۔

مغلوں کی سیاسی قوت اور دولت وثروت کے اعتبار سے اس وقت کا شہر دہلی اپنی قدیم عظمتوں کا ایک گریز پا سایہ بن کر رہ گیا تھا پھر بھی بقول حالی اس وقت کی علمی فضا کو دیکھ کر عہد اکبری و شاہجہانی کے جلسے یاد آتے تھے غالب بھی اسی سلسلۂ کہکشانی کا ایک حصہ تھے اس موقع پر پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ معروف فقرہ یاد آتا ہے مغلوں نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں۔ اردو زبان تاج محل اور غالبؔ۔ یہ خطوط جہاں نئے انگریزی نظام سے متعلق گوناں گوں آثار و احوال کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں ان میں انگریزی الفاظ بھی ملتے ہیں ان کے استعمال کا تعلق زبان میں اظہار و ابلاغ کی نئی قوت سے بھی ہے۔

ان خطوط سے غالبؔ کے بہت سے اشعار غزل قصیدہ اور قطعات تاریخ کی شان نزول کا بھی حال معلوم ہوتا ہے کم از کم ان کے زمانۂ تحریر کا تو ضرور کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے اگرچہ غالب نے نہ تمام خطوط پر تاریخیں درج کی ہیں اور نہ بعض مقامات پر ادھوری تاریخوں کو مکمل کیا ہے۔

ان کے زمانۂ زندگی میں اس کے قلمی نسخے بھی تیار ہوئے پہلا نسخہ (۱۲۵۱۔۵۲/ ۱۸۳۵ میں تسوید و تبیض کی منزل سے گزرا یہ نسخہ شیرانی کلیکشن پنجاب یونیورسٹی لاہور میں موجود ہے۔

دوسرا نسخہ اس کے پانچ سال بعد (۵۷-۱۲۵۶/ ۱۸۴۰ کا مکتوبہ نذیریہ لائبریری ہمدرد نگر دہلی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اشاعت پذیر نسخوں میں پنج آہنگ مطبوعہ اگست ۱۸۴۹ مطابق سنہ ۱۲۶۵ نیز پنج آہنگ طبع سنہ ۱۸۵۳ء مطابق ۱۲۶۹ مطبع دارالسلام دہلی ہے موخرالذکر پر کارپردازان مطبع کی طرف سے اس کی وضاحت بھی ہے کہ اس کی تصحیح خود مصنف نے کی ہے۔

یوں بھی غالب کے ان فارسی مکتوبات میں پنج آہنگ کا ذکر بار بار آیا ہے

وہ اپنے ان خطوط کی جمع آوری کتابت اور اشاعت سے دل چسپی رکھتے تھے لیکن جیسا کہ ابھی اشارہ کیا گیا۔ ان کی تاریخ اور ان پر مندرج تاریخوں کی تکمیل سے وہ کسی خاص دل چسپی کا اظہار نہیں کرتے اور اس طرف توجہ فرما نہیں ہوتے۔

آج از کے مکتوب الیہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں لیکن ان میں سے متعدد شخصیتوں کے بارہ میں ہماری معلومات کا دائرہ محدود ہے اور بعض کے تو ہم نام ہی سے واقف ہیں اور بس۔

ان مکتوبات کا زمانۂ تحریر ان کی زندگی یا زمانۂ حیات کے ایک طویل عرصہ پر محیط ہے ان کا ایک مجموعہ مشمولہ پنج آہنگ ۱۹۶ مکتوبات پر مشتمل ہے جن کے مکتوب الیہم اپنے نشانات شمار کے لحاظ سے ۵۱ ہیں۔ نامہ ہائے فارسی غالب ایک دوسرا مجموعہ ہے جسے اکبر علی ترمذی صاحب نے اپنے مقدمہ اور تحشیہ کے ساتھ غالب صدی کے موقع پر شایع کیا تھا جس میں زیادہ تر خطوط مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا اور نواب علی اکبر خاں طباطبائی متولی امام باڑہ ہگلی بندر کی خدمت میں روانہ کیے گئے اور نسبتاً ایک مختصر تعداد ان خطوط کی ہے جن کے مکتوب الیہم "مردمان نامعلوم" ہیں۔

اس کے علاوہ بھی دوسرے ایسے دو مجموعے ہیں "متفرقات غالب" مرتبہ سید مسعود حسن رضوی اور آثار غالب از قاضی عبدالودود جن کے مشتملات غالب کے فارسی خطوط کے حوالہ سے قابل توجہ ہیں۔ راقم الحروف نے اپنے ترجموں کا دائرہ صرف خطوط فارسی غالب مشمولہ "پنج آہنگ" تک محدود رکھا ہے۔

نسخۂ پنج آہنگ کو مرزا علی بخش بہادر رنجور نے سنہ ۱۲۵۱ / ۱۸۳۵ء میں ترتیب دیا اور اس ضمن میں آغاز سال یک ہزار دو صد و پنجاہ و یک ہجری کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں انگریز کمپنی بہادر کے عمال نے نواب شمس الدین احمد خاں کو ولیم فریزر کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کی وجہ سے تختۂ دار پر لٹکا دیا تھا۔ (۱۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء مطابق ۱۲۵۱ھ)۔

غالب کے مجموعۂ کلام "میخانہ آرزو سرانجام" کی ترتیب کا بھی یہی زمانہ ہے مرزا علی بخش رنجور نے لکھا ہے۔

"چوں دراں ایام دیوان فیض عنوان کہ مسمّی بہ میخانہ آرزو سرانجام ست بخدمت والائے آں خسرو اقلیم سخن وری خواندم بخاطر چناں گذشت کہ ہمگی نثر، از دیوان برچیدہ یک جا کنم و عبارات متفرقۂ دیگر بہ آں ربط دہم سوادِ اوراق کہ تردمنست ضمیمہ آں بسازم اما از ہجوم افکار و فور آلام فرصت میسر نمی آمد۔"

جس کے معنی یہ ہیں کہ پنج آہنگ کی ترتیب سنہ ۱۸۳۵ء کے اواخر میں ممکن ہو سکی۔ علی بخش رنجور کے بیان کی روشنی میں کہا جا نا چاہیے کہ پنج آہنگ یا اس نوع کی کسی کتاب کی ترتیب کا خاموش ذہنی تقاضہ کافی پہلے سے موجود تھا جس کے لیے رنجور نے لکھا ہے۔

برادر قدسی اثر جناب اسداللہ متخلص بہ غالب کہ در نظم و نثر و در سخنوری مشہور زمانہ است از راہ کہبر نوازی سر بہ آموزگاری من داشت و چوں درمیان ایں نحیف و آں سخنور یکتا از دو سو پیوند قرابت استوار ست۔۔۔ لاجرم مرا بانواع لطف و مکرمت نواختے و ہموارہ بدانش و بینش رہنمائی کردے تا اینکہ حسب التماس من ورقے چند از القاب و آداب و دیگر بہ رسید خطوط و شکوۂ عدم رسی مکاتبات رقم فرمودہ، بہ من عطا نمود آں اوراق را چوں تعویز بہ بازو بستم و آں نگاشتہ ہا را در فنِ تحریر دستور العمل خود ساختم"[۳]

نسخہ کلیات نثر غالب (فارسی) کا دیباچہ شروع سے آخر تک مرزا علی بخش رنجور کے رشحات قلم کا مرہون منت نہیں ہے۔

۔۔۔ آہنگ اول در القاب و آداب و ما یتعلق بہا کے بعد غالب نے اپنی طرف سے تقریباً ڈھائی صفحات یا پچپن ۵۵ سطروں کا اضافہ کیا ہے اور مرزا علی بخش بہادر نے

ان القاب وآداب سے متعلق کی تعلیم اور اس کے دور کے بارہ میں لکھا ہے۔

"در سال یک ہزار و دو صد و چہل و یک ہجری کہ گیتی ستانانِ انگلشیہ بربھرت پور لشکر کشیدہ و آں رویئں وژرا درمیان گرفتہ اند من دریں یورش با جناب مستطاب عم عالی مقدار فخر الدولہ ولاوار الملک، نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ دام اقبالہ وزاد افضالہ، دگرامی برادر ستودہ خو مرزا علی بخش بہادر ہم سفر ست روزانہ برفتار ہمقدم وشبانہ بیک خیمہ فرود می آئیم برادر والا قدر کہ ..... سعادت مندی و فروغ دانش جوئی می دارد از من آرزو کرد کہ القاب وآداب متعارفہ رسمیہ بروے ہم ریختہ والفاظ شکر وشکوہ وشادی وغم باہم آمیختہ برائے نامہ نگاراں دستور العمل موجزے ساختہ آید"

جس کے معنی ہیں کہ یہ ۱۸۲۵ / ۱۲۴۱ کے قریب کا واقعہ ہے یہ وہی دور ہے جب غالب سفر کلکتہ پر روانہ ہونے سے قبل نواب فخر الدولہ سے ملنے گئے تھے وہ گیتی ستانانِ انگلشیہ کی طرف سے محاصرہ قلعہ بھرت پور کے ایام میں نواب احمد بخش کے ساتھ تھے اس کا حوالہ انھوں نے ریزیڈنیٹ دہلی کے نام اپنی عرض داشت میں بھی دیا ہے۔ جو بھی صورت ہو علی بخش رنجور جب اس کی طرف متوجہ ہوئے تو نواب فخر الدولہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ (یہ ۱۲۴۲/۱۸۲۷ء کا واقعہ ہے)، جس کی اطلاع غالب کو کلکتہ کے سفر کے دوران مرشد آباد میں فضل مولا خاں سے ملی تھی۔ علی بخش رنجور اور غالب کا تحریر کردہ یہ مشترک دیباچہ ایک سے زیادہ تبدیلیوں سے گزرا ہے اور اسے مختلف اوقات میں قلمبند کیا گیا ہے۔

غالب اپنے فارسی کلام کی طرح فارسی خطوط پر بھی تقریباً ایک ربع صدی تک توجہ فرما رہے ۱۸۲۵ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک اردو میں اگر انھوں نے خط لکھے بھی تو بہت کم یہ زمانہ فارسی نگارشات کے اعتبار سے اپنی بہترین صورت میں ایک

ثمر آفریں دور ہے غالب فارسی قصائد اور دوسری شعری اصناف پر مشتمل کلام کو نقشہائے رنگ رنگ سے تعبیر کرتے اور اردو کو مجموعۂ بے رنگ قرار دیتے تھے۔

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے دیوان ریختہ کو "در تناتمامی تمام" کہہ کر یاد کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی ادبی فکر میں دوسرا قدم ان کی فارسی تخلیقات ہی کی شکل میں سامنے آیا جس میں ان کے فارسی مکتوبات بے حد اہم ہیں۔

غالب نے اپنے ان یادگار زمانہ خطوط کو اپنی معروف تصنیف "پنج آہنگ" میں شامل کیا اور اس کی مختلف اشاعتوں میں ان خطوط کی تعداد برابر بڑھتی رہی۔ یہ مکتوبات زبان فارسی میں غالب کے حسن بیان اور لطفِ ادا کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ پنج آہنگ کے خاتمہ پر انھوں نے خود بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔

"یزداں داند و مدعیان دانش را توفیق دانستن دہاد تا دانند۔۔۔ کہ خامۂ غالب سیاہ نامہ مسلک دشوار گزار پارسی آمیختہ بتازی را بکدام دل آویزی رفتار پیمودہ است و۔ بسا گزیں روشہا در نثر نظر فروز آمد" (صفحہ ۲۵۴)

غالب کے یہاں، جہاں تک زیر نظر فارسی مکتوبات کا تعلق ہے، نگارش و گزارش کے جو اسالیب اور دل آویز نقوش ملتے ہیں ان کے کچھ نمونے اس سے پیشتر بھی مختلف مباحث اور حوالوں کے ضمن میں پیش کر دیے گئے ہیں، مزید کچھ نمونے لطف دید کے لیے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ آموں کی یہ تعریف ملاحظہ ہو جس میں انشاپردازانہ خوش رنگی اور زبان و بیان کی خوش نفسی بطور خاص موجود ہے۔

"رسیدن ہشت سبد انبہ، در روضہ ہائے فردوس بر روئے آرزو باز کرد۔ زہے انبہ ہائے پاکیزہ و شیریں، از بروں سوئے بشیر شستہ و از درون سوئے بشکر انباشتہ۔۔۔۔ بہ پاکیزگی گوہر آبروئے خانوادہ ابر و ہوا

وبہ دل آویزی پیکر چشم وچراغ دودمان برگ ونوا، ۔۔۔۔ انگور اگر دررسیدگی دانستے، کہ آب شدن وبادۂ ناب گشتن دیگرست، وچاشنی خدا آفریدایں شیرۂ پاک دیگر۔

نے شکر اگر در آغاز کار وارسیدے کہ بگوناگوں فشار درآمدن، وسبوئے دیگراں بصورتِ تنگ شکر بر آمدن دیگرست وگوارائی ازل آوردایں میوۂ نغز دیگر ۔۔۔۔ آں کہ خامۂ شکر فشاں بداں رفتہ کہ ازیں ثمرہائے پیش رس یک نیمہ، پختہ ونیمۂ دیگر ہنوز خام است ۔۔۔۔ آنچہ بہ پختگی زرد گردد نہایت شوق است کہ در رنگ دردلجوئی رواداشت ۔۔۔ من بداں خورسندم وخورسندی من فراواں باد۔"

(خط بنام نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ)

غالب نے اپنے فنکارانہ رجحان کے تحت دوستوں کے لیے بھی قصیدے لکھے ہیں آم ان کا نہایت مرغوب ومحبوب پھل ہے اس کے لیے بھی یہ کہیے کہ انھوں نے فارسی نثر میں قصیدہ لکھا ہے۔

آم بھیجنے کی خواہش وفرمایش کا یہ خوب صورت اور بے تکلف انداز بھی ملاحظہ کیجئے۔

"لختے شکم بندہ ام وقدرے ناتواں ہم آرایش دسترخوان جویم وہم آسایش جان، وخردوراں دانندکہ ایں ہر دو صفت بانبہ اندرست واہل کلکتہ بر آنندکہ قلم رو انبہ ہگلی بندر است ۔۔۔ آرے انبہ از ہگلی وگل از گلشن ایثار از جناب وابرام از من شوق می سگالد کہ ہر آئینہ تا پایانِ فصل دو سہ بار بخاطر ولی نعمت خواہم گذشت وآزمی نالد کہ حاشا۔ بریں مایہ خورسند نخواہم شد۔"

(خط بنام نواب علی اکبر خاں)

گوناگوں تمثیلوں رنگارنگ تشبیہوں اور عبارت واشارت کی نیرنگیوں

سے آراستہ کچھ خوب صورت مثالیں ان نثر پاروں میں مل سکتی ہیں۔

"... من دانم و دل کہ دریں چشم روشنے کہ پیش آوردۂ دولت وساز کردۂ اقبال ست، از اقسام سخن چہا بکار رفتہ، ہم در و دیوار روزگار را بسر جوش بہار اندودمے، و ہم گوشہ و کنارِ گیتی بفروغِ نیر بخت چراغاں نمودمے۔ تار از طرۂ حور و پود از بالِ پری آوردمے و نو آئین نمطے درہم بافتہ بہ آں ہمایوں انجمن گستردمے۔"

دخط بنام منشی محمد حسن۔

صاحب عالم مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر کے شقہ کے جواب میں ان سے بزبان قلم جو گفتگو کی ہے اس کا یہ آرائشی اسلوب ملاحظہ ہو۔

"بہ موقفِ عرض ایستادگانِ حضورِ فیض گنجور، صاحب عالم و عالمیاں شہزادۂ کیواں ایواں، شمع فروزندۂ دودمان گورگانی، شایستۂ اورنگ سلیمانی دام اقبالہ، وزاد اجلالہ" (ان القاب و آداب کے بعد یہ تحریر زیبِ قرطاس ہوئی ہے۔) بال افشانی ذرہ بہ پیش گاہِ مہر جہاں آرا وجبہ ریزی قطرہ بہ بساطِ ارادت دریا آئینہ زدائے ایں نمایش و پردہ کشائے ایں گرایش ہست کہ اگر فیضِ ورودِ ہمایوں توقیعِ جہاں مطاع جہانیاں مطیع، جانِ نہاد در کالبد ہوا خواہ نمیدے، سپاس ایں ہمہ ذرہ نوازی و رواں پروری چگونہ گذاردہ شدے۔۔۔"

سبحان علی خاں کے نام اپنے ایک خط میں عرض مدعا اور نگارش گزارش کا یہ انداز ملاحظہ ہو۔

"شور تمنائے صلہ و آشوبِ تقاضائے جائزہ و دور خواہِ اجرائے عطائے وزیر و توقع حصول مرحمت خسرو ہمہ درسر شتم و در نگہا بہم آمیختہ شگرف نقشے بہ رہگزار نظارہ بستم، تا چوں فرزانہ داور؛ و دانش پیشہ مربی دیدہ ور، بدیں ورق نگرد، دریابد۔۔۔"

اس انداز عبارت آرائی و نقش پیرائی کا بہترین نمونہ اس عرض داشت میں نظر فروز ہوتا ہے جو نواب حسام الدین حیدر کی طرف سے شاہ اودھ کی بارگاہ سپہر اشتباہ میں پیش کش کے لیے غالب نے سپرد قرطاس و قلم کی ہے۔

حضرت قدر قدرت، سلطان سپہر آستان، فرشتہ پاسبان ستارہ سپاہ ثریا بارگاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ۔۔۔ والائی رتبۂ اورنگ جہاں بانی کہ نمونۂ سریر سلیمانی است بر تر آزاں ست کہ پایۂ آں را بآرزوئے بوسہ نگار تواں بست یا در اندیشہ راہ خواہش گرد سر گردیدنی بہ سرا پائے آں تواں شد۔

۔۔۔ لاجرم بگوشۂ بساط آں خجستہ بارگاہ (کہ یارب پیوستہ مشرق آفتاب سیمائے خسروی و مشتری را دستور العمل روائی آثار ہمایوں پرتوے باد) جائے کہ بفروغ خرد نورانی و بہین گوہر گنجینۂ یزدانی ست بہ سبیل نثار می فشاندو بزمزمۂ تہنیت جلوس دعائے دوام دوست خود را باجہانیاں ہم زباں و جہاں را با خویش آمین گوے می گرداند ؎

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے نام ایک خط میں فارسی نیامیختہ بہ عربی کا خوب صورت نگارش نامہ پیش کیا ہے۔

" آباد براں شیوائی شیوہ کہ تا زباں بدہن جنبد بخت سپاس توانائی سخن گزارد کہ سرانجام ہر گونہ سپاس گذاری در گرد آنست کیس کہ ایں دلکشا پایہ را بہ بلندی نہ پرستد و بدیں ایزدی بخشش آفریں نہ فرستد۔ بنگر کہ ایں ہوائے شگفت آور نیرنگ تمامی راچہ نیرو دادہ اند کہ چوں بفرمان جنبشے کہ نہاد اوست فرزانگاں را دل از جائے بر انگیزد ہم زباں را بگفتار آرد و ہم خامہ را بر فتار،

و شگفت تر آں کہ زمزمۂ دیدن ایں باد را آئینے بداں استواری

داد و اندازہ بداں سازگاری نہادہ اند کہ دریں دو روش بیگانہ کز زبان و خامہ راست اندیشہ را پیوند ہنجار از ہم نگسلد و آں یک گونہ خواہش از بن ہر دو پردہ پدید آید و ایں خود رخشانی رنگیست کہ چوں چشم بروئے سخن کشایند ناگاہ بہ نخستیں نگاہ ایں را بنگرند "

اس سے فقروں کی دروبست اور لفظ و معنی کی ساخت و پرداخت کا ایک نیا انداز ابھرتا ہے۔

نواب صاحب ہی کے نام ایک خط میں فکر و فلسفہ کی پرچھائیوں کو اس طرز نگارش کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔

"... ہیچ چیزے بے اقامۂ وجود مطلق رنگ ہستی نہ پذیرد و ہر چہ فروغ ہستی آں را فرو گیرد، جوہرے گردد فروزندہ و نورانی کہ برق پیدائی از سیمائے وے آشکارا تا بہ و تیرگی نیستی ہیچ گونہ در وے راہ نیابد، ...

چیست کہ ازیں دو صفت کہ ہیچی و ناتمامی گفتہ شود، نخستیں را سر و بن پیدا نیست دو میں را یا اندازۂ دستگاہ کرم از گنجینۂ فیض نمود بہرہ ریا نیست، آں را ورق از انگارۂ نمایش سادہ و ایں را از پیدائی جاں "نقش نیم رخ" در کار۔

و اگر فیض ہستی عدم است و چنانکہ وانمودہ اند تمام است با "ہیچی نشاط" "ہمگی" برگرفتے و ناتمامی بہ تمامی نام برآوردی۔ ..."

اس عبارت سے ان کے صوفیانہ افکار تو خیر سامنے آتے ہی ہیں اُن کے اسلوب نگارش کی طرفگی اور نئے انداز ادا کی اس معنی یابی کا بھی پتہ چلتا ہے جس کے لیے وہ نئے الفاظ سے کام لیتے ہیں اس کی طرف ان کی فکر آفریں ترکیبیں بھی اشارہ کرتی ہیں اور سادہ لفظوں سے اصطلاح سازی کی سعی مشکور بھی غالب کی نثر ان کے اپنے ذہن اور زمانہ زندگی کی "نقش نیم رخ" سہی مگر اس میں تخلیقی نمو پذیری کی

جو صلاحیت اور حسن آفرینی کی جو مضمر قوت موجود ہے وہ "دُرنا تمامی تمام اور دلچسپی نشاط ہمگی" سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو اپنے طور پر کہنا جانتے ہیں اردو کی طرف آنے سے پہلے وہ اپنے انفرادی اسلوب کی کشش و روش کے رنگ و نیرنگ کو فارسی خطوط کی نثر میں آزما چکے تھے۔ بعض اردو خطوط تو فارسی مکتوبات کا عکس ثانی معلوم ہوتے ہیں۔

بیان کے حسن اور طرز ادا کی دل آویزی سے مسرت اندوزی کے پیش نظر یہاں ایک نمونہ اور پیش کیا جاتا ہے۔

"جہاں جہاں شکستگی و عالم عالم خستگی با خود گرفتم و از بیداد روزگار نالاں و سینہ بردم تیغ مالاں بہ کلکتہ رسیدم، فرماں دہاں سر بزرگی دکوچک دلی کردند و دل را تیر و بخشیدند، آنچہ بخشایش کہ مشاہدہ رفت امید کشایش آورد و ذوق آوارگی و سوائے بیاباں مرگی کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود بدل نماند،

و ہوس آتشکدہ ہائے یزد و میخانہ ہائے شیراز کہ دل را بسوئے خود می کشید و مرا بپارس می خواند از سر بدر جست ـــ دو سال دراں بقعہ مجاور بودم ..... روزگار برگشت و کار ساختہ شدہ صورت تباہی گرفت اکنوں ششمیں سال است کہ خانماں بباد دادہ و دل بر مرگ ناگاہ نہادہ بکنجے نشستہ ام۔"

(خط بنام میر اعظم علی)

غالب کے حسن گفتار کا اندازہ ان کے بیشتر خطوط میں کسی نہ کسی اعتبار سے ہو جاتا ہے ناسازگاری حالات میں جب زمانے کا شکوہ اور تقدیر کا رونا، موضوع گفتگو ٹھیرے، دل چسپ، موثر اور پرکشش انداز بیان اختیار کرنا۔ بادصف استطاعت یہ کہیے کہ اچھے اچھوں کے بس کی بات نہیں ہوتی، غالب نے اسے اردو سے بھی کچھ زیادہ فارسی میں نباہا ہے اور اس کے بہت ہی دل آویز نمونے پیش کیے ہیں۔

فارسی الفاظ نے ان کی تخلیقی حسیت اور بے مثال ادبی صلاحیت کے ساتھ مل کر ان خطوط میں جو ایک جہان رنگ و بو پیدا کیا اور سرمایۂ آرایش گفتار بہم پہنچایا اس کو اردو میں منتقل کرنا یوں بھی ایک مشکل کام ہے لیکن ان خطوط کے اپنے سحر دلکشی نے مجھے اس پر مجبور کیا کہ میں ان کا اردو میں ترجمہ کروں اور اس کے وسیلہ سے دوسرے اہل ادب ارباب ذوق اور غالب کے مطالعہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اپنی نارسائی کے باوصف رسائی کی صورت پیدا کروں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں ان مطبوعہ فارسی خطوط کا ان قلمی نسخوں سے تقابل نہیں کر سکا جو شیرانی کلیکشن پنجاب یونیورسٹی لاہور اور نذیریہ لائبریری ہمدرد نگر میں محفوظ ہیں۔ اور نہ ہی ان کو تاریخی طور پر ترتیب دے سکا ہاں مختلف خطوط جو ایک ہی مکتوب الیہ کے نام تھے انھیں یکجا ضرور کر دیا میرے سامنے ترجمہ نگاری کے وقت مہاجر صاحب کا ترجمہ بھی نہیں تھا جو اب سے بیس سال پیشتر شایع ہوا تھا۔
میں نے غالب کے اسلوب نگارش اور طرز ادا کو زیادہ سے زیادہ پیش نظر رکھنے کی سعی کی ہے اور ان کے بعض ایسے الفاظ کو باقی رکھا ہے جن کو وہ اپنے فکری اظہار کا زیادہ موثر و موزوں وسیلہ تصور کرتے تھے اسی لیے میں نے مناسب حدود میں رہتے ہوئے فارسی الفاظ اور خوش رنگ و خوش آہنگ ترکیبوں سے شعوری طور پر "ابا" اختیار نہیں کیا ممکن ہے اس کی وجہ سے ترجمہ کی زبان قدرے مشکل معلوم ہو مگر یہ غالب کے اسلوب فکر اور انداز نگارش سے نسبتاً زیادہ قریب ہے اگر یہ ترجمہ اپنی گوناگوں کوتاہیوں کے باوصف غالب کے فارسی خطوط تک پہنچنے میں معاون نظر آئے تو میں اسے اپنی کامیابی تصور کروں گا۔

یہ میرے لیے انتہائی مسرت و شادمانی کی بات تھی کہ دہلی اردو اکادمی کی ریسرچ اور اشاعتی کمیٹی نے خطوط غالب فارسی مشمولہ پنج آہنگ کے ترجمہ کا کام میرے سپرد کیا اور جب میں اس کا مسودہ تیار کر چکا تو محترمی و مکرمی پروفیسر امیر حسن

عابدی نے اکادمی کی خواہش پر اس کا مطالعہ فرمایا اور میری اس ناچیز کاوش پر اظہار پسندیدگی کیا۔

میں اس کے لیے اکادمی کے سابق سیکریٹری مکرمی سید شریف الحسن نقوی اور ریسرچ کمیٹی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ بالخصوص اس تحقیقی اور اشاعتی کمیٹی کے صدر نشین ڈاکٹر قمر رئیس کا ممنونِ احسان ہوں جن کے ایما پر میں نے اس کام کو انجام دیا۔

حق ناشناسی ہوگی اگر میں اس موقع پر اپنی عزیز شاگردہ اسما سلیم کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اس ترجمہ کے مسودہ کی نقلِ صفحات عبارات کی خواندگی اور تقابلی مطالعہ میں میری بہت مدد کی۔ (اسما یوں بھی غالب اور مطالعۂ غالب سے گہری دل چسپی رکھتی ہیں۔ عزیز مکرم انتظار مرزا نے جو میرے دیرینہ شاگرد ہیں اکادمی کی طرف سے اس کی اشاعت و طباعت کے کام میں جس حد تک دل چسپی کا اظہار کیا وہ ہر طرح قابلِ تشکر و تحسین ہے۔

تنویر احمد علوی

۲۵ ر دسمبر ۱۹۹۰ء

خ

بنام مرزا علی بخش بہادر

۱

فرد ۔ کارِ برادر بہ برادر ۔ نکوست
بہ ز برادر نتواں یافت دوست

(بھائی، بھائی کے کام آئے اس سے بہتر اور کیا ہے اس دنیا میں بھائی سے زیادہ اور کوئی غم خوار بھی تو نہیں ہوتا ۔)

ہر چند یہ میرا شیوہ نہیں کہ میں دراز نفسی اختیار کروں اور جو میرے ہمدم و غم خوار ہوں اپنے دکھ انھیں دیدوں لیکن تم میرے بھائی بھی ہو اور میرے دوست بھی۔ اس لیے تم سے کہتا ہوں اور اُسے اپنی ناچاری خیال کرتا ہوں کہ ایک اچھا خاصا وقت میں نے اس خوش اندیشی میں گزارا ہے کہ وہ میرے لیے کچھ کریں گے ۔

کیا کہوں کہ میں اِس انتظار کی آگ میں کس طرح جلتا رہا ہوں اور کیسے اس عذاب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے بیٹھا ہوں ۔ یہ وہ دُکھ ہے جو گوشۂ زنداں میں قیدی کسی مجرم کے حصّے میں بھی نہیں آتا اور وہ دیکھ رہا ہوں جو کوئی کافر جہنّم میں بھی نہیں دیکھ سکتا ۔

میں فیروز پور اس لیے نہیں آیا تھا کہ پھر یونہی بے نیل و مرام دہلی واپس ہو جاؤں ۔ نواب صاحب نے بہت طفل تسلیاں دیں اور وہ اندازِ ستم روا رکھا جو التفات معلوم ہوتا تھا ۔ اِس سلوک نے مجھے گمراہ کیا ۔ اب اس پر تا بکے صبر کروں اور اس ناہموت میں کب تک خوش رہوں ۔ شاہ جہاں آباد کے در و دیوار سے مصیبتیں برستی اور بلائیں نازل

ہوتی ہیں۔ میرے دن بھی میری سیاہ بختی کے باعث راتوں کی طرح تاریک کیوں نہ ہوں۔ سوچو تو سہی کہ کوئی انسان جو مسلسل بارشِ سنگ کی زد میں ہو، خود کو شیشۂ مئے سے کب تک بہلاتا رہے۔

میر امام علی کو میں نے اپنی عرض داشت کے ساتھ نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا ہے۔ زنہار میرے ساتھ زمانہ سازی نہ کرنا اور نواب صاحب سے محابانہ برتنا۔ جب یہ عرض داشت پیش ہو اور پڑھی جائے اس وقت تمہیں بھی اس انجمن میں موجود ہونا چاہیے تاکہ تم میری نگارش کو گزارش سے تقویت بخشو اور میر امام علی کو حوصلہ ملے۔

برایں ہمہ میں طلبِ مدعا میں اتنا بھی بے صبر یا آتش زیر پا نہیں ہوں کہ میری خواہش کو سرتاسر ابرام، تصور کیا جائے۔ میرے دوست مجھ سے کہتے ہیں کہ میں نواب صاحب سے خود کیوں نہیں ملتا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ نواب صاحب میری چارہ گری اور کار برآری پر آمادہ نہ ہوں۔ الحال جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ ان ادا ناشناسوں کی زبان بندی کے لیے ہے۔

خدارا ایسا کرو کہ میر امام علی جلدی سے واپس آجائیں اور مجھ سے ملیں تاکہ میں ان دوستانِ ناصح کو خیرباد کہہ سکوں اور اپنی بے سرو سامانی کے ساتھ دیارِ مشرق کے سفر پر روانہ ہو جاؤں۔

ایضاً

[۲۰]

برادرِ مہربان گرامی تراز جان، سلامت۔ مداری خاں پہنچ رہا ہے اور اسی کے ساتھ یہ خط بھی۔ میرے کالائے بد میں سے جو کچھ وہاں ہو وہ اُسے سونپ دیں اور جو کچھ منا خان حقہ بردار کو ودیعت کیا گیا ہے وہ بھی میرے نام سے لے کر دیدیں۔

یہ سننے میں آرہا ہے کہ نواب صاحب دہلی پہنچ رہے ہیں، بارے اس خبر کے جھوٹ یا سچ ہونے سے متعلق جو بھی صورت ہو مجھے مطلع کرو نیز یہ بھی کہ تم نواب صاحب کے ساتھ آرہے ہو یا نہیں۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر نواب صاحب کے عزمِ سفر کی خبر غلط ہو تو میں خود فیروز پور پہنچوں اور عمّ عالی مرتبت کا شرفِ قدم بوسی حاصل کروں اسی کے ساتھ تمہاری دید کی مسرّت سے بھی اپنے دیدہ و دل کو شادماں کروں۔

ایضاً
[۳]

برادرِ والا گوہر خجستہ اختر کو (جن کی آنکھیں دوریوں کے باوجود میری طرف لگی رہتی ہیں،) معلوم ہو کہ غالبِ راہ رو کا زمانۂ دشت نوردی تمام ہوا اور اُس نے اپنی منزلِ مراد یا کلکتہ پہنچ کر رختِ سفر کھول دیا۔

شہر کلکتہ ایک ایسا دیار ہے جہاں ہر نوع کے ساز و سامان کی فراوانی ہے، جس کے ہنرمندوں کے لیے چارۂ مرگ کے سوا ہر طرح کے دکھ درد کا مداوا آسان ہے اور خوش نصیبی کے علاوہ اس کے بازاروں میں ہر شئے بہ افراط ملتی ہے۔ میری فرودگاہ شملہ بازار میں واقع ایک کاشانہ ہے جس روز میں یہاں پہنچا، اُسی دن یہ مکان بغیر کسی زحمت اور تردّد کے مجھے کرائے پر مل گیا۔

اِسے ایزدی نوازشوں میں شمار کرنا چاہیئے کہ مجھ جیسے ایک نو وارد کو جس کی مثال کسی ایسے شخص کی سی ہے جو ابھی خوش خوابی سے پوری طرح بیدار نہ ہوا ہو اور ہاتھ مُنہ دھوئے بغیر حکامِ والا مرتبت کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا ہو، اُسے صاحبانِ والا شان اپنے دل و نگاہ میں جگہ دیں اور اپنی انجمن میں وہ رُتبۂ عالی عطا کریں جو اُس کی اپنی خواہشوں سے بھی کچھ فزوں تر ہو۔ مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ کو میرے حال پر بہت رحم آیا۔ یہ ایک انگریز افسر ہیں اور اعیانِ کونسل میں سے ہیں۔ نیز ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ وہ درد مند دلوں کے چارہ ساز اور خستہ خاطروں کے غم گسار ہیں۔

اگرچہ میرا یہ دل کہ ایک مدّت سے مایوسیوں کا خوگر ہے یکایک ناامیدی کے رشتے کو منقطع بھی نہیں کر سکتا۔ پھر بھی اگر یہ مردِ توانا دل اپنی کام بخشی سے کہ جادو کا سا حکم رکھتی ہے مجھ میں اور میرے احساسِ نامرادی میں ایک دائمی جدائی کی طرح ڈال دے

تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔

میر فضلِ مولیٰ خاں میرے ایک دوست ہیں دورانِ سفر، مُرشد آباد میں اچانک اُن سے ملاقات ہوگئی سلسلۂ گفتگو میں یہ بات اُن کی زبان پر آئی کہ نواب فخر الدولہ کا انتقال ہوگیا۔ کلکتہ پہنچا تو مرزا افضل بیگ اور دوسرے کچھ دوستوں سے بھی وہی معلوم ہوا۔

افسوس کہ اِس خاندان کا چراغ روشن نہ رہا اور اس کے شبستانِ آرزو میں اندھیرا چھاگیا۔ میں تمہاری طرف سے فکرمند ہوں اور اندیشہ یہ ہے کہ اب جو کچھ ہوگا وہ تمہارے حسبِ دل خواہ نہ ہوگا۔ ناکسوں کی بن آئے گی اور نا اہلوں کا دور دورہ رہے گا۔ خدا نہ کرے کہ یہ انجمن درہم برہم ہو جائے ناکردہ کار و بدخواہ جمع ہوں۔ خوش بختی کنارہ کرے اور آسودگی رخصت ہو۔

دیکھو پوری طرح دور اندیشی سے کام لیتے رہنا اور ہمہ وقت اپنے حال احوال پر نظر رکھنا اسی کے ساتھ میں یہ بھی چاہوں گا کہ اس خط کا جواب مجھے بغیر کسی تاخیر کے مل جائے اور اس آشوبِ ماتم کے بعد جو صورتِ حال بھی وہاں سامنے آئی ہو اُس سے مجھے مطلع کردیا جائے۔ خدا تمہیں عمرِ دراز، بختِ سازگار اور دانشِ سودمند ارزانی فرمائے۔

والسلام

ایضاً
[۴]

(از کلکتہ)

برادر بجاں برابر۔ باتوں کا سلسلہ فراوانی کے باعث بے طرح خلط ملط ہو جاتا ہے اور رشتۂ سخن گرہ در گرہ نظر آتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بات کم کروں اور اس کا فائدہ بہت ہو اور سننے والا دُور بیٹھے ہوئے بھی اس کو سمجھ لے۔ اب ظاہر ہے یہ اسی صورت میں قرینِ امکان ہے کہ لکھنے والا یہ کوشش کرے کہ تحریر، تقریر سے اتنی دور نہ چلی جائے کہ پھر دونوں کے سروں کو ملانا ہی مشکل معلوم ہو اور ایک کا نقش

دوسرے کے آئینے میں نظر نہ آسکے۔

دیکھو تھوڑی دیر کے لیے ادھر متوجہ ہو جاؤ اور اپنے گوشِ سماعت کو میری طرف کرلو تو تمہاری سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیوں کہہ رہا ہوں. اس کے بارے میں تمھیں کیا کرنا ہے اور اس کا "اندازہ بایست" کیا ہونا چاہیئے. مخفی نہ رہے کہ اس دیار کے جاہ مندوں میں سے نواب علی اکبر خاں نامی ایک بزرگ بھی ہیں جو بہت ہی گراں مایہ، ہوش مند اور صاحبِ خیر انسان ہیں. جب انھیں یہ بات معلوم ہوئی کہ کونسل کے صاحبانِ اختیار نے میری کار برآری (مقدمہ کے کاغذات) کو حاکمانِ دہلی کے سپرد کردیا ہے، تو انھوں نے منشی التفات حسین صاحب کو ایک سفارش نامہ لکھ دیا. منشی التفات حسین اور نواب صاحب موصوف سے دیرینہ رسم وراہ ہے۔ یہ سفارش نامہ میں نے اپنے خط میں ملفوف کرکے لالہ ہیرالال کو بھیج دیا ہے. مجھے یہ بھی خبر مل گئی ہے کہ وہ خط منشی صاحب تک پہنچ چکا ہے اور نئے سرے سے یک دلی کا رشتہ استوار اور کارسازی کا عہد نامہ تازہ ہوگیا ہے۔

علاوہ بریں آغازِ کار میں، کرنل ہنری املاک (سپہ دارانِ انگریزی میں اس طرح درجۂ امتیاز رکھتے ہیں جیسے ماہِ تاباں دوسرے ستاروں کے مقابلے میں اپنے حُسنِ فروغ کے باعث بہت نمایاں اور روشن نظر آتا ہے. نیز صاحب ریزیڈنٹ دہلی کے لیے جن کی حیثیت ایک منہ بولے بیٹے کی سی ہے. موصوف نے میرے حق میں کلماتِ خیر لکھ کر بھیجے تھے اور یہ انھیں کے انفاسِ گرم کی کارفرمائی اور کلمۂ خیر کا اثر ہے کہ حاکمِ دہلی کی توجہ مجھ داد خواہ اور میرے وکیل کے حال پر کچھ زیادہ ہے۔

اب وقت ہے کہ میرے مقدمے کی رپورٹ محکمۂ ریزیڈنسی دہلی سے کلکتہ کی جانب جلد از جلد بال کُشا ہو. تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم منشی التفات حسین خاں سے گفتگو کی سلسلہ جنبانی کرو بات کو وہاں لاؤ جہاں کرنل ہنری املاک کے سفارش نامے کا ذکر جو صاحب ریزیڈنٹ دہلی کے نام لکھا گیا ہے درمیان میں آجائے

تاکہ گلِ مراد شگفتہ ہو اور میری بات کی قدر حاکمِ دہلی کے دل میں بڑھ جائے۔

اِس کے ماسوا اس مقدمے کی خوش انجامی کے لیے جن امور کی ضرورت ہوگی وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اس ہنگامۂ کار میں خود بھی وہاں موجود رہو اس سے زیادہ میں کیا لکھوں کہ دلی محبت اور قلبی تعلق میں من و تو کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(والسلام)

بجواب شقّہ صاحبِ عالم مرزا سلیمان شکوہ بہادر

[۵]

بہ حضورِ فیض گنجور، صاحبِ عالم و عالمیاں، شہزادہ کیواں بارگاہ، اورنگِ سلیمانی کے مسند نشین اور دودمانِ گورگانی کے چراغِ روشن کہ خدا ان کے اقبال و اجلال کو قایم و دایم رکھے۔

یہ بندہ بارگاہِ سلیمانی میں صف بہ صف کھڑے خانہ زادوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ مہرِ جہاں تاب کی پیش گاہ میں ذرّۂ ناچیز کی پرافشانی اور دریا کے موج زن کے سامنے تنگ مایہ قطرہ کی بساطِ ارادت پر سجدہ ریزی اس آئینۂ نمائش کی صیقل کرنے والی اور اس میلانِ خاطر کی پردہ کشا ہے اگر ورودِ ہمایوں کا رشحۂ فیض جہاں و اہلِ جہاں جس کے طاعت گذار ہیں، اس ہوا خواہ کے تنِ بے جاں میں روح تازہ نہ پھونک دیتا۔ اس ذرّہ نوازی و رواں پروری کا شکریہ کیسے ادا کیا جاتا۔ یہ کیا جان و کیا جہان ہے کہ ہر قالب کو ایک جان سے زیادہ نہیں دی گئی جبکہ اس منشورِ والا کے عنوان کی رونمائی ایک جان سے تو نہیں ہو سکتی۔

انصاف بالائے طاعت ہے، یہ مبالغہ کہ جاں فشانی کے باب میں برتا گیا اس سے بھی دل خوش نہ ہوا کہ یہ تمام جانیں کلکِ خسروی کے فیضِ جنبش کا عطیہ ہیں۔ جس کام کی انجام دہی کے لیے حکم فرمایا گیا ہے آپ ہی کی خاکِ پا کی سوگند جو عرش کی بلندیوں کو چھونے والی ہے اگر میرا دل قابو میں ہوتا اور میری خاطر جمع ہوتی تو میں اپنے سر کو قدم بناتا اور پیشانی کے بل اس وادی میں سفر کرتا۔ میرے مشفق خاں صاحب

سیّد قاسم علی خاں نے اس صورتِ حال کا مشاہدہ کیا ہے کہ یہ بندۂ خانہ زاد کس طرح غم واندوہ سے دست وگریبان رہتا ہے۔

اب اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ میں پا بہ رکاب ہوں اور اس عرض داشت کی نگارش سے اگلے دن دشتِ آوارگی میں گام فرسا ہو جاؤں گا۔ اور اتفاق یہ کہ میرا کوئی شہر کیا کوئی مقام بھی معیّن نہیں ہے۔ ہر روز کسی نئی جگہ اور ہر رات کسی نئی بستی میں ہونگا۔

سیّد قاسم علی خاں نے اس خانہ زاد کے منع کرنے کے باوجود کہیں راہ اور کسی رائے کو پیش نظر نہیں رکھا وہ پانی پت پہنچے اور حاکم کو نہ پاکر واپس لوٹ گئے چند باتیں بطور مشورہ خاں صاحب موصوف کو سمجھا دی گئیں امید کہ اگر اس کے مطابق چلیں گے تو شاہی امور کی انجام دہی میں کامیاب ہوں گے۔ زیادہ حدِّ ادب خدا کرے کہ اقبال کو تابانیٔ جاوداں نصیب ہو۔

بنام سبحان علی خاں

[۶]

اے آں کہ ہُما اسیرِ دامت باشد
صافِ مئے خسروی بجامت باشد
تسبیح بہ ہر اسمِ الٰہی کہ بُوَد
آغاز بہ زابتدائے نامت باشد

(اے کہ اوجِ سعادت کا ہُما، تیرے دام میں اسیر ہو اور شاہی شراب کے بہترین جرعات تیرے جام میں ہوں۔ اسمائے الٰہی سے جس نام کی بھی تسبیح پڑھی جائے اس کا آغاز بہ ہر صورت تیرے نام سے ہوگا۔)

میرا پیکرِ خیال در بدر بھٹک رہا ہے اور سر رشتۂ گفتار گرہ در گرہ ہے۔ میرا دل ہزار غم و غصّہ کے ساتھ ستیزہ کاری میں مصروف ہے اور میرے لب ہزار نغمہ سنجیوں کے ساتھ محوِ خروش۔ میں اپنے مقتضائے فطرت کے مطابق پیمانۂ آفرینش کے لیے دردِ تہِ جام ہوں اور اپنے احوال کے اعتبار سے میرا وجود پیشانیٔ بینش کے لیے ایک داغ کا حکم رکھتا ہے۔

بایں ہمہ میں اپنی ہمت کو سراہتا ہوں کہ اس دورِ آشفتگی میں سوائے فرماں روائے اودھ کے آستانے کے میں نے کسی اور کی چوکھٹ پر سر نہیں جھکایا اور اسی کے ساتھ میں اپنے طالع کی فرخ مندی کی تعریف کرتا ہوں کہ اس جستجو میں بجز خانِ رفیع الشان کی طرف رجوع کرنے کے کسی اور کا احسان نہیں لیا۔ اس آرزو کا کانٹا میرے دامنِ دل سے اُلجھا ہوا ہے اور اس غمناکی و شورانگیزی نے میرے دل میں غوغائے قیامت برپا کر رکھا ہے کہ یہ عرض داشت شبستانِ اودھ کے آصفِ ثانی کی نگاہِ قبول سے فروغ پائے اور یہ قصیدہ ان کی بزمِ بہشت آئین میں پڑھا جائے تاکہ مجھے کہ سخن پیرا و ستایش نگار ہوں انعامِ خسروی سے امتیاز اور سُرخ روئی حاصل ہو اور یہ صلہ بھی اس گراں مائیگی کے ساتھ عطا ہو کہ زمانے میں میری نام آوری کا سبب بنے اور خود اپنی نگاہ میں بھی مجھے سربلند کر دے۔

عقل مجھ سے کہتی ہے کہ آرزوؤں کا حصول دشوار اور ان خواہشوں کی پرستاری ناروا ہے کہ دور باش پاس سامنے ہے لیکن اس فکر و اندیشہ میں دل اس خیال سے تقویت پاتا ہے کہ خانِ ارسطو تدبیر کے پاس چارہ سازی کے وسایل بہت ہیں اور شاہ و وزیر کا دستِ بخشش بہت کشادہ ہے۔

ہاں ہاں پرتوِ مہر چوتھے آسمان سے زمین کے ذرّوں کو پُرنور کرتا ہے اور بارش کے قطرے ہوا کی بلندیوں سے اتر کر خاک سے پیوند رکھنے والے پودوں کے رگ و ریشہ میں جذب ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس تگ و دو میں ایک رہرو تشنہ لب سے مشابہ ہوں جو پرویزن (چھلنی) کو چادر کے ایک گوشے میں باندھ لیتا ہے اور اس غرض سے کنوئیں میں ڈالتا ہے کہ اس سے پانی کھینچے۔

بے پروائی سے یہ تماشہ دیکھنے والوں کے لبوں پر ہنسی آتی ہے وہ اس خستہ جگر کے

دردِ دل کا کوئی احساس نہیں رکھتے لیکن جو لوگ مروّت و محبت والے ہیں اور غم گساری واندوہ رُبائی جن کا شیوہ ہے وہ اس کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں اور اس کی دستگیری کرتے ہیں کاش اس مثال کی پیش کش جو میری صورت حال کا آئینہ ہے میرے اسرارِ مدعا کی پردہ کشائی کے لیے کافی ہو اور یہ لب تشنہ و سادہ لوح مسافر والا مناقب خاں صاحب کی نظر میں بجز مہربانی و لطف کے کسی اور بات کا مستحق نہ ہو۔

ایضاً

[۲]

فخر و مسرت کے اس احساس کے ساتھ کہ میں کسے خط لکھ رہا ہوں اور میرا مخاطب کون ہے، شادمانی و کامرانی کے اس تصور میں کچھ ایسا مست و سرشار ہوں کہ زمین و آسمان میں پھولا نہیں سماتا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ظہوری نے کیا خوب کہا ہے۔

گرچہ خردیم نسبتےست بزرگ
ذرّہ آفتاب تابانیم

(اگرچہ ہم چھوٹے ہیں لیکن ہماری نسبت بڑی ہے۔ ہم وہ ذرّے ہیں جو اپنی

تابانیوں میں سورج کی روشنیوں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔)

بزرگوں سے ہم سخن ہونا سرفرازی و افتخار کی بات ہے۔ جس کے احساس سے قوّتِ گویائی لطف و کیف میں کچھ اس طرح ڈوب جاتی ہے کہ اِس عالمِ سرور و انبساط میں زبان، دل کو مبارک باد دیتی ہے اور دل ان سعادتوں سے بھری ساعتوں کے لیے پذیرائے سپاس ہو جاتا ہے۔

سخن نے آغازِ گفتار ہی میں شیوہ بیانی اختیار کی اور دیدِ اندیشہ کی بادِ ہُو دروازۂ ہوش کے واسطے وجۂ کشایش بن گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گفتار کی پیدائی کس آہنگ سے نمودار ہوتی ہے اور اس کشاکش میں نغمۂ شوق کس پردہ سے سامعہ نواز ہوتا ہے۔ زبان کی آراستگی والے عنوان نامہ کو اب دیکھیے کس اسلوب سے زیبائی بخشتی ہے۔ اگر میں بھی شوخیٔ اندیشہ سے کام لیتے ہوئے اس شیوۂ بیان کی طرف رُخ کروں تو عقل خرم سے لب بدنداں ہو جاتی ہے کہ زنہار تم اس طرف نہ آؤ کہ تمہیں حضرتِ ممدوح کا اندازۂ کمال نہیں اور بندگانِ بارگاہ کی مدح باندازۂ حالیت نہیں کر سکتے۔ اِس داعیہ کے لائق ہونے کی بات تو ارسطو کے لیے سزاوار ہے اور شایستگی کے ساتھ یہ دعویٰ بو علی (ابن سینا) کے لیے مناسب ہے۔

سادہ ضمیر لوگ اپنے قلم کی توانائی حرفِ شوق سے آزماتے ہیں۔ اگر میں فکرِ گستاخ کے ایما پر یہ روش اختیار کروں تو ادب کہتا ہے کہ تم ہرگز تمنائے زمیں بوسی کے قابل نہیں اور تمہیں ممدوح کے آستانے کے گرد طواف کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ منصبِ جلیل تو عطارد کے سپرد کیا جا سکتا ہے اور یہ مرتبۂ والا تو مشتری کے لیے مبارک و موزوں ہے۔

ہاں ہاں مجھ ایسے کے لیے اس حد تک آبرومندی کافی ہے اور اگر میں حق سے نہ گزروں تو آرزو بھی اس سے زیادہ اور کیا ہے کہ میں پیش گاہِ قبول میں قلندرانہ ہو حق کروں، گداؤں کی طرح شیئاً للّٰہ کہوں اور روزینہ ڈھونڈتا ہوا افتاں و خیزاں آپ کی بارگاہ تک پہنچوں۔ سائل کی ریزشِ آبرو جو فرطِ لطافت سے کسی کان کے پردے

میں خراش نہیں پیدا کرتی آپ کی سماعت کے لیے بھی وجۂ گرانی کیوں بنے گی۔
حضرت والا کا مشام جاں بے نوایوں کے جگر سوختہ سے آتی ہوئی بوئے کباب سے عطسہ ریز نہ ہونا چاہیے۔

ایضاً
[۸]

سخن وروں کے قبلۂ حاجات اور دامن آرزو پھیلانے والوں کے کعبۂ مقصود۔
قصیدے اور عرض داشت کو خدمت اقدس میں پہنچے ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے۔
میں نے صرف اتنا ہی سنا ہے اور یہی خبر مجھے "نعل در آتش" رکھتی ہے کہ وہ ابیات وزیر اعظم کی انجمن ہمایونی میں پڑھے گئے اس کے ماسوا یہ ہنوز نہ معلوم ہو سکا کہ ان پر کس حد تک توجہ مبذول ہوئی اور چونکہ اصل مقصد اس خاص معاملہ میں کشایش کار کے ضمن میں یہ ہے اُسے بارگاہ خسروی میں کیسے پہنچایا جائے۔
اگرچہ میرے نقد سخن کو رونق و رواج حاصل ہے لیکن میری شاعری کو طالع رسا نہیں بخشا گیا میرے ان ابیات کو جس طرح خان والا شان تک رسائی میسر ہوئی اسی طرح؛ گر وزیر آصف نظیر تک یہ سخن پارے نہ پہنچے تو بارگاہ سلطانی تک ان کا پہنچ جانا معلوم اس شکل میں میرا اندرانہ کلام ایک قدم بھی کیسے آگے بڑھ سکے گا۔
جب آپ کی توجہ فرمائی اور مہربانی سے یہاں تک کام ہو گیا تو وہ مزید بہتری کی طرف رُخ کیوں نہ کرے اور یہ ارمغان شعر وزیر تک رسائی پا جائے تو بادشاہ کی نظر کیمیا اثر سے کیوں نہ گزرے۔
قدردانی میں میری سبک روی کی قدر شناسی بھی اس تحریر سے ہو گئی ہے سخن ہائے گفتنی بہت ہیں اس لیے میں نے اختصار کی روش اختیار کی آرزوئے صلہ یابی کی شورش اور جائزہ و بخشش کے شور انگیز تقاضے کے ساتھ عطائے وزیر اور بخشش سلطانی کا سودا میرے سر میں سمایا ہے۔ اور بہت سے رنگوں کو ملا کر میں نے ایک انوکھا مرقع تیار کیا ہے کہ اُسے بادشاہ کی رہ گزار میں نقش نظارہ بنا دیا جائے تاکہ جب بادشاہ کے

کشورِ دانش و بینش کے فرماں روا ہے اور علم و آگہی کا مربی، ان اوراق کو دیکھے تو وہ یہ جان لے کہ اس راہ روی کی تمنا کیا ہے۔ میں نے شکستِ رنگ کے باب کی ایک فصل تحریر کی ہے میری پیشانی سے میرے رازِ دل کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

بنام مولوی کرم حسین خاں

[۹]

(سفیرِ شاہ اودھ)

قبلۂ حاجات برادرِ مشفق و مہربان نواب فخر الدولہ امین الدین خاں نے جو نویدِ قبول بھیجی ہے، اس نے دل میں سپاس گزاری کا ولولہ پیدا کر دیا اور خوانِ کرم سے دی گئی صلائے عام نے مجھ فقیر کے حوصلۂ حرص و آز کو بڑھا دیا۔ بہر نوع طالبِ عطوفت کی بات ابرام تک پہنچ گئی ہے اور دریوزہ گری میں خواہی نخواہی نام آوری کی "فکرِ فضول" سامنے آ رہی ہے۔

میرے قبلہ و کعبہ کے خاطر نشان ہو کہ میں اس قطعے کے نگارش کے صلہ میں جسے میں اپنا "دستِ مزد" تصور کرتا ہوں، وہ بادشاہ سے روشناسی و تشریفِ قبول، نویدِ التفات و عطیۂ فتوح ہے۔ لیکن اس طلسمِ مدعا کی کشایش اس بات پر منحصر ہے کہ ممدوح کو ستایش گر کے مرتبہ و مقام کا احساس دلایا جائے تاکہ عطا و بخشش اس کی قدر و منزلت کے مطابق ہو۔ ورنہ ظاہر ہے یاد خوانوں کا جائزہ کتنا اور مدح گستروں کی آبرو کیا۔

اندیشہ یہ فتویٰ دیتا ہے اور عقل اسے باور کرتی ہے کہ ان مراتب کا (حصول) بجان علی خاں صاحب کی گفتار کے انداز سے نہ ہو سکے گا کہ سائل کی خاکساریوں کی آبرو خود ان کی نظر میں بھی نہیں اور وہ اسے "شاعرِ صلہ جو" کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے اگر میرے مخدوم کو بیکس نوازی کا خیال ہے تو شاہی عرض داشت کے ساتھ اس قطعے کو بھی شامل کر دیں اور جو کچھ اس نامہ نگار کے بارے میں مناسب تصور فرمائیں وہ بھی لکھ دیں تاکہ میں بادشاہ کی نگاہ میں ذی وقار بھی ہو جاؤں اور صلہ و انعام سے بھی نوازا جاؤں۔

انصاف طاعت سے بالاتر ہے اگرچہ فرمانروائے اودھ کی شان اس سے ارفع

ہے کہ مجھ ایسا کوئی شخص ان کی ستایش میں لب کشائی کرے لیکن میں اس شیوۂ سخن میں کہ ثنا خوانی و سخن رانی سے عبارت ہے اپنے دودمان ذی شان کے لیے وجہِ ننگ ہوں اور ناکسی کی شرم کے باعث سر بہ گریباں نظر آتا ہوں جیسا کہ عرفی نے کہا ہے۔

زدودمانِ اسلیم' ہمیں گواہ بس
کہ شرم این سخنم خوی ز چہرہ' بیروں داد

(میں دودمانِ عالی سے ہوں اور میرے لیے یہی گواہی کافی ہے کہ اس بات کے آتے ہی میرا چہرہ آبِ خجالت سے تر ہو گیا۔)

فی الجملہ میں اپنی قسمت کا سپاس گزار ہوں کہ میرا ممدوح صاحب خلق عظیم ہے اور اس آرزومندی میں میرا واسطہ ایک ایسے کریم النفس شخص مولوی سید کرم حسین خاں سے ہے جو اسد اللہ کے ساتھ سوائے کرم کے اور کوئی سلوک نہیں کر سکتا۔ توقع تو یہی ہے کہ قدر افزائی اور قدر دانی جیسی ہونی چاہیے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی

بنام امداد حسین خاں بہادر

[۱۰]
(وزیر شاہ اودھ)

بوالاحضرت' فلک رفعت نواب ہمایوں القاب عالی جناب صاحب السیف والقلم قبلۂ عالم و اہل عالم۔

عرض پرداز خدمت عالی ہوں کہ ایک زمانہ سے جناب والا کی (جو عہدۂ وزیریں آصف جمشید نشان ہیں،) فرخندہ روئی، نجستہ طبعی، رسائی اندیشہ، روشنی رائے اور روائی فرمان کے بارہ میں سنتا رہوں برابر وہ سوچتا رہا ہوں جو مجھ ایسا کوئی آدمی سوچ سکتا ہے اور یہ خیال میرے ذہن میں گشت کرتا رہا ہے کہ ایسا کیا کیا جائے کہ میں روشناس التفات ہو جاؤں اور خود کو چشم روشن کی عرضہ گاہ اقبال میں پیش کر سکوں۔

بارے چونکہ اس نیازمند کا ستارہ راست رو تھا اس کی فکر درست ثابت ہوئی۔ دل سودا زدہ کی جیب میں غیب سے بہ زرِ اندیشہ ڈال دیا گیا کہ وہ گمنامی خاموشی

نگارش قلم کو دستاویز بنائے جو سپہر سخن کے واسطے بہ منزل سروش ہے۔ تاکہ میرے سجدہ ہائے نیاز جو خط سرنوشت کے ساتھ توام ہیں، بہ صورت نقل و تحریر اس بارگاہ ارم کارگاہ کے گوشہ بساط کے تئیں نذر کر دیے جائیں۔

اس بنا پر کہ سخن گستری میرا شیوہ اور ستایش گری میرا آیین نشاط ہے اس لیے مجھ نیاز مند نے آپ کی انجمن سراپا شکوہ کی مدح دلکشا کے ساتھ راہ سخن وا کی اور گہر سنجی قصیدہ کے بجائے ایک قطعہ ستایش کو زیادہ درخورِ فکر تصور کیا۔

میں اپنے ذوق ستایش کی فراوانی پر ناز کرتا ہوں کہ ایک ایسا قطعہ دلکشا انجام پذیر ہوا جس کا پیرایہ نظم پیدائی راز اور پردہ کشائی آرزو میں نثر کا کام کر سکتا ہے اور یہ نظم اس اعتبار سے مشابہ نثر ہے۔

سلطان دارا دربان کی مدح میں قصیدہ کی بات درمیان میں آئی۔ ذوق گزارش کی جگر تشنگی باقی رہی اور ایک دوسرا قطعہ کہ روانی میں زلال خضر (آب حیات) کی مثال ہے رگ کلک سے قطرے کی طرح ٹپک پڑا چنانچہ یہ دونوں قطعات جو اس عرض نامہ کے ساتھ ملفوف ہیں نظر والا سے گزریں گے۔ میں ایک مور ضعیف ہوں آصف زوداں کی دستگیری سے عہد موجود کے سلیمان تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔

میں ایک فقیر راہ ہوں اور اس کا آرزو مند ہوں کہ ارسطو کی پامردی سے سکندر تک میری رسائی ہو جائے اب کہ بات یہاں تک پہنچ گئی یہ نیاز مند یہ چاہتا ہے کہ حد ادب کو نظر میں رکھے اور مور بے مایہ کو آصف ... فقیر کو ارسطو اور اپنے آپ کو خداوند کے سپرد کرے۔ نیر دولت و اقبال کو کہ سرچشمہ خوش بختی و فروغ ہے ... ہمیشہ چمکنے والی روشنی اور ابدی ضیا باری نصیب ہو۔

بنام رائے چھجمل کھتری

[۱۱]

صاحبِ من. ہر چند میں یہ چاہتا ہوں کہ نالہ کشی کرکے دوستوں کے لیے دردِ سر کا باعث نہ بنوں لیکن اضطرابِ دل میں جوش مار رہا ہے اور جس قدر میری طبیعت اس سے آشفتگی محسوس کرتی ہے میری یہ سعیِ رائیگاں بڑھتی جاتی ہے کہ میں دامنِ آوارگی کو اپنی کمر سے باندھ لوں اور ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاؤں، لیکن کیا کروں میرا دستِ قدرت پتھر کے نیچے آیا ہوا ہے۔ کتنے نالے ہیں کہ خوفِ رسوائی سے میرے لبوں تک نہیں آتے کہ آرزوئے دل کا خون ہو سکے اور کتنی امواجِ خوں ہیں کہ دردِ بیکسی کے باعث اشکوں کی شکل میں آنکھوں سے باہر نہیں آسکتیں۔

اس رنجِ بیدلی کا کوئی علاج بھی میری نظر میں نہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا۔ ظاہر ہے کہ جو طائر قفس سے نکل کر پھر جال میں پھنس گیا ہو اس کا اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے اور جس ناخن میں کیل ٹھونک دی گئی ہو اس سے

کیا گرہ کشائی ہو گی۔ وطن سے دوری، عزمِ سفر اور عالمِ غربت کا آرام ایک خواب ہے کہ خدا نہ کرے کسی متنفس کے حصے میں آئے۔ اس شخص کے بختِ رمیدہ اور طلب واژگوں پر افسوس ہے کہ وہ جن چیزوں کا طلب گار ہو اور انھیں کو نہ پا سکے۔

اگرچہ میں وطن میں نہیں ہوں لیکن وطن سے قریب ہونا بھی قیامت سے کچھ کم نہیں اب تک اہلِ کاشانہ کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہے لیکن جو کچھ دیکھنے میں آتا ہے وہ آشوبِ چشم کا درجہ رکھتا ہے اور جو سننے کو ملتا ہے وہ زحمتِ گوش، کے علاوہ اور کیا ہے۔ میں موج کے ان تھپیڑوں سے جو نیم جاں، لے کر باہر آیا ہوں شاید خاکِ فیروز پور کی امانت ہے کہ مجھے بہ جبر و کراہ اس قیام پر راضی ہونا پڑا۔ اپنی موت جو میں ہزار آرزو کے ساتھ خدا سے چاہتا ہوں شاید اس کے لیے سرزمین موعود یہی فیروز پور ہے لیکن بوجہ افتادگی یہاں کے قیام میں اس قدر درنگ واقع ہو رہی ہے۔

نوّاب معلّی القاب ن سعادتِ ورود کی خبر سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس سے میرے مدّعا کے پورے ہونے کی کوئی راہ نہیں نکلتی کہ وہ تو اور والوں کا افسانہ "نکبت" قاتلوں کی صفوں کی آرائش، دشمنوں کے منصوبوں کی برگشتگی اور "دولت نخریہ" (سرکار نواب احمد بخش خاں) کے خیر سگالوں کی امید بر آری کے سوا کچھ نہیں۔

المختصر یہ بات کہیں سے سننے میں نہیں آئی کہ نواب صاحب اس عرصہ میں رونق فزائے فیروز پور ہوں گے۔ دلِ مضطر کو کسی طرح تسکین نہیں ہوتی۔ جو دوست کہ نواب صاحب کی رکاب میں ہیں ان میں سے وہ مہربان جو اسد نوازی اور غالب پروری میں پیش پیش اور منصف مزاج ہیں ان کا یہ حال ہے کہ وہ تنگ نائے اضطراب میں پھنسے ہوئے اس درماندہ راہ کو کبھی سلام سے بھی یاد نہیں کرتے تو ورودِ سعادت کی خبر تک بات کیسے پہنچے۔

ستم کشی کی طاقت ختم ہو گئی اور انتظار اپنی حد سے گزر گیا۔ میری مثال اس شخص

کی سی ہے کہ جو میدانِ کارزار میں اپنے پیر پر کاری زخم لگ جانے کی وجہ سے نہ حریف کے سامنے سے گریز و فرار کی راہ اختیار کر سکتا ہے اور نہ دشمن سے مقابلہ و مقاتلہ کی تاب لا سکتا ہے جیسا کہ عرفی نے فرمایا ہے۔

فرد مرا زمانہ ٔ طناز دست بستہ و تیغ
تبر بفرقم و گوید کہ ہاں سرے می خار

[زمانہ کی ستم ظریفی تو دیکھو کہ اس نے میرے ہاتھ باندھ دیئے اور تلوار کو اسی طرح چھوڑ دیا۔ اس نے میرے سر پر تبر رکھ دیا اور اس کے بعد طنازی سے کہتا ہے کہ ہاں اب تم اپنا سر کھجا سکتے ہو۔]

خدارا کرم فرمایئے اور زمانِ ورودِ سعادت کے ـــــ بارہ میں لکھیے کہ میری طبیعت بے طرح متوحش ہے اور اپنے سے بیزار اور دل کہ صدہا تشویشوں میں مبتلا ہے اس کی بیقراری حد سے بڑھ گئی ہے شاید اس بہانے اُسے ایک گونہ تسکین میسّر آئے اور وہ اپنے آپ کو اس سے زیادہ مبتلائے اذیت نہ رکھے' اب اور کیا لکھوں الّا بس باقی ہوس۔

ایضاً
[۱۲]

میرے مشفق و مہرباں رائے صاحب کی صائب رائے پر مخفی نہ رہے کہ آپ کے مودت نامہ کے جواب میں جو تاخیر ہوئی اس کا سبب تغافل بہر حال نہ تھا۔ اس لیے کہ جس زمانہ میں عطوفت نامہ صادر ہوا میں سفر اور اقامت کے مابین تذبذب کے لمحے گزار رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اگر نقشِ مدعا رسائی پا جائے اور میری خواہش پوری ہو جائے تو میں بے تامل خط لکھوں اور اس میں تمام باتوں کا جواب ہو۔

لیکن بازی گاہ خیال کا ہنگامہ درہم برہم ہو گیا اور بختِ رم خوردہ نے یاوری نہ کی۔ مقدمہ کی شروعات بڑی دل فریب تھی مگر درمیان میں پہنچ کر وہ صورت باقی

نہ رہی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اواخر نادیدہ رہ گیا۔ ورنہ معلوم نہیں کیا کیا دیکھنا پڑتا۔ خلاصہ گفتگو یہ کہ اعیانِ سلطنت لکھنؤ میرے ساتھ بڑی گرم جوشی سے پیش آئے اور جو کچھ حصول ملازمت کے باب میں قرار پایا وہ خویشتن داری کے اصول کے خلاف اور شیوہ اخوان پرستی کے تئیں باعثِ ننگ تھا اس اجمال کی تفصیل اور اس ابہام کی توضیح زبانی بیان کی جا سکتی ہے اور وفور بے ربطی کے باعث اس کو دام تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ سخن کوتاہ جو کچھ اس شہر میں اس سلطان صورت امیر کے بارہ میں سننے میں آتا تھا حق یہ ہے کہ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔

ابتدائے کار میں جس شخص کو اپنی مقصد برآری کے لیے اس نے کارگزار تصور کیا اس سے چپک گیا۔ لاجرم ایک دو آدمی اس سے متمتع ہوئے اور اب کہ اپنی دولت کے استحکام کی حرص سے اس کی خاطر جمع ہے وہ روپیہ جوڑنے میں لگا ہوا ہے لکھنؤ کے تمام قدیم خاندان اس بے رحم کی بیداد کی وجہ سے سیلاب بلا کی نذر ہو گئے اور اس شہر کے ناز پروردہ اب ادھر ادھر دوسرے شہروں میں دھکے کھاتے پھر رہے ہیں اور وہ خود اپنی طبیعت کے اسراف بے جا سے پشیمان اور اس شیوہ پستی سے دل تنگ اور برگشتہ خاطر ہے۔

مختصر یہ کہ بیداد گری کا بازار گرم ہے۔ مہاجن، ساہوکار اور تاجر خفیہ خفیہ یہاں سے اپنا زر و مال کانپور منتقل کر رہے ہیں کہ اس کے رویہ سے مطمئن نہیں ہیں۔ جو تھا وہ بھاگ گیا اور جو ہے وہ بھاگنے کی فکر میں ہے۔ جب اس دیار کا یہ حال ہے تو یہی بہتر ہے کہ اسے چھوڑ کر میں اپنا حال بیان کروں۔ ذی قعدہ کی ۲۵ تاریخ کو میں جمعہ کے دن اس ستم آباد سے باہر نکلا اور ۲۹ تاریخ کو دارالسرور کانپور پہنچا دو تین مقامات سے ہوتا ہوا بالآخر باندا پہنچ جاؤں گا اور وہاں چند روز آرام کر کے اگر خدا نے چاہا اور مرگ نے امان دی تو میں عازم کلکتہ ہو جاؤں گا۔ میں عالم عالم آوارگی کے ساتھ آمادہ سفر اور اپنی آبلہ پائی کے ساتھ ہوائے آتش میں گرم رفتار ہوں۔ اگر میرے مدعا کے مطابق کام ہو جائے تو میرے عزم و ارادے کا کیا کہنا اور اگر میرا

ہاتھ دامنِ مقصود تک نہ پہنچے تو میں کہاں ایامِ شادمانی، کام دلی اور جمعیت خاطر خدا کرے ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں۔

ایضاً

[۱۳]

رائے صاحب مشفق و مہربان۔ آوارہ خراموں کے غم خوار اور درماندہ دلوں کے یار وفادار۔ سلامت رہیئے۔ کیا لکھوں کہ لکھنے کے لائق باتوں سے تو میں بالکل تہی دست ہو گیا ہوں۔ اگر داخلیات کی بات کی جائے تو دہی معدہ اور آنتوں کی تکلیف کا سلسلہ ہے کہ برابر چل رہا ہے اسی کے ساتھ برودتِ جگر، حرارتِ مزاج اور ضعفِ قلب کو بھی اس میں شامل کیجیے۔

اور اگر خارجیات کی بات کی جائے تو وہ اس سے زیادہ نہیں۔

قطعہ

مغلوبِ سطوتِ غمِ دل، غالبِ حزیں
کاندر تنش، ز ضعف توان گفت، جاں نبود
گویند، زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است
مارا بدیں گیاہِ ضعیف، ایں گماں نبود

[غمِ دل کی سطوت سے مغلوب، غالبِ حزیں جس کے تن میں ضعف کے باعث یہ کہا جا سکتا ہے کہ جان ہی نہیں تھی، کہتے ہیں کہ وہ زندہ بنارس تک پہنچ گیا ہمیں اس گیاہِ ضعیف کے بارے میں ہرگز یہ گمان نہ تھا]

سخن مختصر ماضی معلوم ہے اور مستقبل مجہول کیا لکھا جائے اور کیا کہا جائے۔ خدا کرے کہ آئندہ جو صورت پیش آئے وہ لائق تحریر ہو کہ میں وہ حال، دوستان دوستی پیشہ و یارانِ دشمنی اندیشہ کو لکھ کر بھیجوں۔ تاکہ وہ خوش ہوں اور ان کا دل غصّہ کی کڑھن میں مبتلا ہو جائے تین خط اس کے ساتھ ملفوف ہیں۔ ایک بنام مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں، دوسرا مولوی فضلِ حق کی خدمت میں اور ایک غالب ناکام کے غم خانہ میں جو ویرانہ سے بدتر ہے اور اپنے اس مخلص کو ممنون اس کا

کریں۔ زیادہ   زائد۔

ایضاً

[۱۴]

رائے صاحب مشفق و مکرم ہزار در ہزار بے التفاتیوں کے مظہر، سلامت، میں اپنے وہم غلط کار سے شرمندہ ہوں اور اپنی "ناکسی" پر احساس ندامت کے ساتھ سر جھکائے بیٹھا ہوں،

بخدا جب بھی غور کرتا ہوں اس سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ آپ کے سوا میرے ارباب وطن میں اور کون ہے یار بار جس کا مجھے خیال آتا ہو۔ حضرت مستقبل میں مجھے آپ سے بہت سے کام ہیں لیکن "اوّل ساغرٗ و دردو" کی یہ صورت آخر کیا معنی رکھتی ہے۔

آپ جب ابتداءِ کار ہی میں خط کے جواب میں یہ طرز تغافل روا رکھتے ہیں تو بڑے بڑے کاموں کی انجام دہی کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ یا پھر آپ ہی فرمایئے جس سے — دوستی و مہربانی کی تمام توقعات کو دل سے محو کر کے جو کام ہیں ان کے واسطے کوئی دوسرا شخص تلاش کیا جائے اور اس کی کار برآری اس کے سپرد کی جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ بے خودی چھوڑیے اور بیکسوں کی دل جوئی کیجئے۔

کلکتہ پہنچتے ہی میں نے ایک خط لالہ سوہن لال کی معرفت روانہ کیا تھا اب نہیں کہہ سکتا کہ وہ خط آپ تک پہنچ گیا یا نہیں ہاں جو خط اس ملفوف میں ارسال کیا گیا تھا وہ تو مکتوب الیہ تک پہنچ گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا خط پہنچنے کے بعد گلدستۂ طاقِ نسیاں بن گیا ہو۔ اب یہ مکتوب لفافے کے بغیر میرے غم خانے کے پتہ پر جانے والے خط کے ساتھ ملفوف کیا جا رہا ہے، باقی نامہ نگار کے لیے ایسی کوئی بات نہیں جو لائق تحریر ہو۔

آپ سے یہ التماس ہے کہ تھوڑی سی زحمت برداشت کریں — کچھ وقت ضائع فرمایئں اور فخر الدولہ بہادر کی زندگی کے حالات جوان کے سانحۂ ارتحال کے بعد

وقوع پذیر ہوئے ہوں لکھ بھیجیں اور تحریر حالات میں حشو و زوائد سے بھی صرف نظر نہ کریں۔ جو کچھ معلوم ہو اور جو ہنوز معلوم نہ ہوا ہو اُسے معلوم کرنے کی سعی کریں۔

ریزیڈنسی کے دربار کا حال جدید و قدیم اہل کاروں کے نام اور مسند نشین میوات کے ساتھ نئے حاکم کے تعلقات کی نوعیت پر بھی روشنی ڈالیں کہ میں ان حالات کو جاننا اور ان پر نظر رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ خیال نہ فرمایئے کہ میں جناب سے کوئی قصہ کہانی سننا چاہتا ہوں اور بس۔ مقصد کچھ اور ہے اور اس میں جو نکتہ پیش نظر ہے اس کے باب میں استفسار ضروری ہے۔

استغاثہ کے خم و پیچ کے ضمن میں اس کی ضرورت ہے کہ میں دارالخلافہ دہلی میں اپنا کوئی وکیل مقرر کروں یہ زحمت آپ کو گوارا کرنا ہے اس معاملہ میں جو بات بھی ضمیر والا میں مضمر ہو، اُسے بے تکلف لکھ دیں۔

یہاں خط بھیجنے کے دو طریقے ہیں ایک یہ لالہ سوہن لال کے ذریعہ مرزا افضل بیگ کے پاس خط بھیج دیا جائے دوسرے یہ کہ بلا شرکت غیرے انگریزی ڈاک کے وسیلہ سے مکتوب ارسال کیا جائے نیز پتہ اس طور پر تحریر کریں۔ کلکتہ۔ قریب شملہ بازار۔ نزدیک تالاب گرد حویلی مرزا علی سوداگر، اسد اللہ خاں کو ملے۔

فقط

ایضاً

[۱۵]

یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں بھی رسم و رہِ عام کی پیروی کرنے والوں کی طرح اپنے دست و قلم کو نامہ نگاری سے آلودہ کرتا ہوں۔ حاشا ثم حاشا میں اس طرح کی دوریاں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس وقت رائے چھجمل کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں اور بہ ہر صورت ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

زیب النساء بیگم کا علاقہ سفارت مبارک ہو اور خدا کرے یہ صورت مستقبل میں آپ کی ترقیات کی ضامن ہو۔ اگر مشاہرہ کا حال بھی معلوم ہو جاتا تو اس کے مطابق

سپاس بجالاتا۔ جواہر سنگھ طول عمرہ کی شادی خانہ آبادی سے آپ فراغت پاگئے خوشا مسرت زہے شادمانی۔ یہ وہ موقع ہے کہ میں مبارکباد دوں اور گویائے تہنیت بھی رہوں ایزدِ پاک کہ عمروں کو بڑھاتا اور دولت کو فراوانی بخشتا ہے وہ ہمیں اتنی فرصت دے کہ میں اور آپ جواہر سنگھ کے بیٹوں کی شادی کتخدائی کی بزم میں رسومِ میزبانی ادا کر سکیں۔

ایک لطیفہ دل میں گزرا ہے اُسے سنئے اور سرسری نہ لیجئے چونکہ میری عدم موجودگی میں اس بزم کا انعقاد عمل میں آیا ہے اور تم مجھے اس کی شادمانیوں سے محروم رکھنا پسند نہ کرو گے۔ اس کے لیے کچھ روپیہ الگ سے اٹھا کر رکھ لو۔ جس سے میری دعوت کی جا سکے۔ اگر میں زندہ واپس دہلی پہنچ گیا تو یہ دعوتِ عیش میرا حصہ ہے۔ ورنہ تمہارا روپیہ تمہارے پاس رہ جائے گا۔ عنوانِ مکتوب پر کلمۂ نوّاب کو جزوِ اعظم قرار دینا (یعنی چہار حرف کو پایانِ اسم کے آخر میں درج کرنا کیا ضروری ہے۔ اس سگِ دنیا کو اسد اللہی سے شہرت دینا کیا کم ہے کہ نواب و میرزائی کو اس پر اضافہ کیا جائے۔

نیز یہ کہ تم نے لکھا ہے کہ فلاں شخص روشِ حکیمانہ رکھتا ہے اور دنیا کو کارآگہی کے ساتھ گزارتا ہے ان تمام اندوہ ناکیوں کے باوجود اس پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور عنانِ ضبط میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ بادرفتار گھوڑوں پر بیٹھنا اور گروہ در گروہ لوگوں کو اپنے سامنے دوڑانا اپنے بدن کو رنگا رنگ ملبوسات سے سجانا اور معدہ کو طرح طرح کے کھانوں سے پُر کرنا، اندازہ سے زیادہ شہوت رانی کرنا اور معصیت کی خاک اپنے سر پر بکھیرنا حکما کا کام نہیں اور اربابِ دانش و بینش یہ نہیں کرتے۔

دانشوروں کا کام تو آبادیوں سے دور دامنِ کوہ میں خلوت نشینی اختیار کرنا اور شش جہت سے اہلِ دنیا پر اپنے دروازے بند کرنا، جسم کو ریاضت سے گھٹانا اور جان کو عقل و دانائی سے فروغ بخشنا ہے جو شخص صاحب عقل و حکمت ہوگا اس کا کام تو یہ ہونا چاہیئے کہ وہ بے برگ و نوا ہوتے ہوئے گوناگوں حسرتوں کے شکنجے سے باہر آکر شادمانی و سرخوشی کی راہ پر گام زن ہو جائے ایسا کوئی شخص کہ آزادہ از

اور بالطبع کریم ہو۔ اس پر بھی اگر اس کے "ادعیہ منی" میں جگر سے آنے والے صالح خوں کے بجائے ریاح غلیظ بھری ہوئی ہیں تو وہ آزاد نہیں بندۂ ہوا و ہوس ہے۔

تھوڑا سا انتظار کرو تو یہ سب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ سونے کے سکوں سے بھری تھیلیوں پر مہریں لگانے والے نقصانِ زر و مال پر حسرت کے ساتھ کفِ افسوس ملتے یا گریہ وزاری کرتے نظر آتے ہیں، یہ کہ اس نے فلاں شخص کو اپنی محفل سے نکال دیا ہے یہ بالکل خلافِ مصلحت ہے اور جو کچھ کیا وہ بے وقوفی اور ناسمجھی۔ اس لیے کہ اگر اسے عقل ہوتی اور وہ بات کو سمجھتا تو جن لوگوں کو اس نے اپنی محفل سے نکالا ہے نہ نکالتا، ان سے کام لیتا اور جن افراد کو اُس نے رکھا ہے اور انجمن میں جگہ دی ہے، اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیتا اور گردِ دامن کی طرح جھاڑ دیتا ہرگز ہرگز ان کے پیچھے نہ دوڑتا اس نے کودکی و بے حاصلی کے مصداق کام کیا۔

ایامِ شاہزادگی و ولی عہدی میں ان سے دل لگایا اور اس خیرہ سری کے ساتھ ساغرِ دل خالی کیا اور ان کے دام میں اس اندھے پن کے ساتھ پھنس گیا، یہ نہ عقل کے فتوے کے مطابق ہے نہ مآل اندیشی کے فرمان سے اس کا کوئی واسطہ، تم حکیم کیسے کہتے ہو اور کرم پیشہ کہہ کر آخر کیسے پکارتے ہو؟ اپنی حماقت کو نہ جاننا اور مجھ ایسے پژمردہ دل اور افسردہ خاطر کو یاد کرنا بلکہ یاد پر قناعت نہ کرتے ہوئے بے پردہ اُس شیطان صفت کے سامنے بندے کو پکارنا کون سا آئینِ دیدہ وری ہے اور کونسا شیوۂ عقل و دانش۔

چونکہ اس باب میں بہت باتیں ہیں اس لیے دعا پر ختم سخن کرتا ہوں۔ یزدانِ پاک تمہاری آنکھوں کو گنجِ بصیرت اور تمہارے دل کو دانش سود مند عطا فرمائے۔

مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا

[۱۶]

از جگر تشنہ بدریا سرود — وز تن بے جاں بہ مسیحا درود
از شب دیجور بہ نیّر سلام — وز لبِ مخمور بدریا پیام
از دلِ افگار بہ مرہم سپاس — وز منِ رہ جوئے بہ خضر التماس

[جگر تشنۂ آب کی طرف سے دریا کے واسطے نغمۂ شوق اور تن بے جاں کی جانب سے مسیحا کے لیے درود، شب تاریک کی طرف سے آفتاب عالم تاب کے لیے نذرانۂ نیاز اور لب مخمور کی طرف سے جام صہبا کے لیے والہانہ پیام۔ زخمِ دل کی جانب سے مرہم کے واسطے سپاس اور مجھ طلب منزل میں بھٹکنے والے کی طرف سے عرض التماس۔]

دو ماہ پر دس دن اور گزر گئے سواد نامہ چشم انتظار کے لیے سرمۂ بینش نہیں بنا۔ ماہِ ذی الحجہ کی چاند کو لکھا ہوا نامۂ عرض داشت اور ماہِ مذکور کی آٹھ تاریخ کو تحریر کردہ عریضہ جو مخدومی مولوی سید ولایت حسین خاں کے خط کے ساتھ لپیٹ کر روانۂ خدمت کیا گیا تھا کیسے کہوں کہ وہ آپ تک نہیں پہنچا اور کیوں کر سوچوں کہ وہ تلف ہوگیا اور نظرِ کیمیا اثر سے نہیں گزرا۔ کاش میں ترانۂ تغافل کو حضرت قبلہ گاہی کے دامنِ التفات سے باندھ سکتا۔ تاکہ میرا دل پراگندگی سے نجات پا جاتا۔

ایک دن کثرتِ اضطراب و بے چینی کے باعث اخی محترم مولوی سید ولایت حسین کی خدمت میں پہنچ کر میں نے آپ کے خط آنے کا احوال دریافت کیا تو پتہ چلا کہ آں مخدوم بھی مجھ نیاز مند کی طرح آپ کے خط کی راہ دیکھ رہے ہیں اگرچہ دردِ نایافت کی دوا میسّر نہ آئی مگر خدا کا شکر بجالایا کہ اس نے مجھے آتش رشک میں جلنے سے بچا لیا۔

سخن کوتاہ جو کچھ ادھر ادھر سے معلوم ہوا تھا وہ پہلے دو عریضوں میں اس اجمال کے ساتھ لکھ چکا ہوں جسے تفصیلات نے بڑھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں معروضے چشم جہاں آرا سے گزرے ہوں گے۔

تازہ تر بات یہ کہ میری عرض داشت اجلاس کونسل میں گزرانی گئی۔ حکم ہوا کہ

قاعدہ کے مطابق اسے پہلے ریذیڈنٹ دہلی کے جناب میں پیش ہونا چاہیئے۔ میں نے کہا میرے پاس نہ زادِ سفر ہے نہ مراجعت کی قوت، تو حکم ہوا کہ تم خود یہیں ٹھہرو اور اپنا مقدمہ وکالتاً ریزیڈینسی دہلی میں پیش کرو۔

لاجرم میں نے اپنے وطن کے احباب میں سے ایک دوست کے پاس خط بھیجا، اور ان سے اعانت چاہی۔ انھوں نے بیکس نوازی کی اور وہ خود کارفرما بن گئے۔ میری طرف سے وکیل مقرر کیا اور مجھے لکھا میں نے وکالت نامہ لکھ کر وکیل کے نام بھیج دیا ہے۔ اور ہر طرح کے جو کاغذ بھیجنے تھے ان کو اس وکالت نامہ کا حصہ بنا دیا۔ اس کے ساتھ اُس دوست کے نام خط بھی اس میں ملفوف کر کے دہلی بھیج دیا۔ یہ دوست جو مجھ پر مجھ سے بھی زیادہ مہربان ہیں اور میرے کام کو اپنے کام سے بڑھ کر سمجھتے ہیں

تا در میان خواستۂ کردگار چیست اللہ بس ما سوا ہوس

ایضاً

[۱۷]

قبلۂ جان و دل سلامت، آداب و کورنش کی بجا آوری کے بعد عرض حال یہ ہے کہ بخار اور دردِ سر ـــ جو باندا میں ساتھ تھا اب اس "رہ آورد" کا کوئی نشان باقی نہیں، اگر کمزوری کا کچھ اثر باقی بھی ہے تو فکرمندی کی کوئی بات نہیں کہ یہ وہ رفیقِ سفر ہے جو شروع ہی سے ہمراہی پر کمر بستہ ہے اس کی حق گزاری کا رشتہ بھی قوی ہے اور اس کی ہمسائیگی و وفاداری بھی میرے لیے طبیعتِ ثانیہ کا درجہ رکھتی ہے۔

غرض کہ میں مودہا سے نکلا اور ایک بیل تانگہ جس کو یہاں "لڑھیا" کہتے ہیں بار کشی کے لیے کرایہ پر لیا چونکہ وہ مجھ سے بھی زیادہ ضعیف الخلقت تھا۔ آہستہ خرام بلکہ محزام، دس بارہ کوس بھی راہ طے نہ کر سکا اور مودہا سے چلہ تارہ تک اس کا پہنچنا مشکل ہو گیا۔ چار رات تک ایک گاؤں میں رُکنا پڑا۔ سہ شنبہ، آخر شب میں روانہ ہوا اور میں خود دو پہر دن چڑھے چلہ تارا کی ایک کارواں سرائے میں پہنچا اور یہ پیچ محزام،

جب تک ایک پہر رات نہ گزر گئی مجھ تک نہ پہنچ سکا۔

اسی وقت میں نے ایک خطِ رات کے سوادِ ظلمت میں لکھا کہ ابھی تک ایک پہر رات نہ گزری تھی، ملازموں نے چراغ بھی روشن نہ کیے تھے۔ چونکہ مرزا مغل صاحب نے باندہ میں فرمایا تھا کہ مولوی صاحب کو ارسال کیا جانے والا خط تھا نہ دار چلّہ تارا کو سپرد کیا جا سکتا ہے کہ وہ پہنچا دیں گے۔ اتفاقاً آخرِ روز بلکہ یہ کہیے کہ اوّلِ شب کہ میں اس "لڑھے" [گردونکے نیز راستے میں پیچھے رہ جانے والے لوگوں کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ ناگاہ تھانیدار کارواں سرائے میں پہنچا اور اس نے ادھر ادھر ٹہلنا شروع کیا میں نے ارسالِ خط کے لیے اس سے اعانت چاہی۔

اگرچہ اس نے قبول کر لیا مگر اس سفیہانہ انداز کے ساتھ کہ جس کے مقابلے میں نہ قبول کرنا زیادہ اچھا لگتا۔ چنانچہ طبیعت نے ابا کیا اور اسے مکتوب کا دیا جانا گوارا نہ ہوا' ایک مجہول الاحوال مسافر نے جب حضرتِ والا کا احوال مجھ سے سُنا تو بڑی انکساری کے ساتھ خط طلب کیا۔ وہی چند سطریں کہ ارتجالاً اس تاریکی میں لکھی تھیں اس کے سپرد کیں۔

امید کہ یہ نیاز نامہ نظر سے گزرا ہو گا لیکن اگر اس عبودیت نامہ کے پہنچنے کا حال بھی اس بیل تانگے کے سفر جیسا ہے تو پھر یہ میرے ورودِ کلکتہ سے پیشتر آپ تک پہنچنے سے رہا کہ اتنے کم عرصہ میں چلّہ تارا سے باندہ تک سفر نہیں کیا جا سکتا۔' واللہ علیٰ کلِّ شَیٍٔ قدیر۔

خلاصۂ تحریر یہ کہ گردونِ دوں کی بیدادگری سے تنگ آکر میں نے خود کو دریا میں ڈال دیا۔ یعنی اس مقام سے میں نے کشتی کرایہ پر لی اور مردم و سامانِ مردم سب اس میں بھر کر بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا اور سفینہ کو رودِ جمنا کے سپرد کر دیا۔

منظورِ خاطر یہ ہے کہ الٰہ آباد پہنچ جاؤں اور جو توقف میں بنارس میں کرنا چاہتا ہوں' وہ یہیں کر لوں چند روز یہاں آرام کر کے اور سامانِ سفر بہم پہنچا کر یہاں سے آگے کا سفر اختیار کروں اور اس کے بعد مرشد آباد بنگالہ کے ماسوا اور کہیں"

نہ ٹھہروں۔
سفرِ دریا کا حال دو تین روز کے اندر اندر معلوم ہو جائے گا۔ کشتی بان کہتے ہیں کہ تین دن کے عرصے میں الٰہ آباد پہنچ جائیں گے۔ اب دیکھنا ہے کہ ہوتا کیا ہے۔
آج چہار شنبہ ہے اور دو پہر دن گزر چکا ہے میں کشتی میں بیٹھا ہوں اور ناخدا سے نہیں خدا سے لو لگائے ہوئے ہوں۔ زیادہ حدِ ادب۔

ایضاً

[۱۸]

قبلہ و کعبۂ دو جہاں جناب مولوی صاحب (مدظلہ العالی) گزارش آداب و تسلیم کے بعد عرض خدمت ہے الحمدللہ کہ فیوض و برکات سے بھرا ہوا سایہ ہنوز میری مشت خاک پر پھیلا ہوا ہے۔ رقعۂ نوازش سے آراستہ عطوفت نامہ نے اپنے شرفِ ورود سے میرے سر کو سپہر بریں تک پہنچایا اور یاد آوری کی مسرتوں نے میری کفِ خاک کو بہشتِ شادمانی بنا دیا ہے۔ اس کے لیے میرے ہر بُنِ مو سے زبان کی طرح کلماتِ شکر موج زن ہیں لیکن اتنا کہہ دینے سے یہ داستان ختم نہیں ہو جاتی۔
آج کہ جمعہ کا دن اور ایک جماعت کے قول کے مطابق ماہِ رواں کی نو (۹) تاریخ ہے اور ایک دوسرے گروہ کے حساب سے دس (۱۰)، میں رختِ سفر باندھ رہا ہوں۔ اگر رات خیریت سے گزر گئی اور میرا وجودِ موہوم اپنی عدمیت اصلی کی طرف رجوع نہیں کرتا تو کل کہ شنبہ کا دن ہے بنارس سے روانہ ہو جاؤں گا۔
مخفی نہ رہے کہ ناخدایان خدا ناشناس نے بنارس میں کشتی کے سلسلہ میں بد معاملگی کی۔ میں جس کے پاس بھی گیا اس نے کلکتہ تک سو روپیہ کرایہ طلب کیا اور پٹنہ تک بیس روپیہ سے زیادہ مانگا اب یہی نظر آتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر اس بقعۂ صحرا تک راہ طے کروں گا لیکن کشتی کی خواہش ابھی میرے دل سے نہیں نکلی پٹنہ جا کر پھر جستجو کروں گا جو کچھ کہ میں سپاسِ محبت اور شکر لطف

وعنایت کے طور پر کہتا ہوں وہ میری ہرزہ سرائی کے سوا اور کیا ہے۔

یزداں پاک آپ کو سلامت رکھے مجھ ایسے ایک شخص کے لیے (پہلے سے آپ جس سے واقف بھی نہ تھے جو نا کسی میں کوئی قرینہ رکھتا ہے اور نہ بے کسی میں اپنا کوئی ثانی) آپ نے فالعتاً للہ جو لطف بے نہایت روا رکھا اور اب بھی جس طرح آپ عنایت فرما ہوتے ہیں، یزداں پاک آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے زیادہ حد ادب۔

ایضاً
[۱۹]

مولوی صاحب قبلہ وکعبۂ شاہین۔ یزداں پاک آپ کے سایۂ عاطفت کو قائم رکھے زمانہ بیت گیا کہ میرا نفس وجود اس قبلۂ خدا پرستاں کی خاک بوسی کی خواہش میں پرکالۂ آتش بنا ہوا ہے۔ افسوس کہ میرے اور اُس آب رواں کے مابین، جو آتشِ شوق کی ان شعلہ خیزیوں کو فرو کرسکے۔ سات سمندروں کے فاصلے حائل ہیں اور میں اس سنگِ آستاں سے جس کو عبودیت کا نشان نماز کہنا چاہیے کعبہ کی سی دوری پر ہوں۔

سخن مختصر نامۂ عطوفت نے بنارس کی خاک نشینی کے دوران چشم بخت کو نور اور بختِ چشم کو فرخی و فیروزی سے نوازا۔ اس کا جواب تحریر کرنے کی سعادت کو میں نے اوقات فرصت کے مغتنمات میں شمار کیا اور خدام ذوی الاحترام کی خدمت میں ایک ورق لکھ کر ارسال کردیا ــــ اس وقت میں خشکی کے راستے عظیم آباد پہنچنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

غرض کہ بخت کی یاوری اور انفاسِ قدسی کی برکت سے گرد باد کی طرح دوشِ ہوا پر، پرواز کرتے اور خار خارِ راہ سے فریاد کناں گزرتے ہوئے جیسے کوئی دمِ تیغ کو اپنی رہ گزر بنائے، کبھی جاڑوں کی ٹھنڈی ہواؤں میں راتوں کو ٹھٹھرتے اور زمانے کے گوناگوں ستم سہتے ہوئے۔ بروز سہ شنبہ چہارم ماہِ شعبان کو میں وارد

کلکتہ ہوا۔

میں ان ایزدی بخشایشوں پر ناز کرتا ہوں کہ اس اجنبی شہر پہنچ کر مجھے ایک ایسا گھر مل گیا جس میں ہر طرح کا آرام و آشایش ہے بیرونی حصّہ میں آزادوں کے فراغِ خاطر جیسی فضا اور اندرونی حصّہ میں دنیا طلبوں کے دہانے جیسا بیت الخلا۔ اسی کے ساتھ صحن خانے کے ایک گوشہ میں میٹھے پانی کا کنواں اور سقف و بام کی سمت اہلِ تنعّم کے مزاج کے مطابق ایک آرام گاہ، یہ مکان کسی خاص جستجو اور زحمت گفتگو کے بغیر دس روپے ماہانہ کرایے پر مل گیا اور اس مسافر کی تکیہ گاہ اور منزلِ راحت قرار پایا۔

دو روز میں نے آرام کیا کہ سفر کی تکان دور ہو جائے۔ بعد ازاں میں نے منشور لامع النور کو چراغِ راہ مدّعا بنایا اور کشتی میں سوار ہو کر ہگلی بندر کا رخ کیا۔ نواب علی اکبر خاں طبا طبائی سے لطف ملاقات کے باب میں اگر یہ کہوں کہ مجھے اپنی خوش بختی پر تعجب ہوا تو بے جا نہ ہوگا اور اس کا اظہار کروں کہ مجھے خود اپنے اوپر رشک آیا تو یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔

خدا کی قسم جس نے عقل کو پیدا کیا اور صاحبِ خرد کو برگزیدہ بنایا کہ حوصلہ مندی اور گراں مایگی میں ایسا بلند مرتبہ کوئی انسان احاطۂ بنگال میں نہ ہوگا۔ یارب یہ گوہر گرامی کس معدن سے نکلا ہے اور یہ بیش بہا جوہر کس دکان کی متاع ہے چونکہ پہلی ملاقات تھی بنا بریں میں نے اپنے بارہ میں چارہ گری و درماں طلبی کی راہ سے کوئی بات کیے بغیر کہ ان کا دردِ سر ہوتی دو تین ساعت وہاں بیٹھ کر اپنے غم کدہ کی طرف واپس چلا آیا۔

افسوس کی بات ہے کہ ان دنوں نواب صاحب اور ہگلی بندر کے حکام کے مابین امام باڑہ سے متعلق وقف کی زمین پر مقدمہ چل رہا ہے اور موصوف اپنے اس معاملہ میں کھوئے ہوئے ہیں خدا کارساز ہے۔

فرد ہمہ را ماتمی حسرتِ دنیا دیدم
چوں بعشرت کدہ گبر و مسلماں رفتم

میں نے جب مجوسیوں اور مسلمانوں کے عشرت کدوں کا رُخ کیا تو سب کو حسرت دنیا کا ماتم دار پایا۔ زمانہ آپ کا تابعدار اور وقت فرماں پذیر رہے۔ فقط

ایضاً
[۲۰]

قبلۂ خدا پرستاں و کعبۂ حق پژوہاں سلامت۔

خاطرِ عاطر کو اپنی طرف توجہ دلانا اصولِ سعادت کے لوازم میں شمار کرتے ہوئے میں مراسمِ نیازمندی کی گزارش کو کامیابی کی تقریب خیال کرتا ہوں۔ اس مکتوب کا حامل کہ جس کا ہاتھ آجانا محض حسنِ اتفاق ہے اس معنی پر گواہی دے گا کہ میں کس عالم میں یہ خط تحریر کر رہا ہوں۔ بہر حال پنج شنبہ کا دن مُود ہا میں پہنچ کر یک شنبہ تک آرام کیا۔ دوشنبہ کو کوچ کا نقارہ بجایا اور ایک رات ایک گاؤں میں بسر کر کے سہ شنبہ کو چلہ تارا پہنچا۔ خدا کا شکر ہے کہ دردِ سر کی تکلیف باقی نہیں اور بخار نے بھی سوادِ طبع سے رختِ سفر باندھ لیا۔

خاطر جمع رہیں آج میں چلہ تارا پہنچوں گا اور کل صبح اگر زندگی باقی ہے تو فتح پور تک راستہ طے کیا جائے گا۔

زیادہ حدِ ادب

ایضاً
[۲۱]

قبلہ متمنداں امید گاہ بیکساں یہ اللہ پاک کی رحمتوں کے عجیب ترآثار میں سے ہے کہ آب و ہوائے کلکتہ مجھے پوری طرح موافق آگئی اور میں اس بقعۂ زمین میں اس سے کہیں زیادہ آرام و راحت سے ہوں جتنا کہ اپنے وطن میں ہوتا۔

غالبؔ دل بہر بہدہ نوائے دارد

ہر گوشۂ از دہر فضائے دارد
بر چید یبوست از دماغم یکسر
بنگالہ عجب آب وہوائے دارد

[غالب ہر پردۂ ساز میں ایک صدائے دلکشا چھپی ہوئی ہے، اور یہاں کے ہر ایک گوشہ میں ایک خاص فضا موجود ہے میرے دماغ سے یبوست (خشکی) کو یکسر ختم کردیا بنگال کی سرزمین عجیب آب و ہوا رکھتی ہے۔]

میں مسٹر فریز جوائنٹ سکرٹر سے ملنے گیا شائستہ طریقہ پر ملاقات ہوئی۔ استقبال مشایعت اور معانقہ کی رسم عمل میں آئی۔ عطر و پان سے تواضع کی۔ اس خوش صفات افسر کی طرز ملاقات سے میں بہت محظوظ ہوا اور اس نے مجھے تازہ دم اور توانا دل کردیا۔

مقدمہ کی عرض داشت جسے گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں پیش ہونا ہے، اس دادگاہ کے دستور کے مطابق صاحب سکرتر بہادر کو سپرد کی گئی اور اسی مجلت میں اُسے صاحب سکرتر بہادر نے پاٹن صاحب کے سپرد فرمادیا تاکہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرکے آگے بڑھائیں۔

یہاں ایک دوسرے امیر اندروا سٹرلنگ ہیں جو ایک بہت ہی صائب الرائے اور صاحب دانش و فرہنگ شخص ہیں یہ اس انتظام کی "قوس صعودی" میں نقطۂ ہدایت اور قوس نزولی میں نشان آخر ہیں۔ چونکہ یہ افسر صاحب علم و آگاہ شخص ہے بات کو سمجھنے اور لطف سخن تک پہنچنے میں بڑا ادراک رکھتا ہے میں نے اس کی شان میں پچاس اور پانچ بیت کا ایک قصیدہ لکھا ہے اور قصیدے کے آخر میں اپنا احوال بھی درج کیا ہے۔

کسی کی سعی سے نہیں محض حسن اتفاق سے اُن سے ملاقات شائستہ طریقہ اور برگزیدہ سطح پر ہوئی خاکساریوں کے اعتبار نے میری قدر کو بڑھا دیا اور میری امیدواریاں کامل قرار پائیں۔ قصیدے کا کچھ حصہ میں نے پڑھ کر سنایا محظوظ ہوا۔

میری دل جوئی کی اور مجھ سے مدد کا وعدہ کیا۔
مخفی نہ رہے کہ اسٹرلنگ چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہے اور منجملہ اجزائے کونسل ہیں شماری نقطۂ نظر سے سیمین فریزر بہادر اس افسر فرزانہ کا پیش دست وپیش کار ہے۔
جب دو تین مقدمہ کونسل میں پیش کیے جانے کے لیے مہیا ہو جاتے ہیں، سیمین فریزر بہادر عرض گزاروں کے اسم ورسم کے بارے میں نگارشہ تیار کر کے اس کے ساتھ لگاتے ہیں، نیز وہ عریضہ گزاروں کو ان کے معارضے کی مناسبت سے اپنے سامنے بلاتے ہیں۔ اور ان کے مقدمہ سے متعلق ضروری غور وفکر کے بعد قابل سماعت اور ناقابل سماعت شقوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے ناقابل سماعت حصہ دعویدار کو واپس لوٹا دیتے ہیں اور قابل سماعت معروضہ کو کونسل میں پیش کرتے ہیں۔
مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ میرا دادنامہ کونسل کی سماعت وپیشی کے لائق قرار پایا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس انجمن میں کیا فیصلہ ہوتا ہے اور حکام بالا کا فرمان مرے بارہ میں کیا رہتا ہے زیادہ حدِ ادب۔

ایضاً

[۲۴]

قبلہ گاہ مخلصاں جو کچھ عرض تسلیمات کے بعد معرضِ بیان میں لایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ والا نامہ نے ہما کی طرح میرے سر پر اپنا مبارک سایہ پھیلا دیا اور مجھے قلمروِ شادمانی کی بادشاہت بخش دی۔ نامۂ کرم کی تنم افشانی کی تعریف کن لفظوں میں کروں جس نے غبارِ اندیشہ کو فرو کیا اور میرے دل کو آسودگی کی جمعیت آباد میں پہنچا دیا۔
میں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ عبودیت نامہ کی تحریر کے وقت بسکہ ذوقِ حضوری میرے دل میں جوش مار رہا ہے اس لیے القاب وآداب کی کوئی گنجایش نہیں رہی۔ میں چاہتا ہوں کہ لکھنا بات کرنے سے کم نہ ہو اسی سبب اکثر یہ ہوتا ہے کہ نامہ خط پر کی طرح شروع ہو جاتا ہے نہ تقدیم وتاخیر کی بات ذہن میں رہتی ہے نہ گفتگو کے

اختصار و طول کے بارہ میں کچھ خیال آتا ہے نہ لب و لہجہ کے اتار چڑھاؤ سے متعلق کچھ سوچتا ہوں وادیٔ سخن کو مستانہ وار طے کرتا اور "شوقِ عناں گسیختہ" کے انداز سے سفر کرتا ہوں اور بس۔

میری خاطرِ ناعاطر میں صرف اتنی بات آتی ہے کہ جو کچھ میرا حال احوال ہے وہ قبلہ گاہی کی مشکل کشائی کرنے والی رائے پر مخفی نہ رہے۔ ابھی دو ہفتہ پہلے کی بات ہے کہ مولوی ولایت حسین صاحب اچانک دروازے سے اندر آئے اور گفتگوئے رخصت و وداع شروع کی کہ میں تو پابہ رکاب ہوں اور اپنے دورہ کے سلسلے میں عزمِ سفر رکھتا ہوں۔ اپنے غم کدہ کے دروازے تک میں برسمِ مشایعت ان کے ساتھ گیا اور ان کو خدا حافظ کہا۔

دیگر یہ کہ ابھی دہلی سے آنے والا خط کاشفِ حالات ہوا کہ میرے بھیجے ہوئے کاغذ وہاں پہنچ گئے اور میرے کارفرما کو مل گئے اور وکیل کو وکالت نامہ دیدیا گیا ابھی وکالت قوت سے فعل میں نہیں آئی تھی کہ روشن الدولہ لارڈ کول برک صاحب بہادر فرماں روائے دہلی بطریقِ دورہ اس شہر سے باہر چلے گئے۔ ہر آئنہ اب انتظار کرنا ہوگا اور اس کی وجہ سے مقدمے کی کارگزاری ملتوی رہے گی اب کیا کہوں کہ خواہ مخواہ یہ تاخیر درمیان میں آگئی۔

نیز اس دیار کے اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ولیم بیل صاحب جو کونسل کے اراکین میں سب سے بڑے ہیں اور اب سے پہلے نائب کونسل تھے وہ حال ہی میں ملک برما چلے گئے اور لارڈ ولیم بنٹنگ کہ گورنری کا طغریٰ ان کے نام کا نقش نگیں ہے بہ غرضِ سیر و شکار نادیہ پہنچ گئے جو کلکتہ سے جانب مشرق ایک شکارگاہ ہے۔ صاحبِ خلقِ عظیم مولوی محمد عبدالکریم میر منشی دفتر کدۂ فارسی چھ ماہ کی رخصت لے کر براہِ دریا لکھنؤ کے سفر پر روانہ ہوگئے ہیں۔ اس وقت تک عظیم آباد پہنچ چکے ہونگے۔

یہاں کے طرفہ واقعات میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ اس شہر کے نکتہ رس اور سخن ور افراد نے اس خاکسار کے ورود سے پہلے ہی ایک انجمن بنا رکھی ہے۔ ہر ماہ

انگریزی شمسی کے پہلے یک شنبہ یہ اہلِ قلم اور مدرسۂ کمپنی بہادر کے اُدبا اور اہلِ علم یہاں جمع ہوتے اور ہندی و فارسی غزلیں پڑھتے ہیں. اچانک ایک بلند پایہ شخص جو ہرات سے "بعہدۂ سفارت" یہاں وارد ہوئے تھے میرے اشعار کو سن کر بڑی بلند آہنگی کے ساتھ انھوں نے میری ستایش کی اور اس قلمرو کے نادرہ گویوں کے کلام پر زیرِ لب مسکراتے رہے۔

چونکہ طبیعتیں بالذّات خود نمائی پر فریفتہ ہوتی ہیں اس لیے انھوں نے میرے کلام پر اس داد و تحسین کو سن کر حسد کو کام فرمایا ـ اس انجمن کے سربرآوردہ افراد اور اس بزمِ سخن کے فرزانوں کی طرف سے میرے دو شعروں پر ناروا اعتراضات وارد کیے گئے اور اب انھیں شہرت دی جا رہی ہے اور میں نے جواب دہی کے لیے زبان نہیں کھولی لیکن یہاں کے دانشوروں سے وہ اپنے لایعنی اعتراضات کا جواب بالصواب پا رہے ہیں. مخدومی نواب علی اکبر خاں طباطبائی اور محترمی مولوی محمد حسن میرے انھیں کرم فرماؤں میں سے ہیں ۔

میں خود زانوئے خاموشی تہہ کیے بیٹھا ہوں. ہاں میں نے ان دو بزرگوں کی فرمایش پر ایک مثنوی لکھی ہے اور اپنی طرف سے عجز و انکسار ظاہر کرتے ہوئے ان اعتراضات کے جواب اپنی اس مثنوی کے اشعار میں دیے ہیں. یہ مثنوی ان صاحبانِ طبعِ عالی کو بہت پسند آئی. انشاء اللہ اس عریضے کے بعد جب دوسرا عریضہ روانۂ خدمت کروں گا تو اس کا ایک ورق ساتھ ہی لپٹا ہو گا۔

ایضاً

[۲۳]

حضرت قبلہ گاہی (مدظلہ العالی) کی خدمت میں کہ میرے ولی نعمت ہیں نیاز گزار ہوں سرِ عالی کے گرد رسمِ طواف اور قدمِ مبارک کی خاک پر اپنی جان نثار کرتا ہوں کیا عرض کروں اور کس پردۂ تحریر سے اس ذکر کو چھیڑوں. نہ یاد آوری کے لیے سپاس گزاری کا کوئی کنایہ نظر میں ہے اور نہ قدر افزائی کے لیے شکریہ کا کوئی انداز

کہ شایان شان ہو۔

پرسوں منشی عاشق علی خاں بہادر نے ایک خط مجھ تک پہنچایا ملفوف کھولا تو اس پردہ سے ایک نور سا چمکا۔ جب میں اس کی حقیقت تک پہنچ گیا تو معلوم ہوا کہ حضرتِ والا کی تحریر ہے کہ خاص ممدوح کو اس خاکسار دشتِ غبار کے اشعار کے سلسلے میں زیب رقم کی گئی تھی۔

چونکہ ملا زمان والا شان نے اس ننگ آفرینش کو لکھا تھا کہ ایک وقت معین کرکے مجھے مطلع کر کہ ہم ترے سرِعزت کو آسمان سے بلند تر کردیں اور اپنے ورود کی روشنی سے تیرے غم کدۂ تاریک کو بقعۂ نور بنادیں۔ میں نے جواب میں مودبانہ معذرت پیش کی اور دوسرے روز خود قدم بوسی کے لیے آستانۂ قدسی پر حاضر ہوا۔ جناب مخدوم عقیدۂ "وحدت الوجود" کے قابل ہیں اور صوفیا کے اس گروہ کے ذوق وشوق کے انداز پر شعر کہتے اور کلاہِ نمد پہنتے ہیں۔ میں کہ "شمع و چراغ انجمن" مولوی ولایت حسین کے شیوۂ اخلاق اور سپہر معنی شناسی کے منبر نواب علی اکبر خاں طباطبائی کے طرز اختلاط کا (شیدائی ہوں) قبلہ گاہی کے خدام والا احتشام کا احسان مرے دل وجان پر ہے۔

اِن دونوں بزرگوں کی صحبت سے ہر گونہ لطف و سعادت جو میں حاصل کرتا رہا ہوں اس کی وجہ "ھٰذا من برکۃ البرایکہ" (یہ سب بزرگوں کا فیض اور ان کی دعا کی برکت ہے۔) میری زبان پر ہے اب میری آبرومندی میں ایک نیا اضافہ ہوا حقیقت یہ ہے کہ وادیٔ خیال کی اس آوارگی کے بعد اگر میں آپ تک نہ پہنچتا تو میری خستگی کے لیے مرہم اور شکستہ جانی کے واسطے مومیائی کہاں سے میسر آتی۔ اگر سرِ رشتۂ انصاف میں اپنے ہاتھ سے نہ دوں تو میں یہ جانتا ہوں کہ میں ہرگز میر کرم علی کی سپاس گزاری کے عہدہ سے باہر نہیں آسکتا جنھوں نے خضرِ منزل بن کر آپ کے آستانۂ عالی تک میری رہنمائی فرمائی ایسی صورت خود ملازمان حضور کی مدح سرائی میں کیسے کرسکتا ہوں حاشا ثم حاشا کہ یہ ممکن نہیں ع خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

مخفی نہ رہے کہ یہ عریضہ میں نے ماہ شعبان کے چھٹے روز تحریر کیا اسی روز میر صفات علی خاں صاحب کے توسط سے لالہ کانجی مل کو بھیجدیا اب اللہ پاک لالہ صاحب کو توفیق دے کہ وہ اُسے اپنے خط میں (ملفوف) کر دیں اور اُسے آپ کی خدمت میں پہنچا دیں۔

بنام نواب علی اکبر خاں

[۲۴]

(متولی امام باڑہ ہگلی بندر)

قبلۂ خدا پرستاں، سلامت۔ جہاں ممدوح کی ذات تعریف سے مستغنی اور مدح نگار کی زبان میدان ستایش میں نارسا ہو۔ عرض بندگی میں مبالغہ ناروا اور شرح شوق میں "ابرام" بدنما۔ اب ایسا کیا لکھا جائے کہ خاموشی کا بھرم بھی رہ جائے اور کوتاہ قلمی کا داغ بھی صفحۂ قرطاس پر نہ آئے۔ بس یوں سمجھئے کہ یہ نیاز نامہ سلام روستائی اور حرف عرض کا نیم دائرہ کاسۂ گدائی ہے۔

میں ایک گونہ بندۂ شکم ہوں اور قدرے ناتواں اپنے دسترخوان کی آرایش بھی چاہتا ہوں اور اپنی روح کی آسایش بھی۔ خردمند جانتے ہیں کہ یہ دونوں خوبیاں آم میں موجود ہیں اور اہل کلکتہ کو معلوم ہے کہ ہگلی بندرگاہ آم کی قلم رو ہے۔ آم کو ہگلی سے وہی نسبت ہے جو پھول کو چمن سے، ایثار کو ذات والا سے اور سپاس گزاری کو اس نیاز مند سے۔

مرا شوقِ فراواں مجھ سے کہتا ہے کہ میں اس فصل کے ختم ہونے سے پہلے دو تین بار اپنے ولی نعمت کو ضرور یاد آؤں گا۔ اور مرا دل کہ خواہشات کا بندہ ہے فریاد کرتا ہے کہ ہرگز ہرگز میں اتنے سے خوش نہ ہونگا۔

گلو یم تشنہ، جان و دلم افسردہ اے ساقی
بدہ تو شینہ دار وئے کہ ہم آتش ہم آبستے

(میری روح پیاسی ہے اور میرا دل افسردہ اے ساقی مجھے وہ بادۂ ناب دے جو آگ بھی ہے اور پانی بھی۔)

خدا آپ کے نخل مراد کو بارور فرمائے۔ اس کے سایے کو دل و نگاہ کے لیے وجۂ راحت بنائے اور غالب ہوا خواہ کے سر پر ہمیشہ قایم رکھے۔

والسلام۔

ایضاً

[۲۵]

یہ نامہ سیاہ اسد اللہ جس نے رحمتِ خداوندی کی امید توڑ دی ہے اور جو اپنی اس دو روزہ زندگی میں "پندار پیدائی" کے باعث کبھی نہ ختم ہونے والی زحمت میں اسیر ہے۔ نواب ہمایوں القاب قبلۂ اہل دل و کعبۂ اربابِ نظر کے خدام والامقام کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اگر بزرگوں کی خوئے صبر و ضبط اور ان کی عالی حوصلگی پیش نظر نہ ہو تو بندگانِ کم خدمت کے لیے شرمساری کے باوصف روئے سخن کہاں اور عرض مدعا کا حوصلہ معلوم۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ دریا کی آلودگی قطرہ سے دھل سکتی ہے اور سورج خاک نجس کے تودوں پر اپنی تابانیاں بکھیرتا ہے۔ بزرگ اگر خوردوں سے خطا دیکھیں تو عذر و معذرت کیوں نہ قبول کریں تاکہ شرمندگی کا بوجھ ان کے دل سے اتر جائے افسوس کہ دلِ غم گرفتگی کے باعث صد جا گرہ در گرہ ہے اور نظر ہزار در ہزار اندیشہ کے ساتھ ہم دست جنگ۔!

میں رات کو دن سے اور دیدہ و دل کو ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھ سکتا اسی طرح نفس کو نالہ سے اور اشک کو نگاہ سے تہ امتیاز دیکھنا میرے بس میں نہیں۔ اب ایسا کیوں نہ ہو کہ اس تمام شورابہ کے ساتھ جو میرے مٹی کے پیالہ میں ہے ریزۂ الماس کی زہرناکیاں بڑھادی جائیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ برادر والا قدر ستودہ صفات نواب امین الدین خاں بہادر، ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ اس زمانہ میں کہ میرے دن میری راتوں سے زیادہ سیاہ ہیں، عازم کلکتہ ہوئے ہیں اور میں نقش قدم کی طرح اس خرابہ میں خاک نشین ہوں۔ اگر اس یگانۂ آفاق کے اندوہِ فراق کو لکھنے بیٹھ جاؤں تو ہزار دفتروں میں تمام نہ ہو۔

میرا شوق اس نوازش کا جگر تشنہ ہے کہ جب برادر والا قدر قربت میں جگہ پائیں

تو ان پر اس قدر نوازش ہوں کہ میرے لیے بھی کچھ نہ بچے۔ آپ ان کا درد دل سے طریق چارہ سازی کی نشان دہی فرمائیں، غم تنہائی سے ملول نہ ہونے دیں اور ایسی تدبیریں انھیں بتلائیں جو ان کے خاص معاملہ میں سودمند ہوں۔ غرض کہ اپنے حق میں جو میں نے آپ کا حسنِ سلوک دیکھا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ "بلکہ افزوں تر" میں ان کے واسطے چاہتا ہوں اور اس سفارش کے لیے اپنے اوپر احسان رکھ رہا ہوں۔ زیادہ عرض نیاز

بہ محمد حسن در تہنیت شادی کتخدائی پسرش

[۲۶]

غالب صاف مشرب کا دل دوسروں کی طرح بناوٹ سے آشنا اور بے تکلف نغمہ سرائی ۔ سے بیگانہ نہ ہے۔ اس کی زبان کو وہ دل دیا گیا ہے جو آزادگی کے سبب آرائش گفتار سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور اس کے دل کو وہ زبان بخشی گئی ہے جو سادگی کے باعث رنگ آمیزیوں کی تاب نہیں لاتی۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو میں جانتا ہوں اور میرا دل کہ اس چشم روشن میں کہ "پیش آوردہ دولت" اور "ساز پارۂ اقبال" ہے، کیا کیا جلوے نہ ہوتے۔ اقسام سخن کی کیا کیا رخ نمائیاں سامنے نہ آتیں۔

میں زمانہ کے در و دیوار کو جوش بہار کے رنگوں سے سجا دیتا اور کنار گیتی کو نیر اقبال کے فرِ فروغ سے منظر چراغاں بنا دیتا میں طرۂ حور اور بال پری سے تار و پود حاصل کرتا اور ایک آئین نو کے ساتھ اسے تیار کرتا اور فرش انبساط کو اس بزم ہمایوں میں بچھا دیتا اور اطراف بساط کو بہشت بریں کے گل و ثمر سے سجا دیتا ستارۂ زہرہ کو رامشگری اور مشتری کو مہمان نوازی کے فرائض سپرد کرتا۔

گاہ شبستان نظم میں آئین زیبائی کے رشک سے آبگینہ کے جگر میں ریشمی شعاعوں سے سوراخ کر دیتا اور گاہ میکدۂ ذوق کی نشاط آفرینوں سے محفل نثر کو رشک سایۂ تاک بنا دیتا اور بادہ پیمایان عیش کو تسنیم و کوثر کے جام لنڈھانے کے لیے صلائے عام

میری چشم خیال میں ہر گوشۂ دل کسی پری زاد معنی کی جلوہ گاہ بنا ہوا ہے کہ محو بال

جنبانی سے اس انجمن جمال کے گوشہ ہائے بساط سے جو گرد صاف کی گئی ہے وہ بھی آنکھوں کے لیے سرمۂ سلیمانی ہے۔

بنام ایزد، میں اس بزم شادی کتخدائی کی مسرت آفرینیوں پر نازاں ہوں جو دل سے گردِ ملال کر دھو ڈالتی ہے اور اس نامۂ بہشت ہنگامہ کی رونقوں کی تعریف کرتا ہوں (جو روح کو ہر لحظہ شادمانیوں کا نیا مژدہ سناتی ہیں)

اب یہ ظاہر ہوا کہ زہرا رامشگری خامہ سے کس بزم نشاط میں رقص فرمائی کے لیے اس قدر شوق رکھتی تھی اور ستارۂ مشتری نے متاعِ سعادت کس انجمن شوق میں صرف کرنے کے لیے مسلسل فراہم کی ہے۔ آئینہ کو کس روئے جمال کے مشاہدہ سے جلا بخشی جانے والی تھی اور آسمان گہر ہائے پروین کس کے سر پر نچھاور کرنے کی غرض سے بحفاظت جمع کرتا رہا۔

یہ کس لیے کہ آفتاب نے پتھروں سے لعل و یاقوت تیار کرنے کی نیت اتنا خونِ جگر کھایا اور اس کے سر میں کیا سودا سمایا تھا کہ ابر نیساں تابناک موتی پیدا کرنے کے لیے سالہا سال قطرہ باریاں کرتا رہا۔

یہ گمانِ اندیشۂ خیال کے پیرامون خاطر نہ رہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہی مجھے کہنا بھی ہے بلکہ بات تو فراوانیٔ ذوق کی ہے اور اس سے اس فکر روشن کی نشاندہی ہوتی ہے کہ سخنور کا خامہ طبعی ہے تاکہ دیدہ ور اس تک پہنچ جائیں۔ اور میرے مخدوم ہیں کہ اس گروہ قدسی کے چشم و چراغ ہیں بخوبی یہ سچائی منکشف ہو جائے کہ اندازۂ سخن کی نگہداری کہ آزادگی کے واسطے جزو ایمان ہے اور ادب کے واسطے وجہ زینت۔

اس تمام جوش و خروش کے باوجود کہ دل میں طوفان اٹھ رہا ہے زبان کو اذن گفتار نہ دینا کیا معنی رکھتا ہے اور لب خیر طلب کو بجز زمزمۂ دعا کے، کہ مقام بابِ تہنیت ہے اور دروازۂ خجستگی کی کلید، کسی دوسرے موضوع پر زمزمہ سرائی سے کیوں باز رکھا گیا۔

یزدان پاک اس شادی کتخدائی کو جاودانہ سازگاری و کامرانی ارزانی فرمائے اور

اسے آنے والی زندگی کی بے اندازہ خوشیوں اور نت نئی شادمانیوں کے واسطے خوش خبر بنا دے۔ برادر عالی قدر والا شان گرامی تراز جان تحفۂ آداب و سلام اور نذرانۂ خلوص و محبت پیش کرتے ہیں اور گزارشِ شیوۂ چشم روشن اور پیش کشِ مراسمِ تہنئت میں اس نامہ نگار کے ہم زبان ہیں۔

ایضاً

[۲۷]

میرے امید گاہ۔ رات کا وقت ہے اور میں اپنے افسردہ دل کے ساتھ ایک ایسے چراغ کے سامنے بیٹھا ہوں جس کی مدھم روشنی حجرہ سے نکل کر دالان تک نہیں آتی۔ یہ خط لکھنے کی بات پیش نہاد خاطر ہے۔ اپنی اس کم قسمتی کا بھی احسان مند ہوں کہ حضرت والا' مرے بخت کی نارسائی اور رائے کی سستی کے باوجود' مجھے نظر میں رکھتے ہیں بدیں وجہ' اگر میں لطف و کرم کا مستحق نہ سہی ترحم کے استحقاق سے تو مجھے محروم نہیں کیا جاسکتا نیکوں کا دل بدوں اور خردمندوں کا دل بے دانشوں کے واسطے دردمند تو ہوتا ہے۔ تونگروں کا تہی دستوں پر رحم کرنا اور تندرستوں کا بیماروں کا خدمت گزار ہونا اسی زمرہ میں آتا ہے اتنی بات اور بے پردہ طریقہ سے کہنا اور تحریر کو تقریر بنا دینا چاہتا ہوں۔ اس سے پیشتر میں نے ایک خط بنام خانِ والاشان سبحان علی خاں اور ایک عرض داشت بحضور والائے وزارت پناہ مع بادشاہ کے ایک قصیدے کے لکھ کر اور ایک دوسرے کے ساتھ لپیٹ کر اس مجموعۂ اوراق کو صاحب والا مناقب راجہ صاحب رام وکیل شاہ اودھ کی خدمت میں روانہ کر دیا اور یہ درخواست کی کہ آرزو سے محال کا یہ خاکہ خان صاحب والا مقام کی نظر کیمیا اثر سے گزرے اور بعد ازاں اسے سلطنت کے دستورِ اعظم کے حضور میں پیش کر دیا جائے۔

اور یہ سب اس امید کے ساتھ کیا ہے کہ یہ قصیدہ حضور سلطانی میں پڑھا جائے اور قصیدہ نگار کو اس کے صلہ میں دسترخوانِ شاہی سے آذوقۂ پرورش حاصل ہو۔ آج تک کہ پورے چالیس دن بیت گئے اس نیرنگ و افسوں کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا۔ لاجرم

اس گدائے نابینا کی طرح کہ کسی عصاکش کی مدد کے بغیر راستہ نہیں چل سکتا میں اُمید و بیم اور ردّ و قبول کی کش مکش میں گھرا ہوا ہوں۔ آج کہ چہار شنبہ کی رات اور آتش پرستوں کے مہینہ کی تیرہ تاریخ ہو گئی اور وہ رات ہے جسے ستارہ شناسوں کی رو سے شب چہار شنبہ اور شریعت کی زبان میں شب پنج شنبہ کا نام دیا جاتا ہے۔

ذوقِ آرزو طلبی نے مجھے اس طرح بیتاب کیا کہ صبح تک سکون نصیب نہ ہوا میں نے رات ہی میں خط لکھا اور رات ہی کو اسے راجہ صاحب رام کو بھیج دیا امید کہ راجہ صاحب کا آدمی جب اس التماس نامہ کو ان تحریروں کے ساتھ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے راجہ صاحب کے ملازمان تک پہنچا دے گا تو بحرِ کرم جوش میں آئے گا اور ان کی نگاہ لطف غالب نوازی پر آمادہ ہو گی۔

اس کے ماسوا میں کچھ نہیں جانتا اور جانتا ہوں تو کہوں گا نہیں کہ مجھے اس خط کے جواب سے نوازا جائے اور یہ بھی میری بے حوصلگی اور دراز نفسی کے باعث ہے ورنہ مجھے یقین ہے کہ آپ کے قلم کی جنبش عقدۂ راز کے کھولنے میں دریغ روا نہ رکھے گی اور آپ کی جانب سے ایسا جواب آئے گا کہ دل کے لیے نویدِ سکون مژدۂ راحت ہو۔ والسلام بالوف الاحترام ۔

بنام منشی التفات حسین خاں

[۲۸]

اسد اللہ آشفتہ سر، آشفتہ رائے جو کہنے اور لکھنے میں امتیاز نہیں کرتا اپنے مخدوم و معظم اور مطاع و مکرم کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔

کوئی ایسا ہنر کوئی ایسا کمال جو بلند نگاہوں کے التفات کا سبب ہو مجھ میں

کہاں اور وہ حق خدمت جسے "دریوزۂ عزت" کی دست آویز بنایا جا سکے میرا مقدور نہیں سادہ دلی پر مجھے سزاوار لطف قرار دیں۔

اب میں رشتۂ فکر سے گرہ کھولتا ہوں اور اپنی بات زبانِ وضاحت سے کہتا ہوں۔ فرماں روائے شہر سے مجھے ایک کام آپڑا ہے کہ جس کے بارے میں یہ فرماں روا اُس سے مس نہیں ہوتا اور سوال کرنے والے کے درودل تک نہیں پہنچتا۔ جب ایک آدمی یکہ و تنہا اتنے بہت سے کام اپنے ذمہ لے لیتا ہے اور بغیر کسی دوسرے کی مدد کے دنیا جہان کی کار برآری کی سعی کرتا ہے تو یہی افراتفری رہتی ہے۔

سخن مختصر اس عرض مدعا میں

میرا روئے سخن حضرت والا کی طرف ہے کہ ذرا اس اندوہ نامۂ بے اثر کے ورق پر جو اس داور دادرس و نام آور کے نام بھیجا گیا ہے ایک نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ بنا کوئی قیمت ادا کئے میں اس متاعِ شفقت و رحمت کا خریدار بننا چاہتا ہوں کہ بحر و کان یا خشک و ترکی دولت بھی جس کے بیعانہ کے لیے کافی نہیں آخر کون سی ایسی روش و تدبیر ہو جس سے طالب اپنے مطلوب کو پہنچ جائے۔

میر امام علی جو اس نامہ کے ساتھ خدمتِ والا میں پہنچ رہے ہیں اس بات پر مامور کیے گئے ہیں کہ اگر منشی صاحب ارشاد فرمائیں تو حاکمِ شہر کے نام ارسال کیے گئے عرض نامہ کو وہ ملازمان والا کے سپرد کر دیں اور اگر یہ طریقہ کچہری کے دستور کے مطابق نہ ہو تو میر امام علی سے کہہ دیا جائے کہ وہ کل دوپہر کے وقت دارالانشا میں پہنچ کر جمع دار کے وسیلے سے یہ عریضہ حاکم مذکور تک پہنچا دیں۔

بارے اس التماس کا شرف قبول پانا اور میری نجات کی کوئی صورت خدام عالی کی چارہ سازی و غمخواری پر موقوف ہے ورنہ میں جانتا ہوں کہ مرسل الیہ کس قدر دیر فہم اور نارسا ہے۔

والاکرام

بنام مولوی نورالحسن

[۲۹]

فرد
جان بر سرِ مکتوبِ تو از شوقِ فشاندن
از عہدۂ تحریرِ جوابم بدر آورد

(میں نے تیرے سرِ مکتوب پر وفورِ شوق کے باعث اپنی جان نچھاور کر دی اور تو جواب تحریر کرنے کی ذمہ داری سے آزاد ہو گیا۔)

میں نہیں جانتا کہ عید کس آرزو کا نام ہے اور نوروز کس عالمِ رنگ و بو کو کہتے ہیں۔ میکدۂ سخن کی کلید از سرِ نو جنبش میں ہے جس سے شیرۂ خانہ روحانی کو کشایش تازہ میسر آگئی ہے۔ شوقِ تماشا کی سرگرمیوں نے مجھے اس طرح دل کو آمادۂ نشاط کر دیا کہ جذبۂ مسرت کے باعث سر اور زانو کی ہم آمیزی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ آنکھیں سوادِ نامۂ گرامی کو دیکھ رہی ہیں کہ جو خطِ سرمہ کی طرح اہتزاز آمیز ہے۔ ادائے نگارش کی شرح کیسے کی جائے کہ لب شیرینیٔ سخن کے باعث ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے ہیں۔

عزیزِ من! تمہارے نام نامی اور غالب وفا پیشہ کی ہم دلی و ہم مشربی کے سلسلے میں جو منشورِ سعادت دیوان ازل سے جاری ہوا وہ تمہاری نیک سرانجامی کی دعا سے عبارت ہے۔ صحیفۂ شادمانی کی سعادتِ ورود نے (میرا اندازِ گزارش جس کے حسنِ نگارش کا ہم تاب نہیں ہو سکتا) دل کو احساسِ مسرت سے بھر دیا اور زمانہ کے لطف پذیرائی نے کلکتہ کے روزگارِ خاک نشینی کی یاد تازہ کر دی۔ تمہارے والدِ بزرگوار کی نوازشوں نے مجھے ایک حیاتِ تازہ بخشی۔ اسی کے ساتھ تمہاری روز بہ روز بڑھتی ہوئی فرزانگی اور حضرت مولوی سراج الدین احمد کی گرمجوشی و لطف فرمائی کی یاد خاطر نشاں ہے اور ہمیشہ دل نشین رہے گی۔

معلوم ہوا کہ تمہاری خاطرِ عاطر نثر نگاری کی طرف مائل ہے۔ اس طرزِ گفتار کی شورانگیزی کو موجبِ ستایش و وجۂ آرائش خیال کیا جاتا ہے۔ بارے تم نے ایک پسندیدہ شغل سے بھی دل لگایا اور اس فن میں ایک برگزیدہ روش بھی اختیار کی۔

دانش آموزی میں تمہاری کم توجہی جو میں نے پچھلے دنوں کلکتہ میں دیکھی تھی اور خرد اندوزی کے سلسلہ میں جو تمہاری سرگرمیاں میں آج دیکھ رہا ہوں اس پر خوش ہوتا ہوں پھر بھی اس سے اندیشہ ناک ضرور ہوں کہ میں نے سر راہ ایک پودا لگایا ہے جتنی دیر میں کہ ثمر شاخ سے گرتا ہے اتنی جلدی وہ پودا ایک نخلِ پُر بہار میں بدل جاتا ہے اور پھل لے آتا ہے۔ مانا میری نظر میں تو ایک ہنگامۂ یوسفی ہے، اس حسن و خوبی کے ساتھ بندِ حجاب سے باہر آیا ہے کہ فرشتہ کا دل چرالے اور ساتوں آسمان اس کے گرویدہ ہو جائیں۔

تم نے خواہش کی ہے کہ تم ہر ماہ مسودہ نثر کا مجھے بھیجو گے۔ میں اسے دیکھ کر اور ہر کرشمہ و ادا کو باندازۂ بایست سجا کر تمہیں واپس کروں گا۔

صاحبِ من آپ نے یہ بات نہیں سوچی کہ حُسنِ گفتار کے بغیر لب کشائی بے معنی ہے اور کسی کے لطفِ سخن کو دوسرے کے اندازِ بیان سے نہیں پہچانا جا سکتا۔ ہر چند تم سے حسنِ ارادت میرے واسطے وجہِ انبساط اور تمہاری خوشی میری رضامندی کا موجب ہے لیکن ہم دونوں کے مابین نہ تحریر کی کوئی گنجائش ہے اور نہ قلم کی بیانجی گری کے لیے کوئی موقع —— طرزِ نگارش اِس کا الگ ہے اور اسلوبِ ادا اُس کا جدا یہاں اور وہاں ایک لفظ کو کاٹ دینا اور اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دینا کافی نہیں ہر صاحبِ فکر اس بات کو سمجھتا ہے کہ اندازِ گفتگو کو کس سطح پر توجہ دہی اور مزاج فہمی کی ضرورت ہوتی ہے نیز یہ کہ ہمدمی و ہم زبانی کے بغیر مزاج فہمی اور طرز شناسی کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

اس اثنا میں میرے ایک بھائی نے کہ ان سے زیادہ عزیز مجھے اپنے برادران سے سے کوئی اور نہیں، میرے سخن پاروں کو، جن سے میری نثری تحریریں مراد ہیں، جمع کیا اور انھیں ایک بیاض کی شکل دیدی ہے آنے والے دنوں میں اُسے میں تمہارے پاس بھیجوں گا تاکہ وہ نگارشِ سخن میں تمہاری ادبی فکر کے لیے خوش اندیشی اور فن کارانہ روشوں کی باز نمائی کا سبب بن سکے۔

تمہاری لاپرواہی پر دل جلتا ہے کہ تم نے اپنی دولت سرا کی نشان دہی میں خان سامان کے احاطہ کے ماسوا اور کسی سمت وجہت کو ظاہر نہیں کیا۔ ہر چند کو وہ احاطہ اس دیار میں شہرت رکھتا ہو اور انگریزی ڈاک تقسیم کرنے والے اس سر منزل کے جادہ شناس ہوں لیکن میری طبیعت کی وسوسہ پسندی اتنی بات پر ہرگز صبر نہیں کر سکتی بہر حال میں سوچتا ہوں کہ جب تک تم اس خط کا جواب نہ دو اور اس میں اپنے دولت کدہ کا پتہ نشان اس وضاحت سے نہ لکھو کہ اُسے نگارشِ سرِ مکتوب بنایا جا سکے یہ کتاب تمہیں نہ بھیجی جائے۔

خدا کا شکر ہے کہ تمہارا خط پہنچا اور اس اطلاع کا وسیلہ بن گیا کہ میں ذاتِ قدسی صفات قبلہ وکعبہ (حضرت مفتی الٰہی بخش صاحبؒ) کی سلامتی مزاج کی خبر فرحت اثر سے بہرہ اندوز ہوا۔ امید کہ سجدوں کے یہ نشان جو جبینِ قلم سے ٹپک رہے ہیں، بساطِ قبول کی طرف بڑھادئے جائیں گے۔ اسی کے ساتھ مولوی عبدالقادر صاحب کی خدمت میں کہ بیعت غائبانہ کے ساتھ اُن کے خدام کے ارادت مندوں میں ہوں، آدابِ عبودیت پیش کر دئے جائیں۔

کریم خاں صاحب کے بارے میں کیا کہوں کہ مجھے کیا کہنا چاہیے شوق کو اندازۂ دیدار نہیں لاجرم ایک سلامِ حسرت التیام اُن کو بھیجنے پر قناعت کرتا ہوں۔

ہے ہے اور آہ آہ وہ شخص کہ پردہ میں وفا دشمن ہے اور بے پردہ دوست دار صادق نکلا محمد خاں ناطق کہ جب تک وہ رہا مجھے اس نے بذریعہ ڈاک نامہ و پیام سے یاد نہیں کیا۔ ایک طویل مدت کے بعد اس خیال سے کہ میں اُسے یاد کرتا ہوں بہیں اتفاق جسے ازروئے اشتیاق نہیں کہا جا سکتا، خشک سلام میرے لیے آپہنچا اور وہ لاجوردی غزہ کو میری نگرانی کے لیے مقرر کر دیا کہ اس کا سلام بھی آشکارا طور سے اسی طرح واپس لوٹا دیا جائے اور اس سے پوشیدہ رکھتے ہوئے اس کی بود و ماند کے بارے میں مجھے اطلاع دی جائے تاکہ معلوم ہو اس کا ارادہ کیا ہے اور اس کی زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ خدام برجیس مقام حضرت علی اکبر شیرازی کے کمالات۔ دل نشیکی شہرہ مجھ پر سحر کی مانند اثر کر گیا اور اس بزرگ

کی محبت میرے گوشِ سماعت کی راہ سے دل میں اتر آئی۔

وہ شوق کہ گفتار سے پیدا ہوتا ہے اور وہ محبت جو دیدار سے جنم لیتی ہے، دونوں کو ہرگز ایک دوسرے کے برابر نہیں رکھا جا سکتا۔ دیدار کا آرزومند پرستان کو دیکھے تو وہ کامیاب ہے۔ لیکن خاطرِ پُر آرزو اور مشتاقِ گفتگو کے لیے دیدہ و دل دونوں ہی گرفتارِ تمنّا۔ اگر میں خود کو ارزشِ التفات کے ہر طرح لائق تصوّر کرتا تو بہ ہزار آرزو ان کے ملازموں کو خط لکھتا۔

چونکہ مجھے "سرو برگ تمنائے قبول" عطا نہیں کیا گیا لاجرم یہی مناسب ہے کہ میں خاکساری کی آبرو کو باقی رکھوں اور اپنی گمنامی کو خواہ مخواہ رسوا نہ کروں۔ انھیں اوراق میں ایک تازہ غزل لکھتا ہوں اور اس مہربانی و لطف کی توقع رکھتا ہوں کہ اس کام کی انجام دہی کے واسطے تم اس والا گوہر سے ملو گے اور اس بزمِ عالی کے باریافتگان کے سامنے اسے پڑھو گے کہ ایک ہندوستانی اس انداز میں زبانِ فارسی میں سخن سرائی کرتا ہے۔

جو کچھ یہ ہندی نژاد کہتا ہے وہ اگر درخورِ آفریں ہیں تو اسے دستوری عطا ہو کہ وہ کلک و ورق سے کام لے اور اپنی نغز گفتاری پر شادمان ہو۔ ورنہ پروانۂ دورباش کہ پھر اس آرزو کے قریب کبھی نہ آئے اور بے صرفہ خونِ جگر نہ کھائے۔

غزل۔ بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

زچشم و دل، بتماشا تتع اندوزیم
زجان و تن بمدارا زیاں بگردانیم

بگوشۂ بنشینم و در فراز کنیم
بکوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہم زبان سخن نکنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

گل افگنیم و گلابی بر رہگذر پاشیم
می آوریم و قدح در میان بگردانیم

ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم
بکار و بار زہے کاروان بگردانیم

گہے بلا بہ سخن با ادا در آمیزیم
گہے بہ بوسہ زبان در دہان بگردانیم

نہیم شرم بیکسوے و باہم آویزیم
بشوخیٔ کہ رخِ اختران بگردانیم

ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم
بلائے گرمیٔ روز از جہان بگردانیم

بوہمِ شب ہمہ را در غلط بیندازیم
ز نیمہ رہ رمہ را با شباں بگردانیم

بجنگ باجِ ستانانِ شاخسارے را
تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

بصلح بال فشانانِ صبحگاہی را
ز شاخسار سوئے آشیان بگردانیم

ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

بمن وصالِ تو باور نمیکند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم

بنام مولوی سراج الدین احمد

[۳۰]

میرے والی، میرے مولا، آج یک شنبہ کا دن اور جمادی الثانی کی دوسری تاریخ ہے۔ کچھ وقت کے لیے میں نے سعیٔ آوارگی کو چھوڑا اور دہلی کے ایک گوشے میں پاؤں دامن میں سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ میں ان نیک لوگوں کی طرف سے اپنے ساتھ بہتر سلوک اور آئینِ غم خواری کی پیروی پر کس قدر مسرت محسوس کرتا ہوں کہ اس سفر میں میری آنکھیں ان کی خاک پائے روشناس ہوئیں اور اسی نے وطن میں قیام کو مجھ آشفتہ سر اور آوارگی مشرب کے لیے غربت سے زیادہ تلخ بنا دیا۔

دہلی پہنچ جانا ،کلکتہ کے اندوہِ جدائی کی تلافی نہ کر سکا، خوشی تک کہاں نوبت پہنچ سکتی ہے۔ اہلِ نظر میں جو بھی شخص مجھے دیکھتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ راہرو منزل پر پہنچ گیا اور اپنے وطن میں آرام کر رہا ہے۔ بلکہ یہ خیال کرتا ہے کہ میں کوئی دردمند ہوں جو وطن سے دور نکل آیا ہے اور جو تازہ تازہ غربت کا داغ کھائے ہوئے ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو۔

جس شخص کا مولوی سراج الدین احمد، مرزا احمد بیگ خاں، مرزا ابوالقاسم خاں اور آغا محمد حسین کا ساتھ چھوٹ گیا ہو اس کو تو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

عجیب تربات یہ ہے کہ ان تین برسوں کے دوران کہ جو وطن سے دوری اور صحرانوردی میں گزرے دہلی کے بڑے لوگوں کی رسم و راہ بدل گئی۔ احباب کی طبیعت میں مہر و وفا باقی نہ رہی۔ دوستانِ یک دل میں سے ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو اپنی آغازجا کی طرف واپس لوٹ گئے اور بزمِ اُنس کے بہت سے جرعہ نوشوں نے جامِ فنا پی لیا۔

صاحب دل اور گراں مایہ شخصیتیں گوشۂ گمنامی میں پہنچ گئیں اور بیوقوفوں اور کمینوں کے لیے عروج کا دور آگیا عداتوں کا حال دادخواہوں سے زیادہ بدتر ہے اور شریف انسانوں کے دن بیوفا لوگوں کی پتلیوں سے زیادہ سیاہ۔ جب سے یہاں آیا ہوں ہر طرف دیکھ رہا ہوں اور کسی بھی طبیعت میں مجھے محبت کا شائبہ نظر نہیں آتا۔

حاکم بخود مشغول ہے اور جس کو منصب سپرد کیا گیا اس نے شہر کو پریشانیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب بہتری کی کوئی امید اس سے زیادہ نہیں کہ کوئی یہ سوچے کہ "آب جو سے نکلا ہوا پانی پھر آبجو میں واپس آجائے گا" اور یہ اس اندیشہ کے باوجود ہے کہ اہرمن طبیعت اور دیووں جیسی طینت رکھنے والے حاکم کا زوال ہو جائے گا۔ لیکن یہاں جو کچھ ہے وہ عام لوگوں کی زبان پر اور خاص لوگوں کے گمان میں ہے۔ سر رشتۂ کار کسی پر ظاہر نہیں۔

نامۂ نامی جو باندے میں مجھ تک پہنچا اور جس کا جواب بھی میں نے وہیں رہتے ہوئے تحریر کر دیا تھا، اس میں موکب گورنری کے بارے میں بھی ایک سطر تھی ابھی تک وہ خیال بروئے کار نہیں آیا ممکن ہے ایسا کوئی فرمان جاری ہی نہ ہوا ہو۔ کونسل کا جزو اعظم (گورنر جنرل) یہ چاہتا ہے کہ ارباب کونسل کو ان کے محکموں اور دفتروں سمیت ہندوستان میں اپنے ساتھ لائے اور نظمائے کونسل اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے امید ہے کہ آپ مجھے بے خبر نہیں رکھیں گے اور جو بات آپ کو معلوم ہو گی مجھے بھی اس سے مطلع کریں گے دولت و اقبال روز افزوں ہو۔

ایضاً

[۳]

قبلۂ حاجات— میرا دل نارسائی قسمت سے داغ داغ ہے کہ سفر کی سرانجامی کا خیال ایک زمانہ سے میرے دل میں جاگزیں ہے اور شیوۂ محبت کو برتنے کی قوت ایک عمر سے میرے خاطر نشان، اسپر بھی ہنوز محروم آسودگی ہوں۔ نامہ نگار کے سر میں یہ

سودا سمایا ہے کہ آمیزشوں کے بھنور سے اپنے رختِ آرزو کو کنارے لگاؤں اور آزادانہ رہ گزارِ حیات میں سفر کروں۔

میں سوچ رہا ہوں کہ جاڑے کے شروع میں افسردگی کا یہ دور ختم ہو جائیگا اور اس درماندگی سے نجات کی کوئی صورت نکل آئے گی خواہی نخواہی میں اس دامگاہ سے رہائی حاصل کر کے صحرا کی طرف نکل جاؤں گا لیکن اس عقدۂ کار کو کشائش کی کوئی صورت میسر نہیں آئی اور یہ ارادہ دل کا دل ہی میں رہ گیا۔

فرد ناامیدئ ما گردشِ ایام ندارد
روزیکہ سیاہ شد، سحر و شام ندارد

(ہماری ناامیدی کا گردشِ ایام سے کوئی رشتہ باقی نہیں۔ جو دن کہ سیاہ ہو گیا اس کے لیے اب نہ کوئی صبح ہے نہ شام۔)

افسوس کہ میں اپنے اس گمان سے منفعل ہوں اور اپنے اس انتخاب پر شرمندہ، کلکتہ کے مجمع احباب میں مولوی سراج الدین احمد کے سوا میرا دل اور کسی کے نام پر قرار نہیں پاتا اور محبت کے لیے ضمیرِ منیر کے ماسوا کوئی دوسری جلوہ گاہ نظر نہیں آتی اب تقریباً ایک سال ہو گیا انھوں نے مجھے یاد نہیں کیا اور اس خاموشی و فراموشی کے لیے کوئی عذر بھی نہیں چاہا۔ آج کہ ماہ دسمبر کی ۲۸ تاریخ ہے اور ۱۸۲۳ء کا اختتام قریب ہے میرا دل دردِ بے صبری سے تڑپ رہا ہے ناچار میں یہ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں اور میں نے خود کو اپنے مخدوم کی خاطرِ عاطر کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اگر وہ مجھے خط سے یاد کریں تو میں مارے خوشی کے اپنے پیرہن میں پھولا نہ سماؤں شکوہ فراموشی کی اس داستان کو مختصر کرتا ہوں۔

ایضاً
[۳۲]

قبلۂ حاجات۔ گوہر آگیں نامہ ایک عرصہ کے بعد پہنچا اور باعثِ جاں نوازی ہوا، آنکھوں کو فروغ اور دل کو فراغ بخشا۔ آپ نے میرے خط ارسال نہ کرنے کو میری افسردگی

شوق پر محمول کیا میری موت کا گمان آپ کو کیوں نہ گزرا تاکہ میں آپ کی اس اداشناسی پر خوش ہوتا اور آپ کو اہلِ دانش اور صاحبِ دل تصور کرتا۔ میں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ آپ کی محبت کا جذبہ دل و جگر بلکہ میرے وجود کے ریشہ ریشہ میں سما گیا ہے اور میری زندگی بن گیا ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں آپ کا بے دام بندہ ہوں وفا میرا آئین ہے اور خلوص میرا دین۔

اگر خط کی تحریر میں تاخیر ہو جائے تو خدارا اُسے میری فراموشی پر محمول نہ فرمائیے کیا بتاؤں دل میں درد، نگاہ میں ہنگامہ، طبیعت میں تفرقہ اور سر میں گوناگوں قیامتیں ہیں کہ ہر وقت بپا رہتی ہیں میرے شب و روز کس طرح بسر ہوتے ہیں کچھ کہہ نہیں سکتا جو خط جمنا داس اخبار نویس کے نام اور اسی طرح جو مکتوب نواب فتح اللہ بیگ خاں بہادر کے نام تھے وہ الگ الگ ان کو پہنچا دیئے گئے اور اس کے ماسوا جو باتیں نہیں کہی جا سکتیں وہ کہہ دی گئیں۔ سلامت رہئے کہ مجھے آپ نے اس فکر مندی سے نجات دلا دی میں سبک دوش ہو گیا ہوں اور مجھے کشاکش سے رہائی مل گئی ہے اب جمنا داس جانے اور نواب فتح اللہ بیگ خاں یا پھر شیخ علیم اللہ میں بہر حال درمیاں میں نہیں ہوں اور نہ ہر طرف سے تقاضوں کے تیروں کا نشانہ زیادہ باقی ہیں غمِ دل، شکوہ بخت، فراوانیٔ محبت اور استواریٔ وفا کے علاوہ اور کیا لکھوں۔

والسلام بالوفِ احترام

ایضاً
[۳۳]

مخلص نوازا۔ میں اس زمانے کی خوبی و خجستگی کو سراہتا ہوں اور خود اپنے آپ کو اقبال مندی کی اس نیک ساعت کے لیے چشم بد دُور کہتا ہوں کہ دو ہفتہ کے عرصے میں سوادِ نامہ کی دید سے میری آنکھیں دو بار روشن ہوئیں، پہلے مولوی نور الحسن کا مودت نامہ آیا اور گورنر کے لشکر کی روانگی و قیام کے بارہ میں اطلاع بہم پہنچی۔ دویم وہ نامۂ عالی جو اپنی گراں مائیگی کے باعث مثل جانِ عزیز کے ہے اور زندگی کے تئیں دستور العمل

اور آئین کا درجہ رکھتا ہے۔ جاودان رہیے کہ آپ خود پیکر مردمی کے واسطے روح کا سا حکم رکھتے ہیں۔ میں حکم بجا لایا اور منت پذیر ہوا۔

میں اپنے مخدوم ستودہ صفات حضرت قاضی القضاۃ کے نام ایک درخواست بھیج رہا ہوں چونکہ اس میں کوئی بات بعینہٖ راز نہیں اسے کھول لیجیے اور پڑھ ڈالیے اس کے بعد اُسے زحمت کر کے آں جناب کی نظرگاہ تک پہنچا دیجیے اور جوبات ان کے لب جاں بخش سے ادا ہو وہ مجھ پر آشکارا فرمائیے۔ اگرچہ میں ان لوگوں کے سبب اس لائق نہیں ہوں کہ حضرت مخدوم کے رشحات قلم میری آبرو بن جائیں لیکن وہ ازراہِ لطفِ خاص اس عفونامہ کا جواب تحریر فرمادیں تو اس صحیفۂ مودت کو مجھ تک پہنچا دیا جائے کہ میں اُسے بازوئے اندیشہ کا تعویذ بنالوں۔

والسّلام والاکرام

ایضاً

[۳۴]

میرے والی میرے مولا۔

رمضان کی ۱۰ر تاریخ، برادرِ ریا پیشہ وجفا اندیشہ (کذا) افضل بیگ رونق بخش کاشانہ ہوئے بزرگ منشی اور عاجز نوازی ان کی عادات میں سے ہے اُسی روز ورود کی شام کو مجھ سے ملنے آئے اور میرے سرِ نیاز کو آسمان کی سی بلندی بخشی۔

میں آپ کو یہ مژدہ بھی سنارہا ہوں کہ مرزا افضل بیگ کو مقرب الدولہ اور خان بہادر کے خطابات سے نوازا گیا ہے اور اب ان کی انگشتری کے نگینہ پر مقرب الدولہ (مرزا) افضل بیگ خاں بہادر کندہ ہے۔ لیکن جس دن سے یہاں ان کا ورود ہوا ہے وہ کھانسی اور زکام کے عارضہ میں مبتلا ہیں رگِ باسلیق میں فصد کھلوائی ہے اسی کے ساتھ مُسہل لیا ہے اب کچھ افاقہ ہے۔

سخن مختصر جس بات سے میں درماندہ و عاجز ہوں وہ یہ ہے کہ مُقرّب الدولہ بہادر کے ورود سے پہلے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے دہلی کے صاحب

لیفٹیننٹ گورنر ریذیڈنٹ نے مرزبان میوات کے وکیل کو بلایا اور اس کے پیش کردہ کاغذات اُسے دکھا کر کہا یہ سب جعلی ہے۔ ان کاغذات کے دستخط اور مہر مستند نہیں ہیں اور سرجان مالکم بہادر نے اُسے اپنی دیدہ وری کے ساتھ مان لیا۔

اس سے میرے رشتۂ خیال میں چند گرہیں پڑ گئی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ سخت اور زیادہ مضبوط ہے۔ پہلی بات یہ کہ سرجان مالکم نے اس بے نشان کے نامۂ فارسی کو باور نہیں کیا اور رپورٹ انگریزی کو کہ زادۂ دفتر سرکاری ہے غلط ٹھیرایا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ فارسی تحریر انگریزی رپورٹ کی تنسیخ نہیں کرتی تو پھر یہ اتنی جلدی واپس کیسے کی گئی۔

ان دونوں تحریروں کا موازنہ و مقابلہ کیا جانا ضروری تھا تاکہ اس کے بعد معاملہ یک سو ہو جاتا۔ تیسرے یہ کہ جب تحریر فارسی مدعا علیہ کو واپس کی گئی، یہ نقشِ تازہ اسی کے ذریعہ روبکار بھی آیا تھا تو اس سے یہ بات کیوں نہیں کی گئی کہ اس میں مندرجہ رقم وہ وصول کرے اور آئندہ شور مچانا بند کرے۔

اس میں طرفگی یہ ہے کہ مرزا افضل بیگ نے کہ گورنر کے لشکر میں ہیں یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ اس راز سے بے خبر نہیں اور مجھ سے کوئی ایسی بات بھی نہیں کی جو مجھے اس گومگو سے نجات دلائے۔ اور میری پریشانی خاطر رفع ہو۔ لاجرم آپ سے رجوع کرتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک آپ کو اس کا علم ہو مجھے اس سے آگاہ فرمائیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

زیادہ زیادہ

ایضاً

[۳۵]

میرے قبلہ

کیا عرض کروں کہ میں اپنے بختِ بد سے کس قدر گلہ مند ہوں اور ہجوم اندوہ سے خود کو کتنا لاچار محسوس کرتا ہوں تین ماہ ہو گئے کہ مخدومی مرزا احمد بیگ اور ابوالقاسم خاں

رسم و راہ محبت کو ترک کر رکھا ہے اور بے مروتی کے راستے پر گام زن ہیں۔ ــــــ

اب اس طرف سے سلام آتا ہے نہ پیام۔

ایک روز داؤد بیگ میرے پاس آیا اور بہ تقریب گفتگو اس نے کہا کہ مولوی سراج الدین احمد کانپور پہنچ گئے ہیں میں نے کہا افسوس کلکتہ میں کوئی ایسا نہ رہا جو میری طرف سے چارہ جوئی اور میری رہنمائی کر سکے۔ اور جو کچھ اس ہنگامے کی صورت ہے اس کے بارے میں مجھے مطلع کرے۔

مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ مرزا ابوالقاسم خاں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب کرنل ہنری املاک اپنی موجودہ بیماری سے صحت یاب ہو جائیں گے تو ان سے ہاکنس کے نام ایک سفارشی خط لکھوا دیں گے اور وہ خط مجھے بھجوا دیا جائے گا۔

انھیں دنوں میں ایک بڑے انگریز افسر نے مجھے بتایا کہ کرنل ہنری املاک نے بھی اس جہان گزراں کو خیرباد کہا۔ وائے بر حال من کہ میں اس دیار میں جو بے فرماں روا ہے پتھر سے سر ٹکرا رہا ہوں اور ناکامی کے صدمے سے جاں بلب ہوں، میرا دشمن صاحب جاہ و ثروت ہے اور میں تہی دست و ناتواں۔ خلقت مجھے ستانے کے درپے ہے اور ہر ایک گروہ میرے خون کا پیاسا۔

خدارا اگر آپ کانپور سے عازم لکھنؤ ہو چکے ہوں اور اپنے دولت کدہ پر پہنچ گئے ہوں تو مجھے کلکتہ کے حالات سے مطلع فرمائیں تاکہ میرے دل سودا زدہ کو تسکین ہو اور میری روح مجروح کو سکون و آرام میسر آئے۔

والسّلام

ایضاً

[۳۶]

قبلہ ام جہاں لطیف اجزا تحلیل ہو جائیں اور کثافت رہ جائے جس طرح شراب سے تلچھٹ اور آگ سے خاکستر باقی رہ جاتی ہے۔ تو یہی جی چاہتا ہے کہ اسے دوست کے قدموں پر نچھاور کر دوں لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کے پائے نازک کو

گزند نہ پہنچے اور یہ نہ کروں تو اہلِ محبت کی نگاہ میں شرمسار ہوں۔ خدارا بتایئے کہ اب میں کیا کروں کہ حقِ محبت بھی ادا ہو جائے اور میں دوست کی مہربانیوں کے واسطے اس کا سپاس گزار بھی بن سکوں۔

صحیفۂ خلوص کے ورود نے میری آنکھوں کو مثالِ آئینۂ شاہد آرزو کی دید سے شاد کام کیا۔ عالم عالم اسرار نظر میں آئے۔ سوچتا ہوں اس کے جواب میں کیا لکھوں۔ میرا ایک اور خط بھی آپ کو ملا ہوگا۔ مختصر یہ کہ یہ بارِ گراں ہے اسے دوشِ ہمت پر اٹھائے رکھئے اور اندازِ کریمانہ کے ساتھ اُسے برداشت کیجیے، اور میں جانتا ہوں کہ آپ ایسا ہی کریں گے۔

اس لیے کہ آپ کریم النفس اور گراں مایہ شخص ہیں اُس عدالت گاہ کے حال اور اس محکمہ کے کردار سے میں پہلے ہی سے بخوبی واقف ہوں لیکن خدا گواہ ہے کہ اس سے بھی بات نہیں بنتی۔ کسی ماتم زدہ کا دل کچھ لوہی تو تسکین نہیں پاتا اور ایک خستہ جگر بہرحال مرہم کا طلب گار ہوتا ہے [نواب گورنر جنرل بہادر کی طرف سے]

اگر مدارج کے سفر میں مہربانی ہو جائے اور حق، حقیقی حقدار کو پہنچ جائے اور آپ اس کے ظہور میں کوشش کریں تو میری، اپنے دلی مقصد تک رسائی آسان ہو جائے۔ اتنی بات تو میں خود بھی جانتا ہوں کہ آپ کی رائے اس معاملے میں میرے ساتھ ہے اور یہ میری تنگ ظرفی کے ماسوا اور کیا ہے کہ میں آپ کے سامنے اپنی سفارش کر رہا ہوں۔

میرا جو خط بھی آپ کو ملے اُسے پڑھیے اور مولانا کو دکھانے کے بعد چاک کر دیجیے، آگ میں ڈال دیجیے، یا پانی میں پھینک دیجیے، ہمت سے بڑے کام ہوتے ہیں۔

والسّلام

ایضاً

[۳۷]

صاحب من ایک مدت ہوئی کہ میری آنکھیں گوہریں نامہ کے سواد سے

روشن نہیں ہوئیں۔ اس سے پیشتر جناب والا نے ازراہ بیکس نوازی جو کچھ فرمایا وہ میرے نگینِ دل پر نقش ہے اور میرا ضمیر اس باب میں ہزار کانٹوں کی چبھن اپنے اندر محسوس کرتا ہے محاسبِ خیال کے اندازۂ شمار کے مطابق جواب پہنچنے کی مدت ختم ہو گئی اور اب تک اس بہار آفریں مکتوب کا کوئی نشان ہویدا نہیں۔

میرا ماجرا یہ ہے کہ اس خلاف آباد کی عدالت گاہ سے اپنے آپ کو یکسو کرکے اپنے غم کدہ میں "نقش بدیوار" بنا بیٹھا ہوں۔ بزمِ خیال میں امیدِ موہوم کا چراغ جلائے ہوئے ہوں حاکمانِ صدر کی دادگری کی طرف سے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اب میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اطراف کے حکام کیا روش اختیار کرتے ہیں اور کون باتیں ان کے پیشِ نہادِ خاطر رہتی ہیں۔

اب اگر کچھ اور دن حالات اسی نہج پر چلتے ہیں تو خاندان کے خاندان سیلابِ فنا میں غرق ہو جائیں گے۔ خاص کر اس دیار میں جہاں خواص نے بھی چغل خوری اور افترا پردازی کا شیوہ اختیار کر رکھا ہے۔ حکام اِن لوگوں کی گفتگو پر کان دھرتے ہیں۔ نہ جانے کتنے بندگانِ خدا ہیں کہ اپنے اموال و املاک کے معاملے میں خوف زدہ ہیں۔

خستہ خاطروں کی بجان نوازی کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے زخمِ دل کے مرہم کا حصول مرکز کے دار الشفا ہی میں ممکن ہے بارگاہِ نامرادی و پایگاہ افسوس کا سکہ کہیں نہیں چلتا۔ ورنہ جدھر دیکھو "غبارِ فتنہ" بلند ہے اور آتشِ ظلم بھڑک رہی ہے آج کہ ماہ رجب کی ۲۱، اور جنوری کی ۱۲ تاریخ ہے [۱۸۳۰/۱۲۴۵] جامِ جہاں نما میں یہ خبر چھپی کہ کلکتہ میں وبا پھیلی ہوئی ہے۔

میں کہ دوستوں کے بارہ میں فکر مند رہتا ہوں اب کیا کہوں کہ اضطراب کے باعث میرے دل کا کیا حال ہے میری اس پریشانی و طبیعت کی نگرانی کا خیال رکھتے ہوئے امید کہ جناب والا جلد از جلد مجھے اپنے کوائف (خیر و عافیت) سے مطلع فرمائیں گے۔ بلکہ اپنے تمام احباب واعزا اور متعلقین کے حالات سے برابر اطلاع

دیتے رہیں گے۔

زیادہ عمر، دیا مزہ عمر کی خواہش اور دعاؤں کے ساتھ۔

ایضاً

[۳۸]

قبلۂ دید و دل سلامت!

حیران ہوں کہ مسٹر اسٹرلنگ جیسے فرخ فال و بلند اقبال امیر کے دنیا سے اس طرح اچانک اٹھ جانے کے آخر کیا معنی ہیں۔ اور کارکنان قضا و قدر نے اس کی جواں مرگی کو کس نتیجہ و مصلحت کے طور پر منظور کر لیا۔

اب سمجھ میں آیا کہ غالب برگشتہ قسمت کی تمام آرزوؤں پر پانی پھیر دینا مقصود تھا اور یہ صورت، ممکن نہ تھی مگر اس ہنگامۂ ہوش ربا کے ساتھ۔

اس خراب آباد کے حاکم نے، جسے فرانسس ہاکنس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مرزبانِ فیروزپور کے ساتھ پیمان یک دلی باندھ رکھا ہے نتیجہ یہ کہ اس کی مرضی کے مطابق رپورٹ صدر میں بھیجدی۔ پردہ داروں نے اس پردہ میں مجھے بار پانے کا موقع دیدیا اور ایک حد تک اس راز سے آگاہ بھی کر دیا لیکن یہ سب سن کر بھی میں مضطرب نہ ہوا اور دل میں کہا کہ یہاں یہ سب ہونے دو لیکن اصل زمام کار تو مرد فرزانہ یعنی مسٹر اسٹرلنگ کے ہاتھ میں ہے جو حق پرست و حق شناس انسان ہے۔ وہ چارہ گری کی کوئی صورت پیدا کریگا۔

میں اتنا جانتا ہوں کہ صاحب سکرتر بہادر نے مجھے یاد فرمایا اور مجھ سے کہا فرانسس ہاکنس بہادر نے تمہارے وظیفہ کے بارہ میں جو تجاویز مرکز کو بھیجی تھیں وہ منظور کر لی گئیں۔ میں نے پوچھا صاحب ریزیڈینٹ بہادر نے کیا تجاویز ارسال فرمائی تھیں جواب دیا کہ قاعدۂ سابقہ کو مستقل صورت دیدی جائے۔

میں حیرت میں پڑ گیا بلکہ ایک طرح سے مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ بندۂ خدا کیا کہتا ہے میرا مقدمہ اس سے بہتر نظر داری

اور حسن سلوک کا مستحق تھا۔ سوگند بخدا کہ اسٹرلنگ کے نہ ہونے کے باعث معاملہ نے یہ شکل اختیار کرلی ایسے کسی حکم کے صادر ہونے کی مجھے ہرگز توقع نہ تھی۔

اب کہ میں چارہ سازی کے دروازوں کو شش جہت سے اپنے اوپر بند پاتا ہوں اور تمام ستارے گویا میرے حق میں طالع ناساز بن گئے ہیں۔ بجز اس کے اور رہ کیا گیا ہے کہ میں انگریزی میں درخواست لکھواکر بذریعہ ڈاک نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں روانہ کروں اور اس میں اپنا تمام احوال مو بمو لکھ بھیجوں۔

آپ سے یہ عرض ہے کہ میری فریاد کے مبادی کو سکرتر حال کے گوش سماعت تک پہنچادیں کہ وہ اس نامراد کو پہچانے اور اس خستہ حال کی داد کو پہنچے۔

فرد بردلِ نازک دلدار گرانی مکناد

خواہشِ ماکہ جگر گوشۂ ابرامے ہست

دکہیں ایسا نہ ہو کہ یہ میرے دوست کے تئیں ناگواری خاطر کا سبب ہو کہ ہماری خواہش نے ابرام کی شکل اختیار کرلی ہے۔)

ایضاً
[۳۹]

قبلہ ام دلکش نامہ کے ورود نے میری روح کو تازگی کی نوید سے نوازا میری خاطر کو نور آگہی سے روشن کیا اور مجھے اس کا احساس دلایا کہ میں کوئی بیکس وتنہا شخص نہیں ہوں میرا بھی کوئی ہے سلامت رہیے اور ہمیشہ رہیے۔

کارخانہ کی بے رونقی کے خیال سے دل میں ایک گونہ ملال پیدا ہوتا ہے یزداں پاک اپنی بہترین بخشائشوں سے آپ کو نوازے آپ کی زندگی سعادتوں کے ساتھ بسر ہو اور ہر گونہ انقلاب آپ کے واسطے نئی تازگی ومسرت لیے ہوئے رونما ہو۔ زمانہ کے اچھے برے کو ایک امرِ واقعی مان کر کارِ خلق و دل با خدا، رہیے۔

میں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ جب آپ کے حالات ومعاملات پر نظر جاتی ہے خاص طور پر اس وقت جب میں صعوبتِ سفر اور مصارفِ راہ کے بارہ میں سوچتا ہوں

تو اس پر بھی خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آپ اپنے راحت کدہ میں پہنچ گئے اور راستے کی زحمتوں کا سلسلہ ختم ہوا۔

افادات سے بھرے مضامین میرے خاطر نشان ہو گئے ہیں اپنے بارہ میں میرا گمان یہ ہے کہ میں ناکام نہ ہونگا ہاں مجھے حاکم اعلیٰ تک پہنچنا چاہیئے اس لیے کہ میں اپنے حقیقی و تحقیق حق کو جانتا ہوں اور ایسا کوئی آدمی محروم نہیں کیا جا سکتا۔

جو کچھ مخدومی مرزا احمد بیگ کی طرف سے مرقوم تھا وہ گوش ہوش کا آویزہ بن گیا ہے۔ ایزدی عظمت و جلال کی سوگند کہ ہرگز میں نے ایسی کوئی بات مرزا صاحب کے بارہ میں نہیں سوچی کہ آزردگی خاطر کا باعث ہو ہاں میں یہ جانتا ہوں کہ اب کہ میں کلکتہ میں نہیں ہوں فلاں شخص نے میرے غیاب میں مرزا صاحب کے کان بھر دیے ہنگامہ ہم زبانی و خلوت کا سلسلہ وہ پہلے سے جاری کیے ہوئے تھا۔

اپنے مقصد کے مطابق اس نے چند جھوٹی سچی حکایتیں گھڑ کر سنائیں اور مرزا صاحب نے بھی اس کی باتوں کو گوش دل سے سنا اور ان پر یقین کر لیا اگر یہ سب کچھ نہیں تو یہ بات اس کے علم میں آ ہی جائے گی کہ مُدعی استحقاق رکھتا ہے اور اسد اللہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ کوئی حق کو چھپائے اور اتلافِ حق میں کوشش کرے۔ چونکہ میرے صفحۂ ضمیر پر یہ خیال مرتسم ہو گیا ہے اس لیے بھی میں اس صورت حال پر زیادہ مضطرب ہوں اور کسی استاد کے اس شعر کو گنگناتا رہتا ہوں۔

فرد   دل بردقانہم کز بجز صبر چارہ نیست
اکنوں کہ دوست بجانب دشمن گرفتہ است

ترجمہ ان جفاؤں پر اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں کہ بجز صبر و وفا کوئی چارۂ کار باقی نہیں۔ اب کہ دوست نے دشمن کی سوگیری اختیار کر لی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں سادہ دل و راست گفتار ہوں۔ جو کچھ میرے دل میں تھا وہی میری زبان پر آیا۔

اگر میں وفاداری کے مسلک کو اپنانے میں کہیں ناکام رہا تو میں خود کو سخت

سزا کا مستحق گردانتا ہوں اگر میں شایستۂ بخشش ٹھیرتا ہوں تو مجھے معافی تقصیر کی سند ملنی چاہیئے۔ والسلام

ایضاً

[۴۰]

یہ مولوی سراج الدین احمد کے نام غالبِ غم دیدہ کا نیاز نامہ ہے اور گزارش مدعا کا عنوان یہ ہے کہ نگارین نامہ کے ورود نے میرے جیب وگریبان کو اُنس ومحبت کی خوشبوؤں سے بھر دیا۔

جواب میں تاخیر کا باعث میری بے توجہی نہیں میری یہ خواہش ہے کہ سرمایۂ تحریر بہم پہنچ جائے اور آگاہی کی بجلی چمکے تو میں کچھ لکھوں۔ اب کہ جادۂ مدعا طلبی طے ہوا پھر قلم نے نامہ نگاری ورو شناسی اور شوق نے جواب نامہ تحریر کرنے میں ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔

فیض رسانا آپ کے نامۂ نامی نے قبلہ وکعبہ مولوی خلیل الدین خاں کے وجود باجود کی صحت یابی سے آگاہی بخشی حق یہ ہے کہ میں اس نوید کا منتظر تھا میری طرف سے ان کی خدمت میں آدابِ زمین بوسی کے بعد — میری کوتاہ قلمی کے واسطے معذرت پیش کیجئے —— ایک دو ہفتوں میں خود کو ذرا سنبھال لوں تو بذریعہ تحریر خاطر عاطر کو یاد دہانی کراؤں۔ علاوہ بریں جو کچھ مجھے اس چرخِ گرداں کی گردش کے نتیجہ میں پیش آیا دہ یہ ہے کہ ماہ مئی کی پہلا اور ماہ ذی الحجہ کی گیارہ تاریخ تھی (۱۸۳۰ء ۱۲۴۶ھ) میرے مقدمہ کی رپورٹ اس داد گاہ سے صدر روانہ ہوئی ہائے ہائے کیا رپورٹ اور کیا مقدمہ رپورٹ حبشیوں کے بالوں کی طرح خم اندر خم اور مقدمہ عاشقوں کے حال خراب کی طرح درہم وبرہم رپورٹ ایک جہان آرزو کے واسطے فتوائے خوں ریزی اور رپورٹ ؟ کہ اسے ریزش آبرو کا فرمان کہنا چاہیے چونکہ میں حاکمِ شہر کو شروع شروع سے اپنے حال پر مہربان تصور کرتا تھا اب مجھے شرم آتی ہے کہ بات کو بڑھاؤں اور شکوہ سنجی کی راہ اختیار کروں بس اتنا ہے کہ اگر میری امید کی بنیاد اتنی استوار نہ ہوتی

کہ احکامات صدر کا سامنا کر سکے۔ تو اس محکمہ کے پیش دست میری مرادات کی بنیادوں میں رخنے پیدا کر دیتے اور حاکم کو مجھ سے برگشتہ کر دینے میں کامیاب ہو جاتے۔

مختصر یہ کہ آج تک کی صورت حال یہ ہے اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کل کو کیا پیش آئے۔ اور اس پردے سے کیا رونما ہو۔

ایضاً

[۴۱]

ممدوح غالب، مخدوم غالب اور قبلۂ غالب۔ اگر کمال اندوہ نے میرے دل پر بند نہ لگایا ہوتا تو میں جانتا ہوں کہ میں شکوہ سنجی میں کیا کیا روشیں ایجاد کرتا اور گلہ گزاری میں کیسے کیسے تماشے نہ دکھاتا۔ میری ناکامی میں آپ کا فائدہ ہے ورنہ اگر مجھے تاب و تواں میسر ہوتی تو آپ سے اتنا الجھتا کہ آپ کا دامن و گریبان سلامت نہ رہتا اور میرے سر و گردن۔

اب خدا سے ڈرو اور انصاف کو ہاتھ سے نہ دو۔ کہیں میرا اور آپ کا معاملہ وہاں نہ پہنچ جائے کہ زمانے بیت جائیں اور میں آپ کو خط بھی نہ لکھوں اور دل یہ کہتا رہے اندوہ تازہ کی گزارش سے خاطر عاطر ملول نہ ہو۔ اس خط میں ان دو سطروں کی تحریر کی بھی گنجائش نہ تھی لیکن اس اندیشہ نے دل پر دستک دی کہ ایسا نہ ہو کہ میرے محب صادق آلو لا مجھے بالکل خوش و خرم سمجھ رہے ہوں۔ اس خوش گمانی کے باعث میری طرف سے خالی الذہن بیٹھے ہوں اور تلافی کا خیال بھی اُن کے پیرامون خاطر میں نہ ہو اور میں مستقلاً نقصان میں رہوں اور رشتۂ امید برابر شکستہ رہے۔

فی الجملہ اس نامہ نگاری سے مدعائے ضروری الاظہار صرف اتنا ہے کہ برادر مشفق نواب امین الدین خاں بہادر ابن نواب فخر الدولہ، دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ کو اس موج بلا کے تھپیڑوں نے دل شکستہ بنا دیا اور ان کے خانۂ جاں کو سیلاب فنا کے سپرد کر دیا اور خون وفا میری گردن پر ہے کہ میں اس سفر میں

ان کی ہمراہی سے باز رہا۔

روئے سیاہ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم
شمعِ خموشِ کلبۂ تارِ خودیم ما

(ہم نے اپنے روئے سیاہ کو خود اپنی آنکھوں سے بھی چھپا دیا۔ اور اپنے کلبۂ تاریک کی شمعِ خاموش بن گئے۔)

میری درماندگی اور بیچارگی کو اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ میں خونِ جگر کھاتا رہوں اور امین الدین احمد خاں بہادر کو تنہا سفر کرنے کے لیے چھوڑ دوں۔ اگر قاضیٔ عشق مجھے اس جرم میں قتل گاہ کے چبوترے پر بٹھا دے اور تیغِ بے دریغ سے میری گردن اڑا دے تو میں اس کا مستحق ہوں اور لطف کی بات یہ ہے کہ جتنا اس باب میں میرے لب حرفِ گفتگو سے آشنا ہوتے ہیں اور میں ہنگامۂ عذر و معذرت برپا کرتا ہوں' اتنا ہی میری شرمساری بڑھتی ہے اور میرا احساسِ ندامت سر اٹھاتا ہے اگر سراج الدین احمد خاں اس کی تلافی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو میں اس پریشانی و تشویش سے نجات پا سکتا ہوں اور شرمندگی کی گرد اپنے چہرے سے صاف کر سکتا ہوں آپ غمخواری و مسافر نوازی پر اپنی کمرِ ہمت چست کریں اور اپنے آپ کو امین الدین خاں کا دوستِ دیرینہ سمجھیں اور اس طرح اُن کی دلجوئی و چارہ سازی میں لگ جائیں کہ یہ دوست اپنے خانماں سے دور رہتے ہوئے اسد اللہ روسیاہ کو فراموش کر دے اور آپ کو اس کی جگہ پر سمجھے۔

نیز برادر والا قدر (سلمہ اللہ تعالیٰ) سے یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ جب وہ کلکتہ پہنچیں اور آپ سے ملیں تو یہ سمجھیں کہ اسد اللہ ان سے پہلے ہی کلکتہ پہنچ گیا ہے۔ ان مدارج سے قطع نظر جن کو میں نے گنایا ہے' آخر خدا تو ہے اور اس کے یہاں انصاف بھی ہے۔ میرے اس سعادت مند بھائی امین الدین خاں کی ناکامی و ستم کشی کی کہانی پتھر کے دل کو پگھلا دینے اور فولاد کو پانی کرنے والی داستان ہے اس سے زیادہ میں کیا لکھوں۔ باقی تو یہ سمجھئے کہ تصنع ہے، تکلف ہے اور میں اس سے

دور رہتا ہوں۔ اللہ بس باقی ہوس۔

ایضاً
[۴۴]

ہاں وہاں یہ خط فقیر درد مندا سد اللہ کی طرف سے ہے اور اس یار خود پسند کو بھیجا جا رہا ہے جو دوستوں سے پرسشِ احوال بھی دریغ رکھتا ہے اور دور افتادہ عزیزوں کو خط سے یاد نہیں کرتا۔

اب یہ صورت حال بھی عجب تماشا ہے کہ ادھر دوست اس قدر لاپرواہ ہے اور اِدھر میں ہوں کہ اس درجہ ہوس پیشہ ہوں کہ خط بھیجتا ہوں تو یہ امید رکھتا ہوں کہ جیسے ہی میرا خط پہنچے گا وہ عزیز بے پرواہ جواب لکھنے بیٹھ جائے گا اور اسی دن یا پھر اگر ڈاک نکلنے کا وقت نکل چکا ہو گا تو اگلے دن ضرور اوّل وقت میں اسے روانہ کر دیا جائے گا۔

زہے تصور باطل زہے خیالِ محال

صاحب من۔ یہ دشوار طلبی نہ فکرِ فضول کے زُمرہ میں آتی ہے نہ افزوں سری اس کا باعث ہے بلکہ میرے رشتۂ امید میں جو گرہیں پڑی ہوئی ہیں ان کی کشائش کا خیال مجھے اس کشاکش میں مبتلا رکھتا ہے اور یہ کام میں تم سے لینا چاہتا ہوں۔ اس سے پیشتر سنا جا رہا تھا کہ نواب گورنر جنرل بہادر حسب دستور سفر کرتے اور انصاف فرماتے ہوئے اُدھر سے اِدھر آئیں گے اور دہلی پہنچیں گے۔ اور یہاں سے آگے بڑھ کر اس دیار کی طرف نہضت فرما ہوں گے۔ اور آفتاب کے برج حمل میں قیام کے وقت (موسم گرما میں)، کوکب گورنری پہاڑ کی طرف روانہ ہو گا جہاں وہ گرمی کے ایام گزارتے ہیں۔ نواب گورنر جنرل کی اس آمد و شد میں اطراف کے شہر و دیار سے لوگ آتے اور ملازمت اختیار کرتے ہیں اور ہر ایک کے معاملہ میں باقتضائے وقت کارروائی عمل میں آتی ہے۔

اب اچانک یہ خبر آئی ہے کہ گورنر جنرل کی سواری صرف الٰہ آباد تک آئے گی۔

اور بس ۔ اس معاملہ میں دو طرح کی باتیں لوگوں کی زبانی سنی جا رہی ہیں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نواب معلیٰ القاب الہ آباد تک آئیں گے اور وہیں سے کلکتہ واپس ہو جائیں گے، بعض افراد کا کہنا ہے کہ دو تین دن اس بقعہ زمین میں قیام رہے گا اور گورنر جنرل وہاں آرام فرما رہیں گے ۔

میرا دل اسی کشاکش میں گرفتار ہے اور اس شورش میں مبتلا جب اس کا سر رشتہ کہیں ہاتھ نہیں آتا تو کسی کی بات پر یقین بھی نہیں ہوتا ۔

سوچتا ہوں آپ اس ہنگامہ زار میں خود موجود ہیں اس وقت تک بہر نوع کوکبۂ گورنری الہ آباد پہنچ گیا ہو گا اور بلاشبہ آپ کو اس بات کا علم اور اس عزیمت سفر کا راز منکشف ہو گا' زنہار بے توجہی اور بے دلی سے کام نہ لیں اور جو آپ کو معلوم ہو وہ مجھے لکھ بھیجیں ۔ والسلام

ایضاً
[۴۳]

مخلص نوازا ۔ ایک عمر ہو گئی ہے کہ دلنواز نامے کے ورود نے مجھے حیات تازہ نہیں بخشی، لطف و عتاب آئینہ داران التفات ہیں اور اہل دل کے واسطے وہ پیمانہ ہائے ذوق ہیں کہ ایک دوسرے سے گوارا تر ہیں ۔ لیکن جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ طرز تغافل ہے کہ مجھ میں اس کے برداشت کی تاب نہیں ۔

جناب والا نہیں جانتے کہ آج کل آپ کے اس نیاز مند پر کیا گزر رہی ہے اور میرے وجود کا خشک کانٹا کس شعلہ سے نبرد آزما ہے اگرچہ تم نے اس کو سننے سے بے نیازانہ فراغت پالی ہے لیکن میں اس کے کہنے سے تو فارغ نہیں ہوا کسی نے کیا اچھی بات کہی ہے ع

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

مئی کی ۱۲ تاریخ تھی اور شمع و چراغ روشن کرنے کا وقت آ گیا تھا کہ محکمۂ ایجنسی کا اردلی پہنچا اور مجھے ولیم فریزر بہادر کا خط پہنچایا جب میں نے اسے میزان نظر

میں نے تولا تو وہ اس سے کہیں زیادہ وزن دار محسوس ہوا اُسے محض ایک خط کہا جا سکے۔

بارے ملفوف کو وا کیا تو پتہ چلا کہ اس میں میکناٹن صاحب کا خط بھی لپٹا ہوا ہے۔ مضمون یہ تھا کہ مقدمہ کے کاغذات کی پوری مثل نواب معلّی القاب کی نظر سے مکرّر گزری اور فرمان صادر ہوا کہ ہاکنس صاحب کی تجویز کو منظور کیا جاتا ہے۔ مرزبان میوات (رئیس فیروزپور جھرکہ کی) پیش مہر اور دستخط صحیح ہیں اور سرکار میں مندرج بندوبست غیر واضح اور نامکمل ہے اللہ! اب کوئی کیا کہے اور کیا نہ کہے خاندان کسرے میں بھی یہ داد گستری و انصاف پروری کہاں ہوگی۔

جس رات کو یہ شگرف نامہ مجھ تک پہنچا اس کی صبح کو یہ خبر گوش زد و سامعہ گداز ہوئی کہ مولوی محمد حسن خفیہ نویسی کے جرم میں ماخوذ ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اس سے متعلق خبروں نے بوقلموں شکلیں اختیار کر لیں۔ دہلی کے حسد پیشہ اور جواں مردی سے بیگانہ شہری جو کہ مولوی محمد حسن کا محبّ صادق الولا سمجھتے ہیں اس لیے انھوں نے یہ منجا رنبا یا ہے کہ ہفتہ میں دو بار تین بار میرے یہاں آتے ہیں اور طرح طرح کی دروغ بافیاں کرتے ہیں۔ اور ان کا ایک جھوٹ دوسرے جھوٹ سے زیادہ زہرناک اور زہرہ گداز ہوتا تھا۔

دو ہفتہ کے بعد میں نے بلیک صاحب کی زبانی سنا جو ایجنسی میں سکرترکے عہدے پر فائز ہیں، کہ شروع شروع میں جس جرم کے ارتکاب پر ان کو متہم کیا گیا تھا وہ انجام کار مولوی محمد حسن صاحب پر ثابت نہ ہو سکا لاجرم لارڈ صاحب نے ان کو ناخوشی کے ساتھ اپنے سے جُدا کیا اور معزول کر کے وطن واپس جانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

ایک طرف میں اپنے حالات پر افسردہ خاطر ہو رہا تھا دوسری طرف ایک مخلص دوست کی جدائی کا یہ مرحلہ پیش آگیا بس یوں کہو کہ ان حالات میں زندگی گزار رہا ہوں کہ میرے دل و دماغ بے طرح غم و اندوہ کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہیں میرا دل آتشِ حرماں سے جل رہا ہے اور آنکھیں "آنے والی کل" پر لگی ہوئی ہیں

ماہ جون کی ۲۲ تاریخ کو مولانا شملے سے یہاں پہنچے اور ایک کشتی میں فروکش ہوئے
جو ان کی آمد سے پہلے یہاں کرایے پر لیلی گئی تھی۔
میں نے یہاں پہنچ کر اس مجموعۂ خوبی سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ اُن
کے تئیں رخصت کی اجازت میں بھی خوبصورتی برتی گئی دو ماہ کی تنخواہ
بھی بطور پیشگی ادا کی گئی اور اسی کے ساتھ انھیں دفتر سے پروانۂ راہ داری
بھی مل گیا۔
قصہ مختصر یہ کہ اس پیکر مردمی کو خدا حافظ کہا اور کشتی نے لنگر اٹھا لیا اور
میرے دل کو ان کی جدائی کے احساس نے گھیر لیا۔ خدا ان کا نگہبان ہو اور مجھے
اس غم دل کے ساتھ سکون عطا فرمائے۔

ایضاً
[۴۴]

قبلۂ حاجات، دل نواز نامہ ایک لمبی مدت کے بعد نظر فروز ہوا اور مجھے عمر تازہ
بخشی تاکہ غم واندوہ میں بسر ہونے والی زندگی کی کوئی تلافی ہو سکے لیکن ایسے دل
کو خوش کرنا کہ جس کا خمیر ہی غم سے تیار کیا گیا ہو کوئی کار آسان بھی نہیں میں وہ ہوں
کہ جب تمہارا خط پہنچتا تو اچھل پڑتا تھا مستانہ وار رقص کرنے لگتا تھا اور اس
سے گویا جہان جہان مسرت حاصل کرتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ جیسے ہی نظر آپکے
صحیفۂ ولا سے دوچار ہوئی دنیا میری نظر میں تیرہ و تار ہو گئی۔ سب سے پہلے ــــ
جو کچھ سامنے آیا وہ ایک انتہائی آشوب انگیز خبر تھی کہ جس سے دل سے لے کر جگر
تک خون ہو گیا یعنی آپ کی خواہر عزیز کی موت کی خبر غم اثر ـ ہائے ہائے یہ وہی
مخدومہ مرحومہ ہیں کہ جب کلکتہ میں آپ نے ان کی بیماری کی خبر سنی تھی تو آپ بیقرار
ہو گئے تھے اور آپ کی خاطر عاطر پر سرتا سر سراسیمگی چھا گئی تھی۔ میں سوچ سکتا
ہوں کہ ان کے انتقال نے آپ پر کیا قیامت گزری ہوگی۔ یزدان پاک آپ
کو صبر و شکیب عطا فرمائے دل کو توانائی اور توفیق ثبات بخشے اور اس سانحہ

کو تمہاری عمر کے روزنامچہ میں تمام مکروہات کے خاتمہ اور تکلیفوں کا مقطع بنا دے

معلوم ہوا کہ میرے مخدوم کو اپنے نئے عہدہ سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ لاجرم یہ بات جان کر میرے دل پر غبارِ ملال چھا گیا۔ خدارا دل تنگ نہ کیجئے اور کلکتہ کو غنیمت سمجھئے۔ ایسی تازگی رکھنے والا شہر اس دنیا میں کہاں۔ وہاں کی خاک نشینی کسی دوسرے علاقے کی مسند آرائی سے زیادہ بہتر ہے، میں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ اگر میں خانگی ذمہ داریاں نہ رکھتا اور عیال داری کا طوقِ میری گردن میں نہ پڑا ہوتا تو ہر چیز کو جو یہاں ہے میں اسے گردِ دامن کی طرح جھاڑ دیتا اور اس بقعۂ زمین میں پہنچ جاتا۔ جب تک زندہ رہتا اس بہشت کدہ میں عمر گزارتا اور دوسرے مقامات کی ناخوشگوار آب و ہوا کی تکلیف سے آسودہ رہتا۔ وہاں کی سرد و خنک ہوا۔ وہاں کا خوش ذائقہ پانی اے سبحان اللہ! اس پر عمدہ شراب اور ثمر ہائے پیش رس۔

فرد ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد
غالبؔ آن انبہ بنگالہ فراموش مباد

(اگر تیرے دسترخوان پر بہشت کے تر و تازہ میوے بھی لگا دیئے گئے ہوں تب بھی اے غالبؔ تجھے بنگال کے آموں کو فراموش نہ کرنا چاہیئے۔

مخدوم کی تحریر سے معلوم ہوا کہ قبلۂ جان و دل مرزا احمد بیگ خاں نے ورد پہلو (ذات الجنب) سے بہت تکلیف اٹھائی اور جناب سید احمد علی خاں کے حسن تدبیر سے افاقہ کی صورت پیدا ہوئی۔ خدا کا ہزار ہزار شکر و صد شکر و ہزار در ہزار حمد و ثنا ان کے نام خط بھیجا جا رہا ہے ان تک پہنچا دیجئے اور میری جانب سے ان کی مزاج پرسی کیجئے۔ والسلام

ایضاً
[۴۶]

چار ماہ ہو گئے کہ آپ کے خطِ روشن جبیں کے نہ آنے سے میرے دن سیاہ ہو گئے ہیں لیکن میں کافر سمجھا جاؤں اگر اس پر آپ کی بے التفاتی و بے مہری

کے خیال نے میرے پیراہون خاطر کو مس کیا ہو۔ میں اسی کش مکش میں ہوں کہ آپ کا خط نہ پہنچنے کے بارہ میں آخر کیا سوچوں۔ نہ میں نے کوئی جرم کیا نہ آپ کی طرف سے تغافل برتا گیا، نہ محکمۂ ڈاک کے نظام میں کوئی خلل پیدا ہوا، اور نہ بظاہر راستہ کی دست برد کا اس میں کوئی شائبہ ہے۔

ان سب سے قطع نظر اگر آپ کے لیے سرکاری کاموں کی کثرت کا عذر تراشا جائے تو وہ بے جا نہ ہوگا۔ مگر خدارا یہ تو سوچیے کہ میں مکرمی مرزا احمد بیگ کے بارے میں کیا سوچوں اور ان کا خط نہ آنے کے بارہ میں خود کو کیا جواب دوں۔ طرح طرح کے خیال اور گوناگوں اندیشے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دل سودا زدہ مجھے بے چین رکھتا ہے۔ میں تو اس پر بھی خوشی کا اظہار کروں گا کہ مرزا صاحب نے مجھے ضرور بھلا دیا ہے لیکن وہ ہر طرح خوش و خرم ہیں۔

ایزد پاک نے مجھے کس پیدا کیا ہے اور آپ کو میرا غم خوار بنایا۔ اس کی قدرت سے یہ بھی بعید نہیں کہ وہ آپ کے دل میں میری محبت ڈال دے تاکہ آپ اپنے قلم سے چند سطریں لکھ دیں اور مجھے بھیج دیں اور کیا ہی اچھا ہو میری یہ آرزو جلد از جلد پوری ہو جائے اور ابھی یہ خط آپ کے پاس پہنچا بھی نہ ہو کہ خط تقسیم کرنے والا دروازہ پر آئے اور آپ کا والا نامہ مجھے سونپ دے۔

میری داد خواہی کا معاملہ ہنوز اس مرحلہ میں ہے کہ لارڈ ولیم کو نڈس بینٹنگ نے میرے مقدمے کے کاغذات دفتر دہلی سے طلب کیے اور انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ کارپردازان دفتر لکھتے ہیں کہ انھوں نے کلکتہ سے بھی کاغذات طلب کیے ہیں تاکہ وہ ان کے مطالعہ کے بعد کوئی آخری فیصلہ دے سکیں۔

اس کے باوجود میں اور میرا دل آئینہ دار راز ہے۔ وہ گواہی دے رہا ہے اس تفرقہ کو نظر میں رکھتے ہوئے جو حکومت کے قوانین پر گہرے طور سے اثر انداز ہوا ہے نیز اس کشاکش کے باعث جو میرے سررشتہ کار میں لگی ہوئی ہے اگر فی المثل میرے متعلق یہ حکم صادر ہو کہ مجھے قتل کر دیا جائے تو میرے لیے یہ بھی غیر متوقع بات نہ ہوگی

جب انصاف ہی دنیا سے اٹھ گیا تو پھر اب کچھ بھی ہو سکتا ہے اور جو ہونا ہے وہ ہو جائیگا
والسلام

ایضاً
[۴۶]

قبلہ و کعبہ ۔ والا نامہ پہنچا اور مرزا احمد بیگ کے فراق دائمی کی خبر ملی ۔ میں بھی کس قدر سنگ دل و سخت جان ہوں کہ ایک دوست کی وفات پر ماتم پرسی کے لیے خط لکھ رہا ہوں اور میرا وجود اپنے اجزا کے ساتھ ذرہ ذرہ ہو کر بکھر نہیں جاتا ۔

میرا یہ دوست کہتا تھا کہ میں دہلی آ رہا ہوں مگر اس وعدہ فراموش و بے مروت نے اثنائے راہ میں اپنی منزل سفر بدل کو بدل دیا اور سواری ناقہ کا رخ راہ عدم کی طرف موڑ دیا ' میں نے مانا کہ اُسے دوستوں کی خاطر داشت منظور نہ تھی اپنے خرد سال بچوں کا بھی خیال نہ کیا اور ان کے سر سے اپنا سایہ سمیٹ لیا افسوس ہے ان دوستوں پر جو اپنے ایک ایسے دوست کی دوستی سے محروم ہو گئے اور دل تڑپ اٹھتا ہے ان یتیم بچوں پر جن کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ۔

ہر چند موت پر رویا نہیں جا سکتا اور ہستی کے تار و پود کے بکھر جانے پر کوئی چارہ سازی ممکن نہیں لیکن انصاف بالائے طاعت ہے یہ مرزا احمد کے مرنے کا وقت نہیں تھا اس نے اتنا بھی صبر نہ کیا کہ میں کلکتہ پہنچ جاتا اور اس کے روئے نظارہ فروز کو ایک بار اور دیکھ لیتا اس نے اتنا بھی توقف نہ کیا کہ حامد علی جوان ہو جاتا اور اپنے اندازۂ دانش کے مطابق معاملات سے عہدہ برآ ہو سکتا ۔

افسوس کہ اس کا بڑا بیٹا بھی بہت چھوٹا ہے اور عین ممکن ہے کہ اپنے باپ کے اثاثہ و سرمایہ سے بھی ناواقف نہ ہو اور اس لائق نہ ہو کہ جہاں جہاں اس کا روپیہ پڑا ہے اسے دوبارہ حاصل کرے اور یہ خطرہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بعد وصولیابی کے جو سرمایہ فراہم ہو وہ اسے بھی اپنی نادانی سے برباد کر دے اور اپنے سے چھوٹوں پر یہ ستم روا رکھے اور اس طرح اس کے چھوٹے بھائی کو اس کا کوئی حق نہ ملے ۔

سچ یہ ہے کہ اس موقع پر کوئی امین اور حق شناس آدمی ہونا چاہیے کہ وہ زندگی کی اس راہ میں ان کی رہنمائی کرے اور جو بچے بے باپ کے رہ گئے ہیں ان کے سر پہ ہاتھ رکھے۔ اللہ اس کو جزا دے جس نے یہ کہا تھا۔

مرا باشد از درد طفلاں خبر
کہ در طفلی از سر برفتم پدر

(میں یتیم بچوں کے درد کو سمجھتا ہوں کہ بچپن میں میرے باپ کا سایہ بھی میرے سر سے اٹھ گیا تھا۔)

واللہ کہ ان بیچاروں کا خیال فرض بلکہ فرض عین ہے آپ اور مرزا ابو اسحاق خاں کو ان یتیموں کے حال پر نظرِ شفقت رکھنی چاہیے اور ذرا بھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ ایزد تعالیٰ احسان کرنے والوں کے اجر کو کبھی ضایع نہیں کرتا۔ والسلام

ایضاً

[۴۷]

قبلہ حاجات

گرامی نامہ کے ورود نے میرے تنِ بے جاں میں روح پھونک دی لیکن مرزا احمد مرحوم کی بہنوں کے دلِ آتش زدہ پر تو تشفی کا پانی نہیں چھڑکا۔ حامد علی اپنی پھوپیوں کے احوال پر کہ وہ اس سے بے حد محبت کرتی ہیں، آخر کیوں توجہ نہیں دیتا۔ اور خیر طلبوں کو اپنے رو کھے پھیکے سلام سے بھی کیوں یاد نہیں کرتا۔

عجیب تر بات یہ ہے کہ آپ ایسا ایک معقول انسان بھی حامد علی کو سعادت مند گردانتا ہے اور اس کی تعریف کرتا ہے بہر آئینہ آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں آپ اُسے سعادت مند خیال کرنا چاہیں تو بالکل کریں اور اس کی دل آزاری کو بھی رشد و سعادت میں شمار کر لیں۔

فرمان یہ ہے کہ جو کچھ غالب خونی نفس اپنے دردِ دل سے مجبور ہو کر لکھے اور اپنے سطر کی اشک خونناب سے نگار بندی کرے میرے مخدوم بہ انداز تماشا اس پر ایک

نظر ڈال لیں۔ بات یہ ہے کہ میرا نفس، بادہ پیمائی میں درنگ نہیں رکھتا۔ جس کے بارہ یہ سوچا جاتا ہے کہ اس نے بہت خونِ جگر کھایا ہے اور عالم عالم دل کے ٹکڑوں کو اپنے دامن میں بھرتا رہا ہے۔ اگر میں یہ چاہوں کہ اس سب داستان کو ورق ورق لکھ دوں تو میرا خط اتنا لمبا ہو جائے گا کہ اس کا ایک سرا کلکتہ سے جا ملے گا اور دفتر تمام نہ ہوگا۔

کیونکہ میرے مخدوم کو میرے نالہ ہائے زار سے دل چسپی ہے اس لیے میں نے یہ عہد کرلیا ہے کہ ہر خط میں ایک دو غزلیں لکھ کر بھیجتا رہوں گا تاکہ حکم بجا لا سکوں، آپ یہ فرمائیں کہ خط کو اس مرز بوم کے کس اخبار سے آراستگی دی جائے اب ایسا کیا لکھوں جو نہ کہا جا سکے کہتے ہیں کہ جب نادر شاہ نے سرزمین ایران پر تسلط حاصل کرلیا اور اس مبارک خطہ ارض کو اپنے جور و ستم سے ویران کردیا زمانہ کے مزاج دانوں اور پاداش عمل کے رمز شناسوں نے یہ کہا تھا کہ نادر دراصل ہمارے ہی اعمال نامہ ہے اور ہماری بدکرداری کا نتیجہ

زشتیٔ اعمال ما صورتِ نادر گرفت

اسی طرح ہمارے دور میں حاکم حقیقی اور داور تحقیقی نے اپنے خاص فرمان کے ذریعہ میری نام طبعی اور بد خصلتی اور تباہ کارانہ ہوس پیشگی کو ایک قالب میں یک جا کردیا ہے بعد ازاں اسے آتشِ غضب میں پگھلا کر ایک ایسے انسان کی شکل دیدی ہے جو میانہ قد اور بزرگ شکم ہے اور اس آدم صورت دیو زاد نے مجھ پر زہر بلا کی بارش شروع کردی اور نتیجتہً میرے وجود و ہم سے فنا کا دھواں اٹھنے لگا۔

وہ ہندوستان میں اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا ہے اور کوہ و دشت کی ویرانیوں کی سیر کر رہا ہے۔ مرحلہ بمرحلہ اور منزل بہ منزل آتش بیداد بلند ہو رہی ہے اور خلقت کے جان و مال کو اس میں بصورت اسپند ڈالا جا رہا ہے۔

اب سمندر ئے ابر رحمت اٹھے اور اس سرزمین پہ برسے جب ہندوستان کہہ کر یاد کیا جاتا ہے اس آتش بے زنہار کا بجھنا ایک امر محال ہے یہ ان لوگوں کے لیے ایک

خبر ہے جن کی طبیعت معنی یاب ہے اور جن کی نگاہ رمز شناس لیکن جو صورت پرست اور ظاہر بین ہیں ان کے لیے واشگاف انداز میں بیان کرتا ہوں۔ لارڈ کونڈس ہیٹنگ بہادر نے تیسری مرتبہ دہلی میں نزولِ اجلال فرمایا اور باریابی کی خوش خبری لوگوں کے گوشِ سماعت تک پہنچی۔

شہر کے بڑے لوگ، وظیفہ دارانِ حکومت سرکاری مشاہرہ پانے والے اور زمرہ زبانانِ ریاست بار یاب ہوئے عطر و پان سے تواضع کی گئی۔ غالب آزادہ خو، کہ اپنے اعمال کی صورتِ معقول کا مارا ہوا ہے اس دربار میں حاضر نہ ہوا اور اس ہنگامہ زار میں شرکت سے باز رہا محیط بحر کی طرف سے ابرِ رحمت کے نزول کی بات نئے گورنر جنرل کی آمد کی طرف اشارہ ہے۔)

والسلام

ایضاً

[۴۸]

زنہار صد زنہار۔ اے مولوی سراج الدین خدا سے ڈرو کہ آفریدگارِ عالم ہے۔ جب قیامت قایم ہو اور روزِ جزا کا مالک اپنے تختِ جلال پر متمکن اور میں فریاد کرتا اور اپنے بال نوچتا ہوا وہاں حاضر ہوں تمہارا اگریباں گیر ہو جاؤں اور دادِ محشر سے کہوں کہ یہ وہی شخص ہے جس نے تمام عمر مجھے اپنی محبت کا فریب دیا اور میرے دل کو اپنے قبضہ میں رکھا۔

جب میں نے انتہائے سادگی سے اس کی وفاداری پر تکیہ کیا اور اُسے اپنے دوستوں میں شمار کرنے لگا تو اس نے میرے ساتھ کج خلقی و جفا پیشگی اختیار کر لی۔ ذرا سوچو تو سہی اس وقت تم کیا جواب دو گے اور کیا عذر پیش کر سکو گے۔ میرے حال پر افسوس ہے کہ ایک زمانہ بیت گیا اور مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ سراج الدین احمد کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

اگر یہ جفا و وفا پیشگی کی سزا ہے تو بسم اللہ جتنا جی چاہے اس سزا کو بڑھا دو

کر یہاں مہر و وفا کی بھی اتنی ہی فراوانی ہے اور یہ تغافل اگر کسی دوسرے جرم کی سزا ہے تو سب سے پہلے مجھے یہ معلوم ہونا چاہیئے پھر تم آزاد ہو جتنا چاہیے انتقام لو تاکہ شکوہ کا بھی کوئی موقع نہ رہے۔ میں وہ ہوں کہ میری معاش گوناگوں عذابوں کی وجہ سے کفار کی معاد سے بھی بدتر ہے۔ میرا جگر خون ہو رہا ہے اور میرے دل میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میرے پیرہن میں کانٹے بھر دیے گئے ہیں اور خاک نشینی میرا مقدر بن چکی ہے خدا نہ کرے کہ کسی کافر کو بھی دوسری زندگی میں ایسی کوئی سزا ملے اور میرا کوئی دشمن یہ رسوائیاں برداشت کرے۔

میری مثال اس تنہا مسافر کی سی ہے جس کا پیر دلدل میں پھنس جائے اب جتنا جتنا وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنا پیر، اس دلدل سے باہر کھینچے اتنا ہی وہ اس میں اور دھنستا چلا جاتا ہے۔

والا قدر نواب امین الدین خاں بہادر نے دکہ میں ان کے چہرۂ روشن میں اپنی دنیائے آرزو کا عکس دیکھتا ہوں اور ان سے ملاقات کو اپنی زندگی خیال کرتا ہوں) کلکتہ کا سفر اختیار کیا ہے۔ اب میں ان کی خدمت میں موجودگی میں، اپنی زندگی سے کاہے کو پیار کروں اور اپنے دل کو کس کے دیدار سے شادمانی بخشوں۔

میری واماندگی کا تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ میں ان کا ہم سفر بھی نہیں بن سکا اور ان کے تنہا سفر کلکتہ کو گوارا کیا۔ امین الدین خاں مجھے کہتے تھے کہ میں اپنے کسی دوست کا پتہ ان کو بتلا دوں کہ جب وہ اس دیار میں پہنچیں تو میرا ایسا کوئی دوست میری جگہ ان کا غم خوار ہو۔

میں نے کہا سوگند بخدا کہ مولوی سراج الدین کے سوا میرا اور کوئی ایسا دوست نہیں جو یہ کام کر سکے اور جس کے بارہ میں میرا دل مطمئن ہو سکے چنانچہ میں نے تمہارے نام ایک خط لکھ کر ان کو دیدیا ہے امید کہ وہ تم سے ملیں گے اور تم ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ گے کہ تنہائی کا غم ان کے دل سے دور ہو اور وہ تمہیں میری جگہ خیال کریں۔ والسلام

ایضاً
[۴۹]

میری زندگی میری جان — گرامی نامہ پہنچنے کے بعد (میں) اس خیال میں تھا کہ جواب تحریر کروں اور اپنے قصّہ کو بیان کروں، اچانک کل کہ دوشنبہ کا دن اور ماہ ذی الحجہ کی پندرھویں تاریخ تھی یہ خبر مشہور ہوئی کہ اخلاق خوبیوں کے مجموعے کا شیرازۂ وجود بکھر گیا۔ ایوان سروری کی شمع بجھ گئی۔ آگہی کے باغ کا شجر بے برگ و بار رہ گیا۔ درماندوں کی دستگیری کرنے والے کا ہاتھ سو گیا اور لوگوں کے عقدۂ مشکل کی گرہ کشائی جو ناخن کیا کرتے تھے ان میں وقت نے کیل ٹھونک دی۔

میرے منہ میں خاک اگر میں یہ کہوں اور نہ کہوں تو بہر حال ہر شخص یہ جانتا ہے کہ "مسٹر اندرو اسٹرلنگ" کا انتقال ہو گیا۔ دنیا سے نیک نامی کے سوا کوئی چیز اس نے اپنے ہمراہ نہیں لی۔ کاش کہ میرے کانوں میں روئی جلاکر بھر دی جاتی تاکہ میں اس بری خبر کو سننے سے بچ جاتا۔ اب میں غم خواری کی امید کس سے رکھوں اور کس کی گردشِ چشم کا خیال مجھے تسکین دے۔

جو رپورٹ کہ فرانسس ہاکنس بہادر نے خصوصیت کے ساتھ میری داد خواہی کے بارہ میں صدر میں بھیجی ہے کیا کہوں کہ وہ کس حد تک امیدوں کو گھٹانے اور غموں کو بڑھانے والی ہے۔ اب میں کس کی کارسازی پر تکیہ کروں کہ وہ وادیٔ خطا کا سیک خرام تو گزر گیا۔ آج تو آسمان ششش جہت سے میری دشمنی میں لگا ہوا ہے۔

زنہار اس خط کے جواب میں دیر نہ کریں اور لکھیں کہ اس والا گہر کو کیا پیش آیا اور اس کے بعد اس کے دفتر کے کاموں کی انجام دہی کا کیا رہا۔ اس کی جگہ کس نے لی۔

اللہ بس باقی ہوس۔

ایضاً
[۵۰]

کل کہ اکتوبر کی (سنہ!) گیارہ اور جمادی الاوّل (سنہ!) کی چار تاریخ تھی۔

بست و نہم (۲۹) ستمبر کا لکھا ہوا والا نامہ بمعہ ایک لفافہ کے ملا جس میں آئینۂ سکندر کے اوراق ملفوف ہونے چاہیں لیکن ان اوراق کو جتنا میں نے تلاش کیا اتنا ہی مجھے ناکامی ہوئی۔ ورق اشتہار کے سوا ان میں اور کچھ نہیں میری کچھ سمجھ میں نہ آیا غالباً ایسا ہوا کہ جب خط کو تہہ بتہہ کر کے رکھا جا رہا تھا تو اوراق آئینۂ سکندر کو آپ بھول گئے۔

کہنا یہ ہے کہ میں اس اخبار کے رواج میں اس سے کہیں زیادہ کوشاں ہوں جتنا کہ اس کے بارہ میں کچھ کہنا ممکن ہے لیکن اتنی جلدی اس مراد کو حاصل کیسے کیا جاسکتا ہے؛ ان دنوں میں داور کلاں (گورنر جنرل) کی آمد آمد کی خبر نے اطراف وجوانب کے وکلا کو پریشان کر دیا کچھ تو اپنے مقرر کرنے والوں کی طرف واپس لوٹ گئے، اور کچھ لوگ جانے کی تیاریوں میں ہیں۔ اب جب تک کہ یہ آشوبِ فتنہ فرو نہ ہو اور یہ پردہ نگاہوں کے سامنے سے نہ اٹھے میرے مقصد کے حصول کی بظاہر کوئی شکل نہیں۔

دہلی کی عدالت میں میرا کام بگڑ چکا ہے یہ تمہیں بھی معلوم ہے اب میں اس خیال میں ہوں کہ اگر موت امان دے تو میں پھر وہیں پہنچوں اور اپنے دردِ دل کی حکایت اس جاں گداز نغمہ کی صورت میں پیش کروں کہ مرغان ہوا اور ماہیاں دریا میرے حال پر فریاد و فغاں کرنے لگیں؛ افسوس اگر میری معاش یہی پانچ ہزار روپے اسی تفریق کے ساتھ ثابت ہو جیسا کہ دفترداران سرکاری کی رو سے ثابت کی جا رہی ہے (جو سادہ لوح ہیں اور جنھیں انصاف پسند و معدلت آثار کہتے ہیں)

ایسی صورت میں صاحبانِ صدر کو مجھے اپنے دربار سے نکال دینا چاہیے تھا اور کہنا چاہیے تھا کہ یا وہ گوئی اختیار نہ کرو جتنا کہ تمہیں مل رہا ہے اس سے زیادہ کے تم مستحق نہیں اور قرارداد بھی دراصل یہی ہے۔

میں دیوانہ تھا اگر اس پر بھی اس کشور کی طرف واپس آتا اور اپنے خویشوں اور قرابت داروں کے ساتھ جھگڑا کرنے کے لیے کھڑا ہوتا لاجرم میرا شمار ہرزہ کاروں

میں ہوتا اور میں دیوانگی پیشہ کہلاتا۔

سخن کوتاہ، نصراللہ خاں کہ میاں جی گری وطلب اعانت کے باب میں بجارج سوئنٹین بہادر سے خاص ہدایت ورعایت رکھتا تھا، اس بات کو میرے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ لیکن میں کروں کیا کہ اب تو ساری بساط ہی الٹ گئی اور ادھر کی دنیا اُدھر ہو گئی۔

اب اگر کوئی توقع ہے تو یہ کہ خدا ترس اور میرے دردِ دل کو جاننے والے مسٹر کول برک بہادر، کرنل ہنری املاک کے توسط سے مجھ پر مہربان ہو جائیں، اور ایک ایسی رپورٹ کہ اس سے بہتر کسی رپورٹ کا تصور نہ کیا جا سکے صدر میں بھیجدیں اور ایسا جواب حاصل کر لیں کہ اس سے خوب تر کسی جواب کی توقع نہ کی جا سکے۔

سبحان اللہ ابھی یہ جواب راہ میں ہو اور کول برک بہادر معزول ہو جائیں اور مسٹر ہاکنس ان کی جگہ آجائیں اور جو تحریر ایک سلطنت کے ہنگامہ کی برہم زدگی کے لیے کافی ہو وہ میرے معاملہ میں بطور رپورٹ صدر میں روانہ کریں۔ مجھے یہ امید ہو کہ صدر میں مسٹر اسٹرلنگ موجود ہیں، وہ میرے مددگار ہونگے۔ ہنوز یہ رپورٹ صدر میں پہنچی بھی نہ ہو کہ مسٹر اسٹرلنگ راہی ملک عدم ہو جائیں۔

جب میں ہر طرف سے رشتہ امید کو منقطع کر کے جارج سوئنٹین بہادر کا دامن پکڑوں، تو وہ فوراً ہی شغل جہاں بانی سے دامن کشی اختیار کریں اور ولایت کے سفر پر روانہ ہو جائیں۔ اللہ اللہ، معزول نہ ہو مگر کول برک، مرگ ناگاہ کا شکار نہ ہو مگر اسٹرلنگ بہادر اور سفر ولایت در پیش نہ ہو مگر جارج سوئنٹین بہادر کو اور ان خدمات جاں کاہ کو برداشت کرنے کے لائق نہ ہو مگر اسد اللہ داد خواہ۔

اب میں اسی میں مصلحت دیکھتا ہوں کہ آپ اس دادری وداد گستری سے قطع نظر فرمائیں اور میرا وکالت نامہ کہ منشی نصراللہ خاں کے پاس ہے ان سے واپس لے لیں اور اسے پارہ پارہ کر دیں اور ان سب سے گزر جائیں۔ اللہ بس ما سوا ہوس۔

ایضاً

[۵]

مولائے من۔ آج کل زمانے کے غم مجھ پر بے طرح مسلط ہو گئے ہیں اور زندگی کی سختیاں بڑھ گئی ہیں۔ اگر میں چاہوں کہ اس میں سے کوئی حصہ حوالۂ قلم کردوں تو قلم میں حرکت باقی نہ رہے انہی لمحات میں ایک شخص کہ میرا شناسا ہے دروازے سے آیا اور اس نے گرامی نامہ مجھے سپرد کیا خدا جانتا ہے کہ اس صحیفۂ محبت کے مشاہدے نے مجھے اپنا پرستار بنا لیا، کہ جیسے آسمان نے پائے آرزو کی کج روی کو اور ستاروں نے ناساز گاری کے دستور کو چھوڑ دیا ہو۔ میں یہ سوچ کر بہت خوش ہوا کہ زمانہ مجھے مسرتیں بخشنے میں اتنا دل تنگ نہیں ہے پھر بھی آسمان یہ خیال تو اپنے دل میں رکھتا ہے کہ وہ مجھے غموں کی قید سے زیادہ خستہ جاں بنا دے۔

مجھے معلوم ہوا کہ میرے مخدوم کا دل زمانے سے خوش نہیں ہے۔ یہ جان کر، بارے اندوہ خاطر کی گرانی دل کی پریشانی بڑھ گئی، اور خیالات کچھ زیادہ پراگندہ ہو گئے۔ اب میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے روز افزوں پریشانی مبارک ہو اور میری خاطر کے لیے یہ لحظہ بہ لحظہ بڑھنے والی تشویش ارزانی رہے اس لیے کہ آپ کو تو یہ عادت ہی نہیں کہ خط جلدی جلدی لکھیں اور غالب بے نوا کو یاد فرماتے رہیں میں کیا کروں جس سے مجھے انجام کار معلوم ہو جائے اور جو کچھ وہاں پیش آرہا ہے وہ میری نظر میں ہو۔ صاحب آپ سادہ پُرکار ہیں۔ ہر طرح اپنی نگہداری کرتے ہیں اور اس کے باوجود کہ دوست کا خط آجاتا ہے اسے نادیدہ خیال کرتے ہیں آپ، ہی بتائیے کہ اس بے چارے کو شکوہ ہائے بیجا کے شکنجے میں بری طرح کسنا کس ملک کی رسم اور کن لوگوں کا شیوہ ہے۔

اس سے پہلے میں ایک ورق حضرت مولوی آل حسن صاحب کے فرمان کے جواب اور حضرت قاضی محمد خاں کے خطاب فرمائی کے بدلے میں تحریر کر چکا ہوں اور بہ سبیل ڈاک اس کو روانہ کر دیا ہے۔ یہ خط کہ جس کے پہنچنے کی اطلاع میں سپرد قلم کر رہا ہوں

اس میں میرے خط کے ورود کے بارے میں لیکن کوئی سطر میرے بارے میں موجود نہیں. میں نے اس میں اپنی کوتاہ قلمی کے ضمن میں بہت کچھ لکھا تھا. ہنوز وہ قلم جو اس صفحہ کی نگارش میں کام آیا تھا اسی طرح فرسودہ ہے. آپ کی زبان سرزنش میں تیز اور آپ کے لب شکوہ سنجی میں گستاخ ہیں. سبحان اللہ کیا کہنا ہے اس ستم ظریفی کا اور کیا خوب ہے آپ کی حق شناسی۔

والا گوہر جناب محمد حمید الدین خاں صاحب جو آپ کی خدمت میں پہنچ رہے ہیں اور جن کی معرفت میرا یہ خط آپ تک پہنچے گا اگر آپ ان کو میری جگہ شمار کریں تو کتنا اچھا ہو. مخفی نہ رہے کہ حمید الدین خاں عمائد روزگار اور روسائے والا تبار میں سے ہیں ان کے بزرگ ہندوستان کے شاہان سلف کے ذی مرتبہ امرا اور بلند اقبال رؤسا میں سے تھے اور شیخوپورہ اور اس کے آس پاس کے علاقے پر یہ سلاطین وقت کے فرمان کے بموجب حکومت کرتے رہے ہیں اور اپنی جاں فشانی و اعلیٰ کارگردگی کی وجہ سے انھیں بلند خطابات اور اعزازات سے نوازا گیا۔

ان کے بڑے بھائی محمد نجف صاحب دیارِ دہلی میں رہائش اختیار کر چکے ہیں اور میرے ساتھ خلوص و محبت کا رشتہ رکھتے ہیں۔۔۔۔ ان کی زبان اور ان کا دل الگ الگ نہیں ہیں. آج کل میں جن مصیبتوں اور پریشانیوں میں زندگی گزار رہا ہوں اگر اس میں میرے لیے مسرت و شادمانی کا کوئی پہلو ہے تو وہ ان کا دیدار ہے جب انھوں نے اپنے اس بھائی کے الٰہ آباد کی طرف جانے اور ان کی خوبیوں کو میرے سامنے ظاہر کرنے کی بات چھیڑی تو اس سے پیشتر کہ وہ یہ خواہش کریں میرے دل میں یہ بات آئی کہ میں آپ کے ساتھ عہدِ وفا تازہ کروں اور ہر طرح سے التفات اور مہربانی کا جو سرمایہ اس مدت میں آں مخدوم کے ضمیر خیر کے گنجینہ میں میرے لیے اکٹھا ہوا ہے اور جس طرح کی فہرست میں نے اپنے خیال میں ترتیب سے رکھی ہے جی چاہتا ہے کہ وہ سب اس والا تبار دوست کا حصہ بن جائے. اور یہ وہاں رہتے ہوئے اندوہِ تنہائی کے شکستہ خاطر نہ ہوں. ان کے کام کو آپ میرا کام سمجھیں اور جتنا وقت آپ کو مل سکے اس

میں آپ ان کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آئیں۔ نسخۂ "پنج آہنگ" کہ آوارہ خرامی کرنے والا میر قلم اس کی طلب میں دوڑ دھوپ کرتا رہا وہ چند روز کے بعد آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ بشرطیکہ آپ ازراہِ کرم میری پریشاں خاطری کا خیال فرمائیں اور مجھے اپنے حالات سے آگاہ کریں۔ خدا کرے کہ اقبال و دولت آپ کے زیرِ فرمان رہیں اور آسمان آپ کے مقصد کے خلاف کوئی جنبش نہ کرے۔

ایضاً

[۵۲]

مخدوم و معظم حضرت مولوی سراج الدین احمد کی خدمتِ والا میں اسد اللہ نامہ سیاہ کا سلام قبول ہو۔ وہ سلام جس سے زمین سے آسمان تک کی فضا شکوہ سے بھر جائے اور سننے والے کو غصہ آجائے۔ اگر بنائے تغافل کسی مصلحت پر ہے تو خوش ہو جایئے کہ آپ مجھ سے چھٹکارا پا جائیں گے اور اگر دیوانگی کا یہ انداز بیگانگی کے باعث ہے تو آپ پر افسوس ہے کہ آپ نے کیسا محبت کا رشتہ توڑ دیا

آپ خط نہیں لکھ سکتے مگر یہ تو کر سکتے ہیں کہ آمد آمد کی خبر اخبار "آئینۂ سکندر" میں چھاپ دیں تاکہ میں آئندہ توکوئی توقع رکھوں اس طرح مجھے امیدوار بنائے رکھنے میں کیا تکلیف ہے۔ اس لیے زبان جو چراغ و شمع کے بجھ جانے کی خبر ہے اور اس کا مطلب ہے کہ ستارۂ روز کے طلوع ہونے کا وقت آگیا۔ جس نے شمع و چراغ کا جلوہ نہیں دیکھا اگر وہ آفتاب درخشاں کے طلوع ہونے کا منظر دیکھے تو اس سے زیادہ حیرت کی بات اور کیا ہوگی :تازہ ترین غزلیں بھیجنے کے بارہ میں جو فرمائش کی گئی تھی اس کا حکم ہنوز میرے دل پر رواں ہے۔

جب تک کہ زخمِ دل مصروفِ خوں فشانی تھا ناخنِ فکر کا پیشہ جگر کاوی تھا۔ دل و دماغ جس طرح پیچ و تاب میں تھے اس کی وجہ سے غزلِ تازہ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اب کہ مجھے اپنے سے طرح طرح کی رنجشیں اور آویزشیں ہیں قافیہ سخن سنجی تنگ ہے۔

میں وہ ہوں کہ زمانہ سے اگر مجھے ذرا بھی آسایش میسر آجاتی تو اپنی قدرت فکر سے میں ارباب سخن کا پنجہ موڑ دیتا (اہل سخن سے بازی لے جاتا) افسردگیوں کے ساتھ جو اشعار زبان قلم پر آئیں گے وہ اس غرض سے سپرد قلم کیے جائیں گے کہ نگاہ التفات کے روشناس ہوں۔ خدا کرے کہ میرے مخدوم اپنی اس عادت جسے تغافل کہا جاتا ہے، شرمندہ ہوں۔ والسلام

ایضاً

[۵۴]

فرد ہر نسیمے کہ ز کوئے تو بجا کم گزرد
یادم از ولولۂ عمر سبکسار دہد

نسیم صبح گاہی کا ہر جھونکا جو تیرے کوچہ سے آتا اور میری خاک سے گزرتا ہے، مجھے میری عمر کی سبکساریوں اور ولولہ انگیزیوں کی یاد دلاتا جاتا ہے۔

نامۂ مہر افزا کے ورود نے میری دل ربائی کی اور جان تازہ بخشی اگرچہ یہ جان میرے ساتھ ہے اور اس خط پر نچھاور کرتے میں صرف ہوگئی لیکن دل ربائی اور جان بخشی دونوں کی سپاس باقی ہے اور جب تک ایزد پاک کی بخشی ہوئی جان میرے تن میں ہے شکر گزاریوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

میرے مخدوم آپ میرے پہلے خط کے پہنچنے کے باب میں دودل کیوں ہیں ابھی تک اس کی آمد کی خوشی میرے دل میں اہتزاز پیدا کر رہی ہے اور صحیفہ کا سواد اور سطریں میری آنکھوں میں بسی ہوئی ہیں چونکہ فرمان یہ تھا کہ غالب "خود ناشناس" پارسیوں کے عمدہ رسوم و آداب کے بارہ میں کچھ کہے اور ایسی کسی کتاب کی نشاندھی کرے کہ زرتشتیوں کے دیرینہ مذہب اور ان کی قدیم زبان کے متعلق اس کے اوراق سے کچھ معلوم کیا جا سکے۔ میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں اس فرمایش کی تعمیل کے ساتھ مکتوب عالی کا جواب تحریر کر سکوں۔

زمن گزر بیخودی، ورد صل رنگ از بوئے نشناسم

بہر یک شیوہ نازش، بازی خواہد جوابش را

(مجھے کہ میں وصل کے لمحوں میں انتہائے بیخودی کے باعث رنگ اور بو میں کوئی فرق نہ محسوس کر سکا جب کہ اس کی ہر ادا پر اس کا ناز اپنا جواب چاہتا تھا)

چونکہ آپ نے دوبارہ بھی تحریر فرمایا ہے لاجرم لبوں کی مہر خموشی کو توڑ کر اور شرم و نادانی کے حجاب کو درمیان سے ہٹا کر عرض کرتا ہوں اس خواہش کو پورا کرنے کی توقع ہر شخص سے نہیں رکھی جا سکتی اور اس کی پژوہش وصول کا بند اپنے دل و دماغ پر لگا کر خود کو خستہ و درماندہ نہیں بنایا جا سکتا"۔ "دبستان المذاہب" کا مصنف پارسیوں کی تاریخ ایران کی تہذیب سے آشنا روئی کے باوصف جو کچھ کہتا ہے نہ وہ صحیح ہے نہ اُسے کافی و شافی سمجھا جا سکتا ہے۔

جو پارسی بندر سورۃ اور بندرگاہ بمبئی میں رہتے ہیں زنہار یہ خیال نہ کیا جائے کہ ان میں نام و نشان کے ماسوا پارسیان قدیم کی کوئی اور خو بو باقی ہے نہ وہ روش ہے نہ پرواز وہ گفتار ہے نہ وہ کردار ان کی نسل سے تعلق رکھنے کی دعوے داریوں سے قطع نظر اور کوئی بات ان میں ایسی نہیں جسے ان کے اسلاف کی خوبیوں سے نسبت دی جا سکے۔

پارسی کبھی منتخبانِ روزگار میں سے تھے اور وقت نے اُن کو برگزیدہ بنایا تھا اپنی فرماں روائی کے دور میں وہ دانش سود مند اور دستور ہائے خرد پسند رکھتے تھے وہ ستارہ شناس تھے اور آفرینش کو وہ ہفت افلاک کی گردش و خرام سے وابستہ کرتے اور نمود ہستی کو مہر و ماہ کی حرکات سماوی سے نسبت دیتے تھے۔

انھوں نے پردۂ خاک سے تابندہ لعل و جواہر نکالے جن کا ہنر انھیں خوب آتا تھا، وہ رگِ تاک سے مئے ناب افشردہ کرنا جانتے تھے وہ خستگی و رنجوری کے معنی سمجھتے تھے اور صحت و تندرستی کے احکام اور چارہ گری کے فن سے واقف تھے انھوں نے جہاں بانی و فرماں روائی کے ضابطوں کی فہرست مرتب کی تھی اسی طرح وہ فرماں پذیری و بندگی کے دستور کی حد بندیوں سے بخوبی آگاہ تھے۔

ان پارسیانِ قدیم نے رنگا رنگ کہرباؤں کے اسرارِ کشش کی عنوان بندی کرلی تھی اور گوناگوں ہنرمندیوں کے معیاروں کو بہتر بنا دیا تھا۔

مختلف بیماریوں کے جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے کے طریقے انھوں نے دریافت کرلیے تھے۔ ہوا میں اڑنے والے پرندوں اور دشت پیمائی کرنے والے درندوں کے شکار کی بہترین ترکیبوں کو انھوں نے ماہرانہ صورت بخش دی تھی سخن کوتاہ ہر طرح کی دانش و بینش اور آفرینش و وجود کے مسائل ان فرزانوں کے اندیشۂ خیال میں موجود تھے اور رفتار و کردار کے شایستہ انداز اور حسنِ معاشرت کے آداب و رسوم انھیں باندازۂ بایست آتے تھے جن کے اب تھوڑے سے حصہ پر بھی ناز کیا جا سکتا ہے یہ انھیں کی دانش و فرہنگ کا تحفہ ہے جو بعد کی نسلوں کو ملا ہے۔

خسروانِ پارس کے خزانوں میں ہر علم و فن کے دفتر موجود تھے اور ہر دفتر گراں مایگی کے لحاظ سے لعل و گوہر کے بہترین خزانوں سے زیادہ بیش بہا اور گراں ارز تھا۔

جب اس گروہ کی جہاں داریوں کا دن بے نور ہو گیا اور سکندر ابن فیلقوس یونانی کے لشکر نے ان پر تسلط حاصل کرلیا تو شاہی کتب خانے تاراج کر دیئے گئے لیکن جو کچھ ادھر ادھر پراگندہ تھا اور گمنام افراد اور خاندان جسے اپنے گوشہ و کنار میں سمیٹے تھے وہ باقی رہا۔ یہاں تک کہ عربوں کی فتوحات اور حکمرانی کا زمانہ آگیا۔ اس کوشش و کاوش میں ہر جگہ سے یہ سرمایہ بھی اکٹھا کیا گیا اور خلیفہ کے حکم سے اس ذخیرہ کو بغداد کے حماموں کو گرم کرنے کے لیے برسوں آگ میں جھونکا جاتا رہا یہ کہہ کر آذر پرستی کے احکامات آگ ہی کی طرف واپس لوٹا دئے گئے۔

عرب کے زبان آوروں نے فارسی کو عربی سے ملا دیا اور اس سے ایک نئی زبان پیدا کردی۔ اب کون ہے جو اس زبان میں کہ موتی پرونے کے لائق تھی، خود درستی کے ساتھ کچھ لکھ سکے اور اس دیرینہ آئین کے بارہ میں صحیح صحیح کوئی خبر دے سکے۔ اس راز کی جستجو کرنے والے کا دلی مقصد پورا نہیں ہوتا اور میرا تو یہ بھی دعویٰ ہے کہ جستجوئے فراواں کے بعد جو حاصل ہوگا وہ ایسا کچھ نہ ہوگا جس پر

طمانیتِ خاطر کا اظہار کیا جا سکے۔

میری جانب سے میرے مخدوم و مطاع مولوی آلِ حسن صاحب کی خدمت میں سلام پہنچے اور جو کچھ میں نے کہا ہے اسے دوبارہ کہیں اور جو میں نے لکھا ہے وہ انھیں دکھلائیں دوسرے یہ کہ قلم شکبار سے تحریر فرمایا گیا ہے کہ میں اپنی گفتار ناروائی سے اشعار منتخب کر کے بھیجوں اور اپنے واردہ حیات کے بارہ میں کچھ تحریر کروں۔ اس نے میرے اندیشہ کو لب گزینی پر مجبور کیا اور مجھے حیرت میں ڈال دیا۔

فرد۔ چہ گویم از دل و جانے کہ در بساط من است
ستم رسیدہ یکے ناامید وار یکے

میں اس دل اور اس جان کے بارے میں کیا کہوں جو میری زندگی میں مجھے ودیعت کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ستم دیدہ ہے اور ایک ناامید و نامراد۔

میں یہ کیسے سوچ سکتا ہوں اور یہ مرتبہ مجھے کس طرح میسّر آ سکتا ہے کہ ستودہ صفات افراد میری تعریف کریں اور میرے اشعار کو تذکرۂ شعراء میں جگہ دیں۔ فرجام خردمندی یعنی آثارِ ہستی میں سے (کہ آشکارا بینوں کے نزدیک ہمہ وقت معرضِ زوال میں ہے یکتا گزینوں اور بلند نگاہوں کے لیے بے نمود و بے بود ہے) جو سردیٔ رگ پیدائی مجھے بخشا گیا وہ یاوہ گوئی کرنے والی زبان یا پھر بیہودہ گام فرسائی کرنے والا قلم ہے۔ میری ناسمجھی کی مثال کچھ ایسی ہی ہے جو بچوں کی ہوتی ہے کہ خزف ریزوں سے دام و درہم بناتے ہیں اور اپنی خزینہ داری پر ناز کرتے ہیں۔ میں نے اپنے سرودِ رفتہ اور گفتارِ ناسزا کو ریزہ ریزہ جمع کر کے تمنائے نام آوری کے ساتھ ترتیب دیا تھا لیکن اس کی ناروائی کے اندوہ آگیں خیال سے میرا دل خون ہوتا ہے۔ بہرحال اس کے نسخے اِدھر اُدھر احباب کی نظر گاہِ التفات میں پیش کرنے کی غرض سے بھیج دیے گئے ہیں۔

اب جو بزرگ غالب مستمند کی پرسش کی طرف توجہ فرما ہوں گے وہ جو غزل چاہیں گے ان اوراق میں سے نکال کر پڑھ لیں گے۔ انصاف بالائے طاعت (ہے) انتخاب اشعار

جمع کرنے والے کی رائے اور طبیعت کی رسائی پر منحصر ہوتا ہے نہ کہ شاعر کی مرضی اور صواب دید پر خاص طور پر جب کہ قاضی محمد صادق خاں ٗ وہ خوش ذوق شخص ہیں کہ شاعری ان کی والا طبعی سے ہم آہنگی کا شوق لے کر آسمان سے اترتی ہے اور نامۂ نگارش اپنے نقوشِ خرام بجذبہ سپاس شناسی کے ساتھ ان پر نچھاور کرنے میں فخر و مباہات محسوس کرتا ہے۔ میں اِس شادمانیٔ سخن پر کس قدر خوش ہوں کہ اُن کے پڑھنے کے لیے اشعار کا انتخاب کیا جا رہا ہے اور اس نازشِ گفتار پر مجھے کتنا ناز ہے کہ ان کی جمع آوری کے لیے میں یہ سرمایہ فراہم کر رہا ہوں لیکن، اگر صاحب سخن کی گزارشِ احوال سے غرض ہے تو بس اتنا کافی ہے کہ جب اس جریدہ میں میری تعریف میں کچھ کلمات سپردِ قلم کریں تو اُسے اس طرح نشست دیں کہ ناکسانِ روزگار اور بے کسان شہر دہلی میں وہ ایک ایسا مسلمان ہے جسے کافر ماجرا کہا جا سکتا ہے اور وہ آتش پرست ہے جو صورتاً مسلمان نظر آتا ہے غلط نمائی کی وجہ سے غالب تخلص کرتا ہے اور اس انداز کی ہرزہ سرائی میں مشغول رہتا ہے۔

فرد خرسندیٔ غالب نہ بود زیں ہمہ گفتن
یک بار بفرمائے کہ اے ہیچ کسِ ما

غالب کا دل اتنی بہت سی باتیں کہنے پر بھی خوش نہیں ہو سکتا ایک بار یہ کہہ دے کہ اے شخص تو کچھ بھی نہیں اور ہم پھر بھی تجھے اپنا سمجھتے ہیں

ویسا نہ رہے کہ میں اپنی اصل آفرینش میں اس گروہ کی نسل سے ہوں جس کی خوش بختی کا سورج عرصہ ہوا ڈھل چکا ہے اور میں اس جماعت کے حلقہ میں شامل ہوں قسمت نے جس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اس پر بھی اب قرن بیت رہے ہیں۔ میں ایک ستم رسیدہ شخص ہوں جس نے کبھی فرخی و فیروزی کا منہ نہیں دیکھا۔ آرایش سخن میری پیش کش ہے میں ترک نژاد ہوں اور میرا نسب نامہ افراسیاب و نژادِ تُشم سے جا کر مل جاتا ہے۔
اور میرے اجداد اس وجہ سے کہ سلجوقیوں کے ساتھ ہم گوہری کا پیوند رکھتے تھے

ان کے دور میں انھوں نے سپہ گری و کشور کشائی کا پرچم بلند رکھا۔ جب اس گروہ کی جاہ مندی و خوش نصیبی کا دور دورہ ختم ہوا اور بے نوائی و نا پذیرائی کا زمانہ آگیا تو ان میں سے ایک جماعت تو رہزنی و قزاقی کی طرف مایل ہو گئی اور ایک نے کشاورزی و زراعت پیشگی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ میرے اجداد کی آرائش گاہ سرزمین توران کا شہر سمرقند بنا۔

ان لوگوں میں سے میرا دادا اپنے باپ سے ناخوش ہو کر عازم ہندوستان ہوا اور لاہور میں نواب معین الملک کی ہمراہی اختیار کی۔ جب معین الملک کی بساطِ دولت بھی وقت نے الٹ دی تو میرے جدِ بزرگوار نے دہلی کا رخ کیا اور ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں بہادر سے ملا۔ اس کے بعد شاہ جہاں آباد میں میرا باپ عبداللہ بیگ خاں عالمِ وجود میں آیا اور میری پیدائش اکبر آباد میں ہوئی۔

میری عمر پانچ سال ہو گی کہ بہ تحقیق باپ کا سایۂ عاطفت میرے سر سے اٹھ گیا۔ میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے جب چاہا کہ ناز و نعم کے ساتھ میری پرورش کرے تو اس کو اجل نے امان نہ دی اور تیرے بھائی کے مرنے کے بعد خود اس نے بھی اسی کے نقشِ قدم پر چل کر راہِ مرگ طے کی اور مجھے اس ویرانہ آباد میں تنہا چھوڑ دیا اور یہ حادثہ کہ میرے لیے نشانِ جاں گدازی اور آسمان کے لیے کینہ سازی کا وقت تھا سنہ ۱۸۰۶/۲۱ ۱۲ھ میں پیش آیا۔

صمصام الدولہ جنرل لارڈ لیک بہادر کی قیادت میں لشکر آرائی و کشور کشائی کے ہنگامہ کے دوران وقوع پذیر ہوا۔ چونکہ میرے عمِ مرحوم اہلِ فرنگ کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے اور چار صد سواروں کی جمعیت کے ساتھ صمصام الدولہ کے ہم رکاب سرکشوں سے جنگ میں مصروف نیز سرکارِ انگریزی نے ان کو اکبر آباد کے قریب دو پرگنہ بطور جاگیر عطا فرمائے تھے۔

بنا بریں سپہ سالار سرکار انگلشیہ نے آفتاب کے خوں بہا کے طور پر ہم فقیروں کے کلبۂ تاریک کے لیے چراغ اور ہم بے نواؤں کے لیے جاگیر کے عوض میں مشاہرہ مقرر کیا

اور فکرِ معاش اور خار خارِ جستجو سے فراغ بخشا۔ اب یہ کہ زندگی کی نفس شماری کا نشانِ شمار چالیس اور چار چوالیس پر پہنچ گیا ہے (۱۸۴۱ء) میں اس وظیفہ پر خوش ہوں اور اس آمدنی پر قناعت کیے ہوئے ہوں۔

فنِ شعر میں مجھے مبداء فیاض کے سوا کسی سے شرفِ تلمذ حاصل نہیں۔ میں سوادِ معنی کو اپنے گوہرِ جاں کی روشنی سے فروغ بخشتا ہوں اور اس معاملہ میں میری گردن کسی کے بارِ منت سے خم نہیں ہے اور نہ کسی کے احسان کا لبادہ مرے دوش پر ہے۔

رباعی

غالب بگہر ز دودۂ زادشمم
زاں رو بصفائے دمِ تیغ ست دمم
چوں رفت سپہ بُدی زدم چنگ بشعر
شد تیرِ شکستۂ نیاگاں قلمم

(اے غالب! اپنے خاندانی سلسلہ کے اعتبار سے میں زادشم کے گوہر سے ہوں اس لیے صفائی اور تیز روی میں میرا نفس دمِ تیغ کی طرح ہے۔ جب سپہ گری کا زمانہ ختم ہو گیا تو میں نے شاعری کو اختیار کر لیا اور اس طرح میرے اجداد کا تیرِ شکستہ میرا قلم بن گیا۔)

خط ختم ہو گیا اور پراگندہ گوئی و دراز نفسی کی شرم مجھ پر غالب آگئی دیدہ ور جانتے ہیں کہ میرے پاس سخن ہائے گفتنی بہت ہیں۔ لیکن اس افسانۂ پریشاں کو کہاں تک طول دیا جائے۔ میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں مختصر کہوں اور سلسلۂ گفتار دراز نہ ہو اس پر نگاہ رکھوں۔

میں نے جو کچھ کہا وہ گناہ نہیں اور اگر گناہ ہے تو خدا کریم و رحیم ہے اور اس کا رحم و کرم میرے گناہوں کا عذر خواہ والسلام بہ الوف الاحترام۔

ایضاً

[۵۴ء]

مخلص نوازا! جس کا دل غمِ دوری سے فگار اور سینہ دردِ مجبوری سے زخم دار ہو وہ اگر "سازگاری" و "ساختگی" کی باتیں کرنے لگے تو کس کو باور آئے گا۔

اس گروہ کا دردِ دل آرایشِ گفتار کی تاب نہیں لا سکتا فراوانیٔ الفاظ کا اس حلقہ میں گزر نہیں، میں بھی تو انھیں میں سے ہوں۔ قلم رہونِ مدعا نگاری ہو یہی بہتر ہے تاکہ میں پہلے اہلِ سخن کی اس آزمایش سے گزر جاؤں تو فکر کی نارسائی اور بیان کی ناروائی کے سامنے شرمسار نہ ہوں۔

خاطرِ عاطر میں یہ ضرور ہوگا کہ میں نے اپنے مکرّم مولوی نور الحسن سلمہٗ کو ایک خط بھیجا تھا اور ملازمانِ حضور کو اس بارۂ خاص میں زحمت دی تھی کہ اسے لکھنؤ بھیج دیا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا ہی ہوا بھی ہوگا لیکن چونکہ لکھنؤ سے ہنوز رسید نہیں پہنچی اس لیے اندیشہ کی گرمی مجھے پگھلا رہی ہے کہ مبادا یہ مکتوب الیہ تک نہ پہنچا ہو اور ان کے پیرامونِ خاطر میں یہ خیال گزر رہا ہو کہ غالبِ آشفتہ نوا میں خوشبوئے وفا نہیں ہے اس نے دیرینہ محبتوں کے حق کو فراموش کر دیا اور قلم کو جنبش دینے میں تنگ دلی کی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اگر اس کا جواب تقاضہ کر کے لکھنؤ سے منگوا لیا جائے! اور مہربانی فرماتے ہوئے وہ مجھے بھیج دیا جائے کہ میں اس تشویش سے نجات پاؤں۔

دوسرے میں بہت دنوں سے یہ چاہتا ہوں اور وعدہ بھی یہی ہے کہ جو کچھ میری نظم و نثر سے فراہم ہوا ہے اس کو نظر گاہِ قبول سے روشناس کراؤں۔ ان میں سے امسال اپنے منتخب دیوانِ ریختہ کو حضرت مولوی غلام امام شہید کے بندگانِ عالی مثال کے سپرد کرتا ہوں کہ اس کے لیے اس سے زیادہ روشنی و روشن آئینی کی کوئی اور

صورت نہ ہوگی۔ دیوانِ فارسی اور مجموعۂ نثر اس کے بعد پہنچے گا۔

میں ابھی سفینۂ انشر کی تکمیل کے بارہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تو جناب والا کی نگاہِ لطف پر منحصر ہے۔ اور آپ کی یہ چشم عنایت دل نے جس کا خیال باندھا ہے اس کے ماسوا اور کیا ہے کہ میری اپنی نگارشات جو آنجناب کی نگاہ میں ہیں مجھے واپس بھیج دی جائیں تاکہ انتخاب و التقاط کے طور پر اس مجموعہ میں شامل کر لیا جائے۔

اس طرح کے اہم کاغذات کا بہ سبیل ڈاک بھیجنا صرف بے ہودہ ہے میں چاہتا ہوں کہ میرے خواجہ تاش اس بات کا خیال رکھیں اور جب کسی کو اس دیار کی طرف رُخ کرتا ہوا دیکھیں تو یہ مطلوبہ اوراق اس کے بدست مجھے بھیج دیئے جائیں۔ جب تک میں زندہ ہوں آپ کا بندہ ہوں۔

کیا عرض کروں کہ ان باتوں کی جگہ دل میں ہے زبان پر نہیں۔ آپ کی راتیں دن کی طرح روشن اور دن روزِ نوروز کی طرح مبارک اور فرخ فال ہوں۔

ایضاً

[۵۵]

فرد رسید نہائے منقارِ ہما براستخواں غالبؔ

پس از عمرے بیاد م داد رسم وراہ پیکاں را

(اے غالب میرے استخوانِ شکستہ پر ہمانے بار بار منقار زنی کی تو مجھے ایک عمر کے بعد اس کے پیکان کی خلش اور اس کا اندازِ ستم یاد آگیا)

ایک لمبی مدت پیچ و تابِ انتظار میں گزر گئی تو گوہریں نامہ پیرایۂ گردن و زینتِ گوشِ تمنا ہوا۔ میں تمہاری اس سادہ کاری پر جتنا ناز کروں کم ہے کہ تم نے خود کو شرمسار ظاہر کیا لیکن یہ تو "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے مترادف ہے بہر تقدیر

عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است

(تیری عمر دراز ہو کہ یہ بھی غنیمت ہے) اغلب یہ ہے کہ برادر بجاں برابر صاحب والا مناقب نواب امین الدین خاں اس وقت تک پہنچ چکے ہوں گے ایک خط ان کے نام ابھی

خط کے ساتھ ملفوف ہے، اِسے ان تک پہنچانا ہے۔ اور ان کی فرودگاہ کے نام و نشان سے اطلاع دینا۔ خدا کرے انھوں نے شیوۂ تکلف کو راہ نہ دی ہو اور تمہارے کاشانہ میں اترے ہوں۔

خدارا لکھئے، مجھے چونکہ نواب امین الدین خاں سے ایک خاص تعلق ہے اس لیے میری خاطر ان کی مدارات کا پورا پورا خیال رکھا جائے

میں تم پر قربان ہوں میرا اور ان کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ لفظ محبت و مودت سے اس کی صحیح ترجمانی ہو سکے۔ اس لیے کہ الفاظ کے ساتھ دوئی کا ایک مفہوم بھی موجود ہے جبکہ میرے اور ان کے "درمیان" دوئی " کا رشتہ سرے سے موجود ہی نہیں اس لیے جو کچھ تم ان کے تئیں کروگے وہ گویا میرے ساتھ عمدہ سلوک ہوگا۔

مرزا احمد بیگ مرحوم کے اخلاف کا حال معلوم ہوا کہ اس مرحوم کے بعد وہ انتظام باقی نہ رہا اور اس کے بچے خوردی میں یتیم ہو گئے ایزد تعالیٰ کہ دانا و توانا ہے اس گروہ کو توفیق یک دلی بخشے۔

اب میں کیا لکھوں کہ لکھنے کے لائق بھی ہو اگر آرزوئے دیدار ہے تو اس کی انتہا کیا اور اگر اندوہِ روزگار ہے تو اس کی نگارش کی تاب کسے نگاشتہ چہار دہم ماہ اکتوبر ۱۸۴۴ء

ایضاً
[۵۶]

جناب عالی آج آدینہ روز اور ماہ اپریل (سنہ ؟) کی تیرھویں تاریخ ہے میں نامہ نگاری کی فرصت اور اپنی تقصیر کے لیے عفو و در گزر چاہتا ہوں۔

مخفی نہ رہے کہ لارڈ ولیم کونڈس ٹینگ بہادر ماہ مارچ کی ۲۶ ویں تاریخ کو اس دیار میں پہنچے اور کوٹھی ریزی ڈینسی میں فروکش ہوئے۔ دو روز کے بعد لشکر و بازار لشکر کی جمعیت درہم برہم ہو گئی اور لوگوں کو رخصت ہو جانے کی اجازت دیدی گئی اور خیام خاصہ کی شملہ کی سمت، روانگی عمل میں آئی سکرتر صاحبان نے شہر میں جابجا

طرح اقامت ڈالی۔

مولوی محمد حسن و مولوی سید محمد نے دو روز راقم الحروف کے غم کدہ میں آرام کیا بعد ازاں اپنی گنجایش کے مطابق کوٹھی ریزی ڈینسی کے جوار میں کرایہ پر رہایش گاہ کا انتظام کیا اور وہاں قیام فرمایا۔ شاہ دہلی نے نواب عالی جناب سے ملاقات نہیں کی صاحب سکرتر بہادر ریزیڈینٹ دہلی کی ہمراہی میں بارگاہ خسروی میں حاضر ہوئے اور مختاران شاہی نے گورنر کے حضور میں باریابی حاصل کی۔

ماہ اپریل کی ۵ تاریخ کو اذن باریابی ملا تو اہل شہر نے گروہ در گروہ اور پایہ بپایہ کورنش بجالانے کی سعادت پائی چونکہ سلسلہ منع و دور باش باقی نہ رہا تھا اور قرار واقعی طور پر پرسش بھی نہیں ہوئی اس لیے جس نے چاہا نذر گزرانی اور جس نے چاہا صرف آداب و رسوم کورنش بجالایا۔

پہلی بار نواب نجف محمد خاں بہادر مرزبانِ جھجھر نے اپنے بھائی اور بیٹے کے ساتھ سعادت باریابی حاصل کی ایک سو ایک اشرفیاں بطور نذر پیش کیں قبولِ پیش کش اور عطائے خاتم الماس سے سرفراز کیے گئے اور نشاط افروز خاطر ہوئے بعد ازاں دوسرے جاگیر داروں کو رخصت باریابی عطا ہوئی مثل نواب امین الدین خاں اکبر علی خاں اور دو ندے تھاں۔ ان کے بعد امرائے شاہی، عمائد شہر و کلائے اطراف اور کار گزارانِ دفتر سرکاری بار کیے گئے۔ یہ بھی معلوم ہو کہ اس ہنگامہ میں میر حامد علی خاں بہادر داماد میر فضل علی خاں بہادر نے بھی سعادت ملازمت پائی اور بیس اشرفیاں بطور نذر گزرانیں اور عطائے انگشتری سے سرفراز کیے گئے۔

اور کیا عرض کروں کہ اس سے زیادہ کوئی اور بات پیشِ نہادِ خاطر نہیں۔

ایضاً
[۵۔]

قربانت شوم اپنے دل سے یہی کہو گے نا کہ میرے داد خواہ اسد اللہ نے تو اپنے غلبۂ دیوانگی کے باعث خود مجھے عاجز و درماندہ کر رکھا ہے خدارا دردمندوں کے نالہ و فریاد

سے اب اتنا بھی رنجیدہ و افسردہ نہ ہوں ان میں بھی مجھ ایسے اپنے دردمند ہے کہ وہ تو آپ کے بندگانِ خاص میں سے ہے۔

منشی حسن علی صاحب کا مکتوب گرامی ملا اور مجھے شرمسار کیا میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں تاکہ ان کی خاطر جمع ہو اور وہ یہ جان لیں کہ یہ آشفتہ سر انھیں بارِ دیگر زحمت نہ دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تدبیر ہوس و طمع سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ کام تو انگریزی زبان میں دی گئی اس عرضی سے ہے جو میں نے تمہیں بھیجی ہے۔

اس کو آگے بڑھانے کی دل وجان سے کوشش کرو اگر وہ عرض داشت منظور ہو گئی تو سمجھو کام بن گیا ورنہ میں ہوں اور نامرادی جاوید اللہ بس ماسوا ہوس۔ نگاشتہ پنجم روز شنبہ وقت شب پیش چراغ در عالم سرخوشی دماغ۔

ایضاً
[۵۸]

صاحب من۔ میری آنکھیں آئینۂ سکندر (ی) کے مشاہدہ سے روشن ہوئیں۔ اور اس کی صفائے عبارت نے رشتۂ تحریر میں موتی پروئے عمدہ بیان مختصر خبریں دلپسند نکتے اور نظر فریب نگارشیں اس کے صفحات کی زینت ہیں۔ آپ کا سحر قلم تو میرے دل وجاں پر چلتا ہے اور میں ان اوراق کو دوسروں سے متعارف کرانے میں بہترین طریقے سے کوشاں ہوں۔

اس دیار کے رہنے والے "جامِ جہاں نما" کی نامعتبری سے بددل ہیں یوں بھی یہ لوگ اخبار بینی کا صحیح ذوق نہیں رکھتے۔ انصاف بالائے طاعت ایسا کم اتفاق ہوتا ہے کہ جام جہاں نما اس ہفتہ میں یہ خبر شایع کرے اور دوسرے ہفتہ میں خود ہی اس کی تردید نہ کر دے۔ ایک ہفتہ میں سرکار انگریزی کی والی لاہور سے جنگ کی بات کرتا ہے کہ وہ موسم زمستاں کی آمد سے پہلے چھڑ جائیگی اور دو ہفتہ کے بعد خود ہی یہ اطلاع دیتا ہے کہ وہ خبر غلط تھی۔

اس ہفتہ میں یہ خبر چھپتی ہے کہ اکبرآباد کی مسجد جامع اور روضہ تاج گنج کو اس قیمتاً

فروخت کیا جا رہا ہے اور دو ہفتہ گزرنے پر خود ہی اعلان کرتا ہے کہ فرمارو ایان کونسل اس بیع وشرے کو جائز نہیں سمجھتے۔

بہر حال آج کہ ماہ ستمبر کی ۴ تاریخ اور یک شنبہ کا دن (سنہ ؟) ہے آپ کا گرامی نامہ ملفوف اوراق کے ساتھ ملا۔ مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں اور فخر الدولہ نواب امین الدین احمد خاں نے انھیں ملاحظہ فرمایا لیکن خریدار بننا پسند نہیں کیا۔ بہر حال اس کے بعد اس دیار کے سر برآوردہ لوگوں میں جو شخص اس کے بارہ میں کچھ کہے گا میں وہ بات آپ تک پہنچا دی جائیگی۔ والسلام

بنام حکیم احسن اللہ خاں

[۵۹]

درد مند نوازا۔ نامۂ مشک شمامہ کی نسیم ورود نے اس غنچۂ راز کی پردہ کشائی کی۔ اور مژدۂ دلنواز کی خوشبو سے مشام جاں کو معطر کر دیا۔

معلوم ہوا کہ ایک عرصہ تک رابطہ باہمی کے ٹوٹے رہنے کے باوصف گزلک ایام نے میری بے اعتباریوں کے نقش کو آ جناب صفحۂ دل سے محو نہیں کیا اور روزگار جدائی کی تند ہواؤں نے میری خاکساریوں کے آثار کو پیرامون خاطر سے مٹا نہیں دیا۔

طلب نثر کے باب میں یہ سمجھیئے کہ میرا وہی حال ہے جو اس تہی دامن میزبان کا ہوتا ہے جس کے یہاں اچانک کوئی مہمان عزیز آجائے اور وہ کبھی خود کو دیکھے اور کبھی اپنے گھر کو اور یہ چاہے کہ کسی طرح "شوربائے و دو پخت" اور "نان جویں" اس کے واسطے مہیا کر دے لیکن اپنے گھر کے سر و سامان میں کہیں سے اُسے کچھ نہ ملے۔

میں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ میں اپنے پراگندہ نثر پاروں کو کبھی جمع نہیں کر سکا۔ بلکہ خود کو اس کشا کش سے الگ رکھا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے قلم کے یہ نقوش و آثار یا تو لایعنی صورتوں کے زمرہ میں آئیں گے یا پھر انھیں "زقوم خوش جوہر" کے سلسلہ سے منسلک کیا جائے گا۔ پہلی صورت میں کیا ضروری ہے کہ خود کو ایک بے قیمت شے بنا کر فروخت کیا جائے اور آئندہ ان "نقشہائے بے صورت" کے دیکھنے والوں کی ناپسندیدگی

کو مول لیا جائے۔

دوسری صورت میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ جانے والے یہاں سے اپنے ساتھ کیا لے گئے تو ہم لیکے جائیں گے اور جس کے حصول کی آرزو ہمیں اس درجہ بے تاب رکھے۔

انصاف بالائے طاعت ہے جس دعوئی گاہ میں قتیل کی توانائی کو فرہنگ نگاری کے باب میں محکِ اعتبار سمجھ لیا جائے اور نور العین واقف کی زبان دانی کے علم کو شیوہ بیانوں کے پرچم سے اونچا اڑانے کی کوشش کی جائے وہاں کس سے پوچھوں کہ میری جدت طبع کے نتائج کہاں ہیں اور میں نے اس جگر سوزی میں کیا لذت پائی ہے۔

ان چند سطروں میں جو "دیوانِ ریختہ" کے لیے بطور دیباچہ معرضِ تحریر میں آئیں جن خیالات سے لباس حروف پہنا ہے اور وہ دھواں جو "سفینۂ گل رعنا" کی زیب دہی کے لیے میرے سویدا دل سے اٹھا ہے اُسے بطورِ سوغات خدمت عالی میں بھیج رہا ہوں اور اپنی نگارشات کی تنک مایگی پر شرم سے آب آب ہوا جاتا ہوں۔

شیخ امیر اللہ سرور تخلص

[۶۰]

حضرت سلامت۔ دل نواز نامہ کے ورود نے دل کو تنومندی بخشی، اور نہال آرزو کو برومندی۔ جناب والا اپنے خطوں کا جواب نہ پاتے پر گلہ مند ہوتے ہیں اور خدا سے نہیں ڈرتے۔

میں تو اس اثنا میں برابر آپ کے خطوط کا جواب دیتا رہا ہوں اور مجھے یہ خیال آتا رہا ہے کہ آپ کس حال میں کس خیال میں ہیں۔ بارے حالات کے رُخ سے پردہ اٹھا اور مجھے معلوم ہوا کہ آپ نے تو کچھ دنوں سے مجھے بالکل بھلا رکھا ہے۔

ناگاہ مولانا تراب علی کا ورود اس بقعۂ زمین میں ہوا اور آپ نے یہ سنا کہ فلاں شخص بوجہ سخت جانی ہنوز زندہ ہے دیرینہ محبت کی رگوں میں پھر جنبش و حرکت آ گئی چاہا کہ خط سے یاد کر لیں۔ فراموشی کے زمانہ سے گزر کر اب خود آپ سوچ میں پڑ گئے لاجرم دو چار دروغ بافیاں کیں اور انھیں اپنے خط کا خوب صورت دیباچہ بنا دیا خدا

کرے آپ بہت جئیں اور زمانہ سے نیکی کے ماسوا کوئی اور سلوک نہ دیکھیں۔
دیباچہ ہائے دل آویز پہنچے آپ نے میرا حال پوچھا ہے کچھ بھی تو در خور عرض نہیں

فرد شکستہ دل تر ازاں ساغر بلوریم
کہ درمیانۂ خارا کسی زدو رہا

میں اس ساغر بلور سے زیادہ شکستہ دل ہوں کہ جسے پتھروں کے درمیاں دور سے پھینک دیا جائے۔

میں وہ خیرہ سر و آشفتہ خیال ہوں کہ میرے پاس نہ دل آسودہ ہے نہ زبان سخن سرا کہ سراسیمگی سے آزاد ہو اور ایک حالت پر قایم رہے۔ چار سال گزرے کہ میرا مقدمہ اجلاس کونسل میں پیش ہے اور میرا دل تفرقۂ امید و بیم سے بے طرح مجروح کوئی ایسا حکم صادر نہیں ہوا جس سے یہ جھگڑا طے اور یہ قضیہ یک سو ہو۔ گویا اندھیری رات کے ختم ہونے کا وقت ہنوز نہیں آیا۔

اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب کونسل کے رکن اعظم اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈ س بنٹنگ بہادر اس دیار میں آئیں تو میں ان کا دامن پکڑ لوں اور ان سے انصاف کا طلب گار ہوں۔ اور حکم آخر صادر کیے جانے کی درخواست کروں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نواب گورنر جنرل دہلی نہیں آئیں گے اور ادھر سے ادھر اجمیر چلے جائیں گے اگر یہی ہے تو مجھ پر اور میرے حال پر ہزار افسوس۔ راہ کی دوری میرے کام کی درازی اور مقصد سے میری مجبوری پر آہ صد آہ۔

دل چاہتا ہے کہ تمہاری والا طبعی کو دیکھوں اور اپنے کام و زبان کی تراوشوں کو تمہیں بطور تحفہ بھیجوں لیکن اس کی فرصت کہاں اور اس کا دماغ کسے نواب گورنر جنرل کی آمد آمد ادھر ادھر سے اخبار کی دریوزہ گری اور فرد ہائے مقدمہ کی ترتیب تمہید نگارش احوال، اندیشہ ہائے گوناگوں اور انداز بیان کی نوک پلک کا خیال اتنی دستیاری اور غم خواری کی امید بھی کسی سے نہیں کہ میں اپنے قلم سے جو ورق لکھ دوں کوئی اس کی نقل ہی کر دے یا جب میں نظر ثانی کی غرض سے مختلف

اوراق کو اِدھر اُدھر کر دوں تو پھر کوئی ان منتشر کاغذوں کو اکٹھا ہی کر سکے۔ مجھے کچھ دن کی مہلت اور دیدو تاکہ جب تم مجھ سے ملو تو گاہ گاہ آئینۂ مہر و محبت کی زنگ زدائی کرتے رہو۔ اوراق اشعار کو میں نے سرسری دیکھ لیا ہے ان تمام بزرگوں میں سے جن کا وہاں ذکر ہے مرزا حیدر علی افصح میری نگاہ میں مردِ کامل ہیں۔ روش پسندیدہ اور طرز دلکش رکھتے ہیں۔یہی شیوہ مکرمی شیخ امام بخش ناسخ خواجہ حیدر علی آتش اور لکھنؤ کے دوسرے تازہ خیالوں کا ہے۔

اس بزرگوار کی ایک غزل کو مخمس کیا گیا ہے اب میں نہیں کہہ سکتا کہ حسن مطلع میں تمہارا تصرف ہے یا سہو کاتب کہ مصرع اوّل کے رکن آخر میں ایک بے مزہ زحاف موجود ہے۔ عروضیوں کی اصطلاح میں جسے "عجز" کہتے ہیں جو کسی بھی سلیم الطبع آدمی پر ظاہر ہو جائے گا اصل میں مصرع اس طرح ہونا چاہیے۔

نہ خریدار کا حصّہ ہوں نہ حق بایع کا
میں وہ دانہ ہوں کہ گر جائے کفِ میزاں سے

والسّلام

شیخ امام بخش ناسخ

[۶۱]

حضرت سلامت صحیفۂ اقدس کی نسیمِ ورود نے اپنی جنبش و اہتزاز اور ہمدمی و ہم آہنگی کی خوشبو نے اپنی دلنوازی سے مشامِ جاں کو معطر و شاد کام کیا۔

نامہ نگار نے گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے اور آنے جانے والوں پر وہ اپنے ہوں کہ بیگانے اپنے گھر کے دروازے بند کر لیے ہیں اگرچہ میں زندانی نہیں لیکن میرے خواب و خور کا انداز قیدیوں ہی جیسا ہے اگر کوئی کافر سو سال عذابِ دوزخ میں گرفتار

رہے اور اس کا ایک ادنے حصہ ہی دیکھے تو اس کا وہ حال ہو بقول عرفی ۔

از بوئے تلخ سوختہ دماغ امید و یاس
زہرے کہ در پیالۂ ما ریخت روزگار

(روزگار نے میرے جام زندگی میں وہ زہر آب بھر دیا ہے جس کی بوئے تلخ نے میرے دماغ امید و یاس ہی کو مختل کر رکھا ہے کہ اب میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔)

میرے خرمن صبر و ثبات میں جو چنگاری پھینکی گئی ہے وہ یہ کہ میرے قرض خواہوں میں سے دو آدمیوں نے میرے خلاف عدالت سے ڈگری حاصل کر لی۔ اب یا تو ڈگری میں مندرج زر رقم حسب قاعدہ ادا کیا جائے یا پھر قرض دار قید و بند کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے اس باب میں شاہ و گدا برابر ہیں۔ سر برآوردہ لوگوں کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ کچہری کا سپاہی گھر پر جا کر انھیں گرفتار نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ کہیں راہ میں نہ ملیں انھیں اسیر نہیں کیا جاتا۔

چونکہ ادائے قرض کے لیے میرے پاس روپیہ نہیں تھا اس لیے اپنے اوپر یہ لازم کیا کہ اپنی آبرو کی حفاظت کی غرض سے میں سواری کی عزت سے خود کو محروم کروں اور گھر سے باہر نہ نکلوں آج تک میں نے وہ قید اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے اور اپنے پیروں کو پابند اقامت بنا رکھا ہے اس گوشہ گیری اور شکستہ خاطری کے زمانے میں کسی ظالم خدا ناترس نے کہ ہمیشہ عذاب ابدی میں گرفتار رہے ولیم فریزر صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی کو جو غالب مغلوب کے مربیوں میں سے تھے شب تاریک میں بندوق کی گولی سے ہلاک کر دیا اور میرے لیے باپ کی موت کا غم تازہ ہو گیا۔

دل بے قابو ہو گیا اور میرے خیال و حال پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ آرام و راحت کا خرمن بے طرح جل گیا۔ وقت نے صفحۂ دل سے نقش امید کھرچ کر پھینک دیا۔

قضارا جو نشان تبلائے گئے اور اس بنیاد پر جو غلط نہیں تھی ایک سوار کو جو والیٔ فیروزپور کے ملازموں میں سے ہے اس ستودہ صفات شخص کے قتل کے جرم میں پکڑ لیا شہر کے صاحب مجسٹریٹ بہادر کہ پہلے سے مجھ سے واقف تھا اور اس زاویہ نشینی

کے زمانہ میں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے کہ بوم کی طرح میری پرواز صرف رات کے وقت ممکن تھی۔ شبانگاہ میں کبھی کبھی اس سے ملنے جاتا تھا اور کچھ لمحے سکون و عافیت کے گزارتا تھا۔

جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس نے حقیقتِ حال تک پہنچنے اور اس پر پڑے ہوئے بہت سے اسرار کی پردہ کشائی کی غرض سے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا یہاں تک کہ والیِ فیروزپور مجرم قرار پا گیا اور سرکار کے حکم سے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس کی گرفتاری عمل میں آئی اور سرکاری پولیس اس کی جاگیر پر جا کر بیٹھ گئی۔ چونکہ میرے اور اس کے مابین نااتفاقی چل رہی تھی اور شہر کے لوگ اس سے واقف تھے سب کے سب میرے مخالف اور اس کافر نعمت کی گرفتاری کو جس نے اپنے محسن کو مار ڈالا میری طرف سے مخبری کا نتیجہ قرار دیا۔

یعنی مردمانِ شہر خاص و عام یہ واہمہ رکھتے ہیں کہ شمس الدین بے گناہ ہے فتح اللہ بیگ خاں اور اسد اللہ خاں نے انگریزوں کو اس کے خلاف بھڑکایا ہے اور اس کے حق میں چند جھوٹی سچی باتیں لگا کر اس بیچارے کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے طرفہ تر بات یہ کہ فتح اللہ بیگ خاں والیِ فیروزپور کا برادر عم زاد ہے۔ مختصر یہ کہ قصہ یہاں تک پہنچ گیا کہ مجھ پر لعنت ملامت دہلی کے یاوہ گویوں کا وظیفۂ لب بن گئی ہے۔

آغاز میں تو صرف ولیم فریزر بہادر کے قتل ہی کا افسوس تھا اب ایک طرف قاتل مشخص ہو گیا اور اُدھر بدگمانانِ شہر نے مجھے عاجز کر دیا۔

یزدانِ پاک سے جو ستم گروں کو ہلاک کرتا ہے اور ستم رسیدہ لوگوں کو اپنی بخشائشوں سے نوازتا ہے میں صبح کے وقت یہ دُعا کرتا ہوں کہ اس خیرہ سر بے آزرم کو جلد از جلد اس کے کیفرِ کردار تک پہنچائے اور اس سربلندی طلب کرنے والے کو فرازی دار نصیب ہو میں جانتا ہوں کہ میری ہمت ظفریاب اور میری دُعا بارگاہِ خداوندی میں مستجاب ہے۔

دوشنبہ ہفدہم ماہ صفر کو الٰہ آباد کے حکام شہر میں سے ایک حاکم اس دیار تک پہنچا اور گورنر جنرل بہادر کی طرف سے اس امر پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ حکام دہلی کی تحقیقات کے خلاصہ کو مزید گہری نظر سے دیکھے اور ثبوت جرم کے بعد سزادہی کی قرارداد کو مرحلہ بہ مرحلہ بروئے کار لائے اور ظاہر ہے کہ اس ہنگامہ کا یکسو ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ یہ ایک ماہ سے زیادہ طول کھینچے۔

گفتگو کا یہ خلاصہ اس ضمن میں ملازمانِ والا کے سوال سے متعلق تھا جو میرے خط کے جواب میں سبحان علی خاں کی زبانِ گوہر فشاں سے رقم پذیر ہوا۔ وہ ایسا نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ خانِ والاشان نے ہم گناہوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور خاک نشینوں کی جانب التفات کو اپنے لیے دون مرتبت تصوّر کیا۔ ورنہ بہ ادنیٰ توجہ یہ بات معلوم کی جا سکتی تھی کہ میرا مقصد یہ تھا کہ میرا قطعہ ملازمانِ فلک بارگاہ کی نظر سے گزر جائے اور میری خاکساری و بے اعتباری کے بارہ میں کچھ کلمات کہہ دیئے جائیں یہ اتنا دشوار تو نہ تھا سبحان اللہ والحمد للہ۔

فرد
حریفِ منّتِ احباب نیستم غالبؔ
خوشم کہ کارِ من از سعیٔ چارہ گر گزرد

اے غالبؔ میں دوستوں کے احسانات کے لائق نہیں رہا اور میں اس پر خوش ہوں کہ اب میرا کام چارہ گر کی سعی و کاوش کی حد سے گزر چکا۔

اب کوئی ایسا کاتب جو بہارِ عجم کی نقل تیار کرتا اور اسے قیمتاً فروخت کرتا ہو میری نظر میں نہیں ہے۔ نہ میں نے کسی سے سنا ہے کہ دہلی میں ایسا کوئی شخص ہے لیکن دہلی بہرحال شہر ہے بہارِ عجم کے ایک دو نسخوں کا مل جانا کوئی تعجب کی بات نہیں میں اس فن کے نکتہ شناسوں سے کہوں گا کہ اگر کوئی صحیح اور خوش خط نسخہ مل سکے تو فراہم کریں اور جیسے ہی پہنچے گا ارسال خدمت کر دیا جائے گا۔

والسّلام

ایضاً
[۶۲]

قابلِ احترام و واجب الاطاعت ۔ نیاز و تسلیم کا جو نذرانہ خدمت والا میں پیش ہے اسی دائرے میں رہتے ہوئے ممکن ہے جو نامہ و پیام کے وسیلہ اظہار میں آتا ہے اور آرزو جو گذارش کی صورت اختیار کر رہی ہے اس کی حد بس وہیں تک ہے کہ وہ کاغذ و قلم کی وسعت میں سما سکے اگست کی دوسری تاریخ کو منتخب دیوانِ ریختہ موم جامہ میں لپیٹ کر بسبیل ڈاک انگریزی جناب والا کی خدمتِ عالی درجت میں روانہ کیا گیا اور آج کہ بست و ششم جمادی الاول ہے۔ انگریزی مہینہ کی کونسی تاریخ ہے یہ میں نہیں جانتا۔ بس اتنی بات مجھے معلوم ہے کہ دو ماہ ہو گئے اور ہنوز اس کے پہنچ جانے کی رسید یہاں نہیں پہنچی۔ ہوائے جنونِ خرد میرے سر میں بھر جاتی ہے کہ میں ڈاک کے کار پردازوں سے سر بہ گریباں ہو جاؤں۔ پھر یہ خیال دامن گیر دل ہو جاتا ہے کہ یہ محکمہ کسی کتاب یا خط کو پہنچانے کا ذمہ دار تو ہے رسید و جواب کے حصول کی ذمہ داری اس پر نہیں۔ اگر جناب مخدوم کی جانب سے کوتاہ قلمی ہوتی ہے تو بے چارے محکمۂ ڈاک والوں کا کیا قصور اور ان سے آویزش کا کیا نتیجہ خدارا انتظار کرنے والوں کا بھی کچھ خیال کیجئے اور نوید وصولیابی اور شرفِ قبول سے نوازیئے۔

والسلام والاکرام

ایضاً
[۶۳]

قبلۂ حاجات: کرم نامہ کے جواب میں جو دیر ہوئی اُسے میری افسردگیٔ شوق پر محمول نہ کیا جانا چاہیئے کیا عرض کروں کہ میری ہمت ایک عجیب کام کی انجام دہی میں مصروف تھی اور میری نظر ایک منظر بلند کی دیدہ بانی کر رہی تھی یہاں تک کہ وہ ہنگامہ ختم ہوا اور اس کے ہر کردار کو جیسا کہ چاہیئے تھا اس کے عمل کی پاداش مل گئی اور مرزبان میوات کو ان کے سرہنگ کریم خاں کے ساتھ تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا اور اس

نے عدم آباد کی راہ لی۔

ہر کسے آں دروَد عاقبت کار کہ کشت

(یہاں جس آدمی نے جو بویا وہی کاٹتا بھی ہے)

عطوفت نامہ انگریزی ڈاک میں پہنچا اور مجھے شگفتہ زار میں پہنچا دیا۔ یہ مخدوم نے کیا فرمادیا کہ غالب روسیاہ نے خدام والا شان کی یاد کو بھلادیا خدا جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے باوجود اس تمام کشاکشِ خاطر، اضطرابِ دل اور تفرقہ' اوقات کے نیاز نامے ارسال کرتا رہا ہوں۔

سخن مختصر کہ خط کی روانگی میں برابر تاخیر ہوتی رہی دوسرے یہ کہ یکے بعد دیگرے ہندوستانی ڈاک میں روانہ کیے گئے امید کہ اس کے بعد یہ لغزش نہ ہوگی اور گزرے ہوئے زمانے کی تلافی آئندہ خطوط میں کردی جائے گی۔ باقی اس دیار کا ماجرا یہ ہے کہ جاگیردار فیروزپور کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور اس کی جاگیر اور متعلقات جاگیر بحق سرکار ضبط ہوئے لیکن ہنوز کوئی ایسا حکم صادر نہیں ہوا کہ مجمع مراتب اور تمام قوانین کا جامع ہو۔ اب اس کے بعد یہ ماجرا صدر گاہ کلکتہ پہنچے گا۔ اس باب میں تب احکامات صادر ہوں گے۔

میں کہ اس جاگیر میں انگریزی سرکار کے حکم سے وظیفہ پاتا ہوں اب مجھے اس کا انتظار ہے کہ یہ حکام میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے ہیں ہنوز یاوری تقدیر کی امید میں جی رہا ہوں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہ جاگیر دار فیروز پور جو مجھے دیتا تھا وہ اس مقدار سے کم تھا جو مجھے دیا جانا چاہئے تھا اور سرکار سے مجھے اتنا ہی ملے میں اس پر قانع نہیں ہوں گا قصہ مختصر کہ یہ پیچ در پیچ بات اور گرہ در گرہ مسئلہ ہے اب جو صورت بھی پیش آئے گی وہ لکھ دیا جائے گا۔

زیادہ زیادہ

ایضاً

[۶۴]

قبلہ و کعبہ ان دنوں فرو ماندگی اندازہ سے بھی کچھ زائد ہے۔ اور میرا دل افسردگی کا خوگر ہو گیا ہے میں نہیں جانتا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں اور کیا دیکھ رہا ہوں اور اس دیکھنے میں میری نگاہ آنکھوں میں نہیں سما رہی اور نگارش کے ان لمحوں میں میرا قلم انگلیوں میں رقص کر رہا ہے۔ میں اپنی رسائی بخت پر ناز کرتا ہوں اور یہ خیال کرتا ہوں کہ طور معنی تک پہنچا ہوں۔ خود کو اپنی گراں مائیگی پر آفرین کہتا ہوں اور یہ دعویٰ میری زبان پر آتا ہے کہ میں نے موسیٰ کو " ید بیضا " کے ساتھ دیکھا ہے۔

اگر میرے مخدوم کو اس دعوے کی عیار گیری میں کوئی حیرانی کی بات نظر آئے اور میری زبان سے اپنی یہ ستائش جو بلند بانگ خود نمائی کے مماثل ٹھہرے گی عجیب معلوم ہو تو میں یہ کہوں گا کہ ہاں میں از روئے انصاف کنایے کے طور پر یہ بات کہہ رہا ہوں، لاف زنی ' موسیٰ کے طور پر نہیں۔ یکرمی یہاں لاف زنی ' موسیٰ سے اشارہ میر موسیٰ جان کی طرف ہے اور ید بیضا ان کے دیوانِ خوشش عنوان سے عبارت ہے یہ " دیوان " کہ جس کی روشنائی چراغِ طور کے دود مانِ روشن سے ہے اور اس کا غلاف ملبوسِ حور کی ریشم سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ قلزم معنی کا سفینہ اور مضمون کے جواہر پاروں کے لئے بیش قیمت خزینہ ہے چونکہ میں صاحبِ دیوان کا ہوا خواہ اور اس پیکر کے نقاشی کا بھلائی چاہنے والا ہوں اس لیے اس پر خوش ہوں کہ یہ مجیفۂ نقش ثانی ہے اگر اس قلم سے نقش اوّل نمود پذیر نہ ہوتا تو اس کی دنیا میں نظیر نہ ہوتی۔

ہاں ہاں ہر وہ متاعِ نیک جو عمدگی میں مشہور ہوتی ہے اُسے چشم زخم سے گزند پہلے پہنچتی ہے۔ سبحان اللہ رتبۂ سخن میرے مخدوم کے زمانے میں بہت بلندی تک پہنچ گیا اور اردو کو ایک نئی رونق میسر آگئی یہ کہ میرے خط کے نہ پہنچنے کا شکوہ خاطر عاطر میں جگہ پائے ہوئے ہے اور اس کا گلہ زبانِ قلم پر بھی آیا ہے اس سے میری آبرو بڑھی اور قدر و منزلت میں اضافہ ہوا۔

میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ جناب کے دل و نگاہ میں میری جگہ ہے اور جب میرا خط نہیں پہنچتا تو مجھے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نوازش اور پرسشِ احوال پر ہزار جانیں قربان سروالا کے گرد بہ صد احترام طواف گزار ہوتا ہوں۔ ہیں، ہجومِ آلام میں گھرا رہتا ہوں ورنہ دل سے کبھی آپ کی یاد فراموش نہیں ہوتی اور لب ادائے ستائش میں خاموشی اختیار نہیں کرتے۔

بایں ہمہ دو بار میرا قلم صفحۂ قرطاس پر سجدہ ریز ہوا۔ لیکن چونکہ میں نے دو مرتبہ بر سبیل ڈاک ہندوستانی اپنا مہر نامہ روانہ کیا ہے اور اس سر رشتہ کو ہنوز وہ استحکام حاصل نہیں ہوا کہ اس پر اعتبار کیا جاسکے۔ لہذا میں ان دونوں خطوں کے پہنچنے کے بارے میں اشتباہ کا شکار تھا اب دل یک سو ہوگیا، نظر کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا اور معلوم ہوگیا کہ وہ نہیں پہنچے۔ میں نے عہد کرلیا ہے کہ میں آئندہ خط بہ جبز انگریزی ڈاک کے نہ بھیجوں گا۔ زیرِ نگارش مراسلہ کو میر موسیٰ جان کے بدست بھیج رہا ہوں جو دیوان لے کر آئے ہیں تاکہ شکوہ کی کوئی گنجائش نہ رہے اور میرے دعوے کے ساتھ گواہی موجود ہو۔

میں نے جو غزل ان دنوں تازگیٔ فکر اور روش نو کے ساتھ کہی ہے، کوتاہ قلمی کی تقصیر پر ہزار ہزار عذر کے ساتھ زیرِ تحریر مکتوب کے حاشیے پر لکھتا ہوں اور یہ آرزو رکھتا ہوں کہ یہ تحریر نامقبول ہونے کے داغ سے محفوظ رہے گی اور آنکھوں کے راستے دل میں اُتر جائے گی۔

غزل

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم
در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

در وجد اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست
ناہید را بزمزمہ از منظر افگنم

معشوقہ را ز نالہ بدانسان کنم حزیں
کز لاغری ز ساعد او زیور افگنم

ہنگامہ را جحیمِ جنوں بر جگر زنم
اندیشہ را ہوائے فسوں در سر افگنم

نخلم کہ ہم بجائے رطب طوطی آورم
ابرم کہ ہم بروئے زمیں گوہر افگنم

با غازیاں ز شرحِ غمِ کارزار نفس
شمشیر را برعشہ ز تن جوہر افگنم

با دیریاں ز شکوہ بیداد اہل دیں
مہرے ز خویشتن بدل کافر افگنم

منعم بہ کعبہ مرتبۂ قرب خاص داد
سجادہ گستری تو و من بستر افگنم

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

راہی ز کنجِ دیر بمینو کشودہ ام
از خم کشم پیالہ و در کوثر افگنم

منصورِ فرقۂ علی اللہیاں منم
آوازۂ انا اسد اللہ در افگنم

ارزندہ گوہرے چو من اندر زمانہ نیست
خود را بہ خاکِ رہگزرِ حیدر افگنم

غالب بہ طرحِ منقبتِ عاشقانہ
رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم

بنام نواب مصطفٰے خاں بہادر

[۶۵]

مخلص نوازا والا نامہ نے سرفراز فرمایا۔ بزرگی و کوچک دلی کے اس انداز نے شرمساری بخشی یہ بھی کیا لغزش ہے۔ اب دستگیری کون کرے اور رہ نما کہاں سے آئے۔ اگر کوئی خطا ہوئی بھی وہ نگارش میں ہوئی گذارش میں نہیں میں نہ کہتا تب بھی مسودہ کے اوراق پر جب نظر پڑتی تو تیرگی سواد روشن ہو جاتی۔ فی الجملہ وہ ایک ایسی بات تھی جو نظر ثانی سے تعلق رکھتی تھی اور باز لگا ہی چاہتی تھی اس سے قطع نظر جو کچھ میں کہتا ہوں اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ میں نے میاں جی گری کی ہے اور میر امداد علی کی وکالت کا فرض انجام دیا ہے۔

اگرچہ وہ منشی ہے لیکن بزرگ شخص ہے۔ وفا پیشہ ہے اور ملازمان بارگاہ کی توجہ کا مستحق۔ تقریظ پارہ کے باب میں میری طرف سے نغمہ سنجی کا خیال کیجیے کہ یہ فرمان محبت کے زیر اثر تھا اور کچھ اس دلی خواہش کے تحت کہ عرصے سے میری یہ تمنا تھی کہ حرف ستایش

کراتنے بہت سے دنوں سے میرے دل میں ہے اسے اس تقریظ کے پردہ میں پیش کردیا جائے جب یہ صورت ہے تو میں جانتا ہوں کہ اس خدمت سے باز نہ رہوں گا۔ جب ملازمان درگاہ جہاں گیر آباد سے واپس آئیں گے تو یہ تحریر انجام کو پہنچ چکی ہوگی اور اس نگارش کو عنوان مل چکا ہوگا۔

اب ہونا یہ چاہیے کہ اس سے پیشتر کہ میرے مخدوم جہاں گیر آباد پہنچیں یہ کام بہ اندازۂ بایست پورا ہوجائے اور ان دو دنوں میں ایک دو ورق لکھنے کی فرصت کچھ ایسی بات بھی نہیں لیکن آج کل تو کچھ ایسا معاملہ ہے کہ نہ میرا دل میرے قابو میں ہے نہ زبان میرے قبضہ میں

"کہ ہجوم اندوہ ہے اور دامن خیال زیر کوہ"

برادر بجاں برابر مرزا علی بخش بہادر رنجور ہے پور سے آئے ہوئے ہیں اور میرے گھر میں طرح اقامت ڈالی ہے۔ دوسرے ایجنٹی میں اس معاملہ سے متعلق پھر سلسلۂ جنبانی کی ہے۔ نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں شامل ان کی امداد معاش کے باب میں ایک گونہ الجھاؤ پیدا ہوگیا ہے۔

اوقات بیماری میں ضائع، دل چارہ گری کی کوشش میں پریشان اور قلم معاملہ نگاری کا مرہون منت۔ تذکرہ کے اجزا واپس بھیج رہا ہوں مجھے ایک بات کہنی ہے تاکہ ایک دوست کا حق وفاداری (جس کی روح اب بہشت میں آسودہ ہے) دوسروں سے متعلق نہ رہ جائے۔

مرزا احمد بیگ خاں ابن ہادی بیگ خاں کو میں نے کلکتہ میں دیکھا تھا۔ ریختہ کہتا تھا اور تپاں تخلص کرتا تھا اور سخن سنجی کے آداب اس نے مرزا جان طپش سے سیکھے تھے یہ برگزیدہ شخص جس کی میں نے یہ تعریف کی ہے۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم کی زوجہ کا بھائی تھا۔ لاجرم میرے ساتھ محبت پیشگی میں ہم دل و ہم زباں تھا اور اپنائیت کے آداب بجالاتا تھا۔ فن شاعری میں سادہ گو تھا۔ کلکتہ میں جاہ مندانہ زندگی گزارتا تھا۔

چار سال ہو گئے کہ وہ دُنیا سے رخصت ہوا اور اپنے مرجع اصلی کی طرف لوٹ گیا جس زمانے میں کہ میں کلکتہ میں تھا جب اس نے مجھ سے سنا کہ اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور تخلص ریختہ گویوں کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں تو اس نے اپنے نتائج طبع کا کچھ حصہ مجھے دے دیا۔ تاکہ جب میں دہلی واپس جاؤں تو میں ان اوراق کو نواب میر محمد خاں سرور کے سپرد کر دوں میں نے ایسا ہی کیا۔ اور جب اعظم الدولہ مجھ سے ملاقات کے لیے آئے تو میں نے وہ صفحات ان کے سپرد کر دیئے اور ان کا پیام بھی ان تک پہنچا دیا لیکن اب اس کے ماسوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ سرور مرحوم نے میری بات کو بھلا دیا اور اپنے تذکرے میں اس آرزو مند کے ذکر سے ان کے لب خموش رہے۔ افسوس یہ ہے کہ مجھے اس کے کلام سے بھی کوئی شعر اس وقت یاد نہیں۔

اگر جناب والا کی سرگرمی و التفات سے مرزا احمد بیگ خاں مرحوم کے اوراقِ شعر جو میں نے سرور کو دیئے تھے ان کے فرزندانِ گرامی مصطفےٰ خاں اور احمد خاں سے مل جائیں تو اس انسان یعنی احمد بیگ خاں کا نام اپنے جریدہ میں مندرج شامل کر لیں یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ والسلام

ایضاً

[۶۶]

حضرت سلامت: میں وہ ہوں کہ میری زبان عرضِ ستایش میں بے قرار اور میری فکر اظہارِ مدعا میں گستاخ ہے امید کہ مزاج شناسی کی اس روش کے باعث میرا شمار خوشامد کرنے والوں کے زمرہ میں نہ ہوگا۔ اور اس جرأت گفتار کی وجہ سے مجھے ہرزہ گویوں میں شامل نہیں کیا جا ئیگا۔

تذکرۂ شعراء کے لیے مختلف اہل سخن کے ترجموں کا مجموعہ فراہم ہوا۔ اور سچ یہ ہے کہ بلند نامی کے پیش طاق کے واسطے یہ وجہ زینت اور سبب نقش و نگار ثابت ہوگا نیکوئی کا پودا اس کی بدولت برگ و بار لائے گا۔

ناپیدائی ذوق کے اس ماحول میں جب بیک نظر اس تماشے کو دیکھتا ہے تو دل

ونگاہ کو آسائش کی غرض سے اُسے اس سے خوب تر اور توشہ نہیں ملتا جسے وہ زاد راہ کے طور پر ساتھ لے سکے۔

خضر سکندر کی تمام تر جگر تشنگی کے باوجود چشمۂ حیواں سے اس کے لب تر نہ کر سکا۔ اور وہ بھی نہ ہوا جسے دریائے رواں سے چند قطراتِ آب کی بخشش کہا جا سکے۔ مگر تم نے تو ایک گروہ کو اپنے رشحاتِ قلم سے حیاتِ جاوداں عطا کی ہے اور ہر ایک کو نیکی سے یاد کیا ہے پھر یہ کیا ہوا کہ ردیف الف میں حضرت مفتی صدرالدین آزردہ کے اشعار پُر دیں نثار کے ترجمہ سے تم نے اپنے قلم کو گوہر فشاں نہیں کیا۔

اگرچہ ان کے خدام پر جیسی مقام کا تذکرہ اس فن (ریختہ) کے جریدہ میں ان کے شایانِ شان نہیں لیکن اگر فرطِ محبت کے زیرِ اثر یہ جرأت کر لی جاتی تو کوئی گناہ بھی نہ ہوتا۔ اور اس کی تلافی نیازمندانہ عذر خواہی کے ذیل میں نہ آتی۔

اسی طرح ردیف الف میں حضرت آشوب کے ترجمۂ احوال کے باب میں بھی میں کشمکش میں پڑا ہوا ہوں۔ مجھ نامہ نگار کی دانست میں آشوب اس دیار کے اعیان سادات میں سے ہیں ان کا اپنا نام میر امداد علی اور ان کے والد کا نام میر روشن علی خاں ہے اور اس نسخہ میں امداد علی بیگ کے نام سے ان کا تذکرہ آیا ہے مجھے امید ہے کہ ان دونوں کے ترجموں کے بارہ میں مجھے آپ سے ایک خاطر نشان جواب کی توقع ہے

تذکرے کی چاروں جزو خدمت والا میں واپس بھیجے جا رہے ہیں۔ جب تحریر و نگارش کا سلسلہ ختم ہوا اور ان کی شیرازہ بندی ہو جائے تو یہ مجھے واپس کر دیے جائیں۔

والسلام

ایضاً

[۶۷]

فرد۔ بود شِ از شکوہ خطرے ور نہ سرے داشت بمن
بہ مزارم اگر از مہر بیاید چہ عجب "

داس اندیشے نے اسے روک دیا کہ میں شکوہ ضرور کروں گا ورنہ اتنا خیال تو اُسے

ممکن تھا کہ وہ میرے مزار پر آجاتا اور یہ کوئی عجیب بات بھی نہ ہوتی۔)

نگارش کے وقت آنکھیں اس بری طرح اشکبار ہوئیں کہ خط کا کاغذ نم آلود ہوگیا، سوادِ صفحہ کو پڑھا نہ جا سکا اور ملفوف خط کی تہوں کو کھولنا دشوار نظر آیا۔ لاجرم ایسے کسی مکتوب کا جواب اگر دیر سے دیا جائے تو یہ بات بعید از قیاس نہیں کہی جا سکتی اللہ اللہ اہل وطن سے آپ کس قدر کبیدہ خاطر تھے کہ دہلی کو چھوڑ کر جہانگیر آباد پہنچ گئے اور پھر جہانگیر آباد سے بھی لکھنؤ کا رُخ کر لیا۔ خدا کرے کہ وہاں یارانِ پری چہرہ کا دیدار اور جادو نگار شعرا کی بزمِ سخن رنجِ راہِ سفر کی تلافی کر دے اور اگر اس کے ماسوا کوئی خواہش ہو تو وہ بھی پوری ہو جائے۔

مشفقی غلام علی خاں کے خط نے مجھے آزردہ خاطر کر دیا اور چونکہ اس کے سرِ رشتہ کا حال مجھے معلوم نہیں کہ انجامِ کار کیا ہوگا اس صورتِ حال سے کچھ اور بھی زیادہ افسردہ دل زدہ ہوں اس زمانہ میں مجھے سخن کے ساتھ اور ذوقِ سخن کو میرے ساتھ زنجیر سے تو باندھا نہیں جا سکتا میرے دل کا حال تم جانتے ہو اب تو جیسے وہ کبھی میرے پہلو ہی میں نہ تھا۔ اس حالت میں — سخن گوئی سے جیسے مجھے مَس ہی نہ رہا اور میری زبان پر جیسے کہ طرزِ گفتار بھول گئی۔ میں نے دو رباعیاں کہی ہیں۔ وہ بھی اسی ورق پر نقل کرتا ہوں۔

کس را نبود رخے بدنیاں کہ تراست
پاکیزہ تنے بخوبیٔ جاں کہ تراست
گفتی کہ زہیچ فتنہ، پروانہ کنم،
آہ از چشمِ بدخوباں کہ تراست

(کسی کو ایسا روئے جمیل کہاں دیا گیا ہوگا ترا جسم کچھ ایسا پاکیزہ ہے کہ وہ سراپا جان معلوم ہوتا ہے۔ تو کہتا ہے کہ مجھے کسی فتنہ کی پرواہ نہیں لیکن حسینوں کی نظرِ بد کا تو خیال تجھ پر اتنا پڑتی ہے۔

اے دوست بسوئے ایں فرو ماندہ بیا
از کوچہ عزیز راہ گرداندہ بیا۔

گفتی کہ مرا نخواں کہ من مرگ توام
بر گفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

اے دوست مجھ فرو ماندہ کی طرف آ غیر کے کوچہ سے عنان توجہ کو پھیرلے اور ادھر کی طرف رُخ کر۔ تو نے یہ کہا ہے کہ مجھے مت بلا کہ میں تیری موت ہوں۔ تو اپنی بات پر قایم رہ اور ناخواندہ یعنی بن بلائے آجا۔

والسلام مع الاکرام

ایضاً
[۶۸]

فرد می رنجد از تحمل ما بر جفائے خویش
ہاں شکوہ کہ خاطر دلدار نازک است

(اپنی جفاؤں پر ہمارے صبر و تحمل کو دیکھ کر بھی وہ خفا ہوتا ہے۔ اس سے شکوہ کیا جائے تو کیسے کہ ہمارے اُس محبوب کی خاطر عاطر تو بہت ہی نازک ہے۔)

جناب نواب صاحب۔ آپ نے رسم نامہ و پیام اٹھادی یہ خیال ہی انداز گفتگو میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے اور جب کردار میں آجائے تو اس کے بارے میں پوچھنا ضروری ہوجاتا ہے اور یہ صورت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ اس سے متعلق دوبارہ گفتگو کی جائے۔ اگر بے پرواہی ہے تو پھر یہ نہ ہونا چاہئے اور شکیب آزمائی ہے تو اس کا یہ انداز مناسب نہیں اگر وہ (بے پرواہی) ہے تو میں اپنی ناکسی کے باعث کسی عزیز کے التفات کے لائق نہیں۔ ناکسوں کو بات کہنے پر انگیز کرنا اور بے وقار لوگوں کے شکوہ کا ننگ اپنے لیے قبول کرنا آخر کیوں اور اگر یہ بے محابا تغافل اور جانگزا فراموشی ہے تو مجھ ایسا گناہ گار گلہ سند کیوں نہ ہو۔ معذرت خواہ کو معافی کا موقع نہ دینا آخر کس کا قصور ہے کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ کی طرف سے نامۂ عنایت آیا اور مہربانی کی ہوا چلی ہو تو میری طرف سے جواب میں نیاز نامہ ارسال نہ کیا گیا اور

اس کی راہ میں آرزو فشانی سے میں نے دریغ کیا ہو۔

میں خود اندوہ و ملال کی فراوانی کی وجہ سے کہ مجھے ہر طرف سے نرغے میں لیے ہوئے ہے بے طرح ناسازگاریٔ حالات کا شکار ہو گیا ہوں۔ خوش سوادیوں کے ساتھ سانس لینا اور ادائے خاص کے ساتھ باتیں کرنا مجھ پر اس حد تک گراں ہے کہ اگر میری آنکھیں نامۂ عنایت کی دید سے اچانک روشن اور دل نشاطِ تحریر سے زمزمہ سرا ہو جائے تب بھی اپنے دل کو اندوہ و ملال کے گرداب سے موکشاں باہر لانا اور ایک گونہ زور دستی سے خود کو نغمہ سرائی پر آمادہ کرنا ممکن نہ ہوگا۔

نہ میں منشورِ والا کی نظارہ فروزی کی سپاس گذاری کر سکتا ہوں اور نہ غزل کی دل نوازیوں کی ستائش۔

فرد چہ نویسم بہ تو در نامہ کز انبوہ غمے
نیست ممکن کہ روانی ز عبارت نرود

(میں تجھے خط کیا لکھوں کہ غم و اندوہ کی فراوانی کے باعث یہ ممکن ہی نہیں کہ میں اگر کچھ لکھوں تو عبارت کی روانی غائب نہ ہو جائے۔)

درماندگی کی داستان اب اسی طرح بیان ہو سکتی ہے کہ اُسے بیان نہ کیا جائے اس ہنگامے کی آشفتہ سری کو اسی طور پر سمجھایا جا سکتا ہے کہ وہ تحریر میں نہ آئے خدا کرے کہ جلد ہی وہ وقت آئے کہ دوری و مجبوری کے رشتے منقطع ہو جائیں اور دل ہمزبانی و ہمدمی سے آسودہ ہو۔

ایضاً

[۶۹]

فرد ترسم ارہم بکعبۂ اسلامیان نہند
گم کردہ ام بوادیٔ شوق تو راہ را

(مجھے ڈر ہے کہ میری راہ مسلمانوں کے کعبہ کی طرف جا رہی ہے اس لیے کہ میں وارفتگیٔ شوق میں کچھ ایسا محوِ سفر ہوا کہ راستہ ہی بھول گیا۔)

آتشِ خس پوش بلکہ چراغِ خاموش کہ صورت پرست اُسے اسداللہ روسیاہ کہہ کر پکارتے ہیں "دوست" سے اس معنی میں شادمان ہے کہ کعبہ سے واپسی اگر "رہ آورد" کے طور پر "تردماغی" کو اپنے ساتھ نہ لائی ہو تو یگانگت کے رشتے کے واسطے مزید استحکام کا باعث ہوگی اور اپنے طور پر وہ اس اندیشہ کے سبب آزار میں مبتلا ہے کہ سفر کعبہ کی زحمت کشی کو اگر اپنی خستگی کے ذیل میں شمار کریں گے تو ظاہر ہے کہ اجر و ثواب کا سرمایہ کہ سفر حج کرنے والے کا دامنِ خیال، جس کی فراہم گاہ ہوتا ہے" برباد ہو جاتا ہے۔

ہر چند اس افسردہ دلی کے سبب کہ دوسروں کی طرف دوست کی نگاہِ التفات کا رشک اور اس کی نظر میں خود اپنی "ہیچ مقداری" کا احساس ہے خط لکھنے کا ارادہ نہ تھا۔ لیکن ایک عمر ہو گئی کہ میں ابوالفیض فیضی کے اس شعر کو اپنا زمزمۂ دل بنائے ہوئے ہوں اور اس ہوس میں کیف و انبساط محسوس کرتا ہوں کہ جب میں گردِ راہ سے آلود "دوست" کے پاؤں کو اپنے آبِ دیدہ سے دھوؤں گا اور یہ چاہوں گا کہ کچھ باتیں چشمِ روشن کے انداز سے کہوں تو فیضی کے یہی دو مصرعے میرے طائرِ آواز کو پر و بال بخشیں گے۔

حاجئ بادیہ پیما ز کجا می آئی
خبرے داری اگر از رہِ مقصود بیار

(اے بادیہ پیمائی کرنے والے حاجی تم کہاں سے آرہے ہو اگر رہِ مقصود کی کچھ خبر ہے تو مجھ سے بھی کہو۔)

اب موقع یہ ہے کہ واپس آنے کی خوشی جسے میں نے "برگشتن" سے تعبیر کیا ہے فراوان و بے حد ہے اس پر اچانک جان دینے کو جی چاہتا ہے ناچار میں نے نئے خامہ کو اس زمزمہ خیال کا رشتہ ساز تصور کیا اور خود کو سخن و صدائے سخن سے وابستہ کرنا پسند نہ کیا۔

والسلام

ایضاً

[۲۰]

طوطیاں شیریں سخن کے ولیٔ نعمت، ہنوز گلشن التفات کی گل باریوں کے باعث شش جہت میں بہارِ تازہ کی خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں۔ یعنی صحیفۂ بہاریں کے ورود کی شادمانیاں فضائے دل سے رخصت نہ ہوئی تھیں کہ شجر مہر و محبت نے دوبارہ لطف و کرم کے ساتھ ثمر افشانیاں شروع کردیں۔ آموں کے آٹھ ٹوکرے پہنچے اور میری آرزو خرامی پر آٹھ بہشتوں کے دروازے کھول گئے۔

یہ پاکیزہ اور شیریں آم اے سبحان اللہ! شکل دیکھو تو دودھ سے دھلے ہوئے اور سیرت کا خیال کرو تو شہد میں گھلے ہوئے۔ تازگی پر نظر کیجیے تو آبِ حیات کی لطافت کا گمان ہوا اور یہ خیال گزرے کہ انھیں دمِ مسیح کے لطفِ تاثیر نے پرورش کیا ہے۔ اپنی شیریں صفات میں وہ شکر سے بڑھ گئے اور انھوں نے خسرو پرویز کا دل جیت لیا۔ غرض کہ آم اپنی پاکیزہ گوہری کے باعث ابر و باد کے خانوادے کی آبرو ہے اور اپنے حسن پیکر کے اعتبار سے دودمانِ شاخ و شجر کا چشم و چراغ۔

ابرِ نیساں نے جب تک اس گراں بہا ثمر کی صورت میں اپنی عرق ریزیوں کا صلہ نہ پایا زمانے کی زباں زدگی کی رُو سے وہ اپنے دفترِ آمال کو آبِ گہر سے نہ دھو سکا اور موتی برسانے والا بادل نہ بنا۔

رگِ تاک اگر یہ جانتی کہ آب بننے کا مطلب کچھ اور ہے اور بادۂ ناب بننے کے معنی کچھ اور تو اس شیرۂ لطیف کی چاشنی سے ہرگز آب دار نہ بنتی اور ثمر آفریں نہ سمجھی جاتی جب تک اس صورت پذیری کے عمل میں وہ لوگوں کو دردِ سر نہ دیتی۔

فشار و افشردگی کی بات الگ ہے اور اس میوۂ نغز کی خوش ذائقگی اور لطافت ایک امرِ دیگر۔ نخلِ خرما ہرگز خاک سے سر نہ اٹھاتا اور اپنے قدِ بالا کی درازی کے لحاظ سے زمین پر گر کر فروتنی کا اظہار نہ کرتا جب تک کہ اپنی اس نمودِ بے بود کے لیے ابلہی سے منسوب نہ ہوتا اور انگشت نمائے خلق نہ بنتا۔ زبانِ خامہ کی شکر فشانی

کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے ثمرہائے پیش رس، اس میں آدھے کچے اور آدھے پکے ہیں۔

سبحان اللہ شاخِ طوبےٰ کا میوہ اگر پختگی میں یہی خوش رنگی رکھتا ہے اور خامی میں یہی دل آویز خوشبو تو میں ضامن کہ اہلِ بہشت ہرگز شرابِ طہور کی طرف مائل نہ ہونگے۔ اور باغِ بہشت کے سبز پوش کسی کا دل نہ چُرا سکیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر پختہ ہو کر یہ سنہرے رنگ میں نہ بدل جائے جو ایک کرشمۂ کار سازی و عنایت ہے کہ بے نواؤں کے کام کو روزِ فردا پر نہیں چھوڑا گیا اور اُن کی آرزو کی یہیں تکمیل ہوگئی۔ یہ پھل جو اپنے پہنچنے کے وقت سے پہلے پہنچ گئے ہیں وہ گرمیٔ خون وذوقِ تپش کے باعث ہے کہ دل جوئی میں کسی نوع کی تاخیر روا نہیں رکھی گئی۔

دل نے کہا کہ اس رمز کو یوں بھی خاطر نشان کیا جا سکتا ہے کہ جو پختگی کے بعد زرد ہوتا ہے وہ نہایتِ شوق ہے کہ میں اس پر خوش ہوں ___ یہ ایزدی عنایت مجھ پر فراوانی کے ساتھ ہوا اور جو وقت آنے سے پیش تر آگئے وہ گویا مژدۂ وصل لے کر آئے ہیں کہ میں اس کا آرزومند ہوں کہ میرا نام دوست کی زبان پر رہے۔

ایضاً

[۷۱]

جنابِ عالی دو تین روز ہوگئے کہ ذوقِ ہم زبانی کو جگر تشنۂ نامہ نگاری اور اندیشۂ خیال کو بہانہ شماری دیکھتا ہوں ہاتھ قلم کے ساتھ آویزش میں گستاخ اور قلم صفحۂ کاغذ پر روانی میں دل تنگ۔ شوق، دل سے ایک تقاضہ سنج سائل کی طرح طلب گاریوں میں معروف ہے اور دل اس شوق سے اس کریم النفس کی طرح شرمسار جس کا ہاتھ بالکل خالی ہو۔

عجیب تر بات یہ ہے کہ میں خود اپنی خواہش کے ساتھ نبرد آزما ہوں اور سوچ کے ساتھ ہم دم و دمساز۔ اس ستیزو آویز میں نہ آرزو کی طرف داری ممکن ہے اور نہ کسی حیلہ سے اندیشہ پر فتح یابی۔ وہ سبک سری کے باعث بے طرح مائلِ سخن ہے اور اسے سنجیدگی کے زیرِ اثر لب کشائی میں تامل۔

پیمانۂ نگارش اگر بغیر خواہش کے ہم دست نہ ہو تو ظاہر ہے کہ کسی دوسرے وسیلہ سے اسے بہم پہنچانا معلوم' میں کیا ہوں جو پیدا نہ ہوا اس کو پیدا کرنے کا حوصلہ رکھوں۔ نگاہ کو جس کی دید کا یارا نہیں بخشا گیا' وہ دھوپ کی شدت اور آفتاب کی شعلہ رُخی ہے۔

خدا کی پناہ اگر اس کی ایک فصل تحریر کی جائے تو قلم خس کے تنکے کی طرح جل اٹھے اور پرزۂ خط کے ساتھ خود کو بھی جلا دے یہ تو ممکن ہے کہ میں دو تین سطر لکھوں اور آب دیدہ کے وسیلہ سے قلم اور کاغذ دونوں کو جلنے سے بچائے رکھوں۔ لیکن میرا دل میرے نامہ بر کے احوال پر جلتا ہے کہ جب اس بے چارے کے دل میں آگ لگ جائے۔ حرف اس کے لبوں پر نشانِ سکوت اور رفتار اس کے پیروں کے لیے حلقۂ زنجیر بن جائے تو اس کی چارہ سازی کیسے ممکن ہے۔

روسیوں کی شاہِ ایران کے ساتھ آویزش ہے یہ دونوں گروہ مل کر ہندوستان کی طرف رخ کرنے والے ہیں۔ یہ افواہیں دیو و پری کے افسانے سے زیادہ اور کچھ نہیں خردمندوں کے لیے زیادہ مناسب یہی ہے کہ وہ ان باتوں پر کان نہ دھریں اور ایسی کوئی بات اپنی زبان پر نہ لائیں۔

زمانہ کے گرم و سرد کا ذکر ایک طرف اور شہریاروں کی صلح و جنگ کی باتیں یک سو۔ دوست کی جانب سے خط نہیں آیا کہ یاد آوری کا سپاس گزار ہوا جائے کوئی غزل بھی روشناس نظر نہ ہوئی جسے حسنِ گفتار کے لیے سراہا جائے۔

آموں کے موسم کی ثمر افشانیاں ختم نہیں ہوئیں کہ میرے لیے شکوہ سنجی کا کوئی موقع ہو۔ میں نے اس اثناء میں کوئی غزل بھی نہیں کہی کہ اسے ارسال خدمت کروں اور جواب کے لیے نگاہ بر ہگزار رہوں۔ گفتگوئے مہر و وفا سے زبان ناآشنا ہے اور داستانِ اشتیاق کے بیان میں گویائی نارسا' لاجرم لب اس زمزمہ سنجی سے خاموش ہیں اور گلہ گذاری سے نامحرم اس سے پہلے کہ کوئی شکایت یاد آتی ہے میں اُسے بھول جاتا ہوں۔

ایضاً

[۴۷]

روح کو تن کی طرف سے نذرانۂ سپاس اور خواجۂ عالی مقام کو اس بندۂ عاجز کی طرف سے سلام نیاز۔ جمعہ کا دن جب رات میں بدل گیا تو بزم سخن آراستہ کی گئی۔ اس لیے کہ میں نے نہیں کہی تھی تہی دستی کی شرم کے باعث میں سر بگریبان تھا اور انجمن میں پہنچنا میرے لیے ایک ایسا مضمون کہ ہرگز میرے پیرامونِ خاطر میں اس کا گزر نہ تھا۔

محبت والا جاہ نے نواب ضیا الدین احمد خاں نے کہ ایزد تعالیٰ ان کو سلامت رکھے دو فرشتے میرے لیے مقرر کر دیئے یعنی زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محو۔ یہ دونوں ابرام پیشہ گماشتے میرے خلوت کدۂ تنہائی میں آئے اور ہاتھی لے کر آئے اور جیسا کہ شیر کو شکار کر کے ہاتھی کی پشت پر بار کر کے لے جاتے ہیں مجھے انجمن میں لے گئے میرے مخدوم و محترم اور صدر الصدور اعظم مولوی مفتی صدر الدین خاں بہادر کی زیارت نے رنج راہ کی تلافی کر دی۔

میرے ساتھ کے لوگوں کی خواہش یہ ہوئی کہ مولانا سحائی نے اس وقت تک قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا۔ اس لیے مولانا صہبائی غزل پڑھیں جو طرحی زمین میں تھی اس میں دو تین شعر بہت دل نشین تھے۔ جب غزل خوانی ختم ہو گئی تو ایک نئی زمین۔

"گر بیا تم نمی آید، داما تم نمی آید"

بحر ہزج مثمن سالم میں طرح کی گئی۔ میرے دوستوں میں سے زین العابدین خاں عارف اور جواہر سنگھ جوہر نے زمین طرح میں دو غزلیں پڑھیں اور دلوں پر اپنی نغز گوئی کا نقش بٹھا دیا۔ میں نے وہ غزل پڑھی جو کسی دن کہی تھی اور نغمہ سرا ہوا۔

غزل

صبح شد خیز کہ رو داد اثر بنمائیم
چہرہ آغشتہ بہ خونِ نابِ جگر بنمائیم

(صبح ہو گئی اے مرے محبوب اب اٹھ جا تاکہ تو یہ دیکھ لے کہ میری تمام رات کی آہ وزاری کا اثر کیا ہوا۔ اور اس چہرے کی طرف نظر کرلے جو میرے ہی خونِ تمنا سے آلودہ ہے۔)

نامہ نگار اسد اللہ بست وسوم ماہ مارچ ہنگام نمازِ عصر کہ ابر قطرہ فشاں اور ہوا ژالہ بار ہے۔

ایضاً
[۳۰]

شام کا وقت تھا کہ عطوفت نامہ پہنچا اور میری غزل کے پہنچ جانے سے مجھے مطلع کیا۔ گرمیٔ ہنگامہ فزوں تر ہو گئی۔ کل کہ ستارۂ ناہید (بدھ) کا دن تھا۔ بعد شام میں حضرت آزردہ کی بزم میں باریاب ہوا۔ اس سے پیشتر کہ حرفِ مُدّعا میری زبان پر آتا میں نے رنجوری کے آثار کو اپنے مخدوم کی پیشانی میں آشکار پایا۔ نزلے، زکام کی شکایت تھی اور اس کا اظہار ہو رہا تھا کہ کئی راتیں انھوں نے جاگتے ہوئے گزاری ہیں۔

مختصر یہ کہ مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے۔ مجھے جانے کی رخصت دی۔ میں نے ریختہ گویوں کی انجمن میں بہت سے شاعروں کا مجمع دیکھا لمبی لمبی غزلیں ان لوگوں نے پڑھیں یہاں تک کہ جب میں گھر واپس آیا اور بستر پر لیٹا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔

غزل خوانی کے سلسلے میں جب مجھ تک نوبت پہنچی تو میں نے "ملک نخواست فلک نخواست" زمین میں کہی ہوئی اپنی غزل سنائی۔ اس کے بعد طرح پر انشار کی ہوئی غزل پڑھی۔

غزل

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نمی آید
بنوعِ گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

(بھلا اس وعدے پر میں کیا خوش ہو سکتا ہوں جس کے انداز پر ہی مجھے یقین نہیں۔ اس نے کچھ اس طرح سے کہا کہ میں آرہا ہوں کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ہرگز نہیں آئے گا۔)

مخفی نہ رہے کہ اقبال نشان محمد ضیا الدین خاں بہادر نے عرفی کے اس مصرعے کو بطور طرح تجویز کیا ہے۔

ع "صد سال می تواں بہ تمنا گریستن"

اس زمین میں طالب آملی کا بھی ایک قصیدہ ہے اور عرفی شیرازی کی غزل اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ شعر لے پیشین غالب بے نوا کو کس طرح زمزمہ سنجی پر آمادہ کرتے ہیں۔

والسلام مع الاکرام

ایضاً

[۴۶]

رباعی

اے شمع بزم ماتم قاتل چگونہ
غم را نشان گرمیٔ محفل چگونہ
اے گوہر دل تو بجانے خریدہ دوست
با دوستاں چگونہ و با دل چگونہ

اے شمع بزم ماتم قاتل، اے کہ تو قاتل کی بزمِ ماتم کے واسطے شمع ہے یہ تو بتا کہ کس حالت میں ہے۔ تو کہ دل غمزدہ کے لیے نشانِ گرمیٔ محفل ہے اپنا حال تو کہہ تیرے گوہرِ دل کو تجھ سے محبت کرنے والے نے اپنی جان کی قیمت دے کر خریدا ہے۔ اب تو یہ بتا کہ دوستوں کے ساتھ تیرا سلوک کیا ہے اور دل کے ساتھ تیرا کیا معاملہ۔ کس طرح ہے۔

جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے اور اب جیسا کہ میں سن رہا ہوں (ہر دو صورت میں) آپ میرے امیدگاہ ہیں مجھے توقع ہے کہ یہی فرخندہ منشی جسے "شکیبائی" کہا جاتا ہے میرے دل کو توانائی بخشے گی اور فرار کے بجائے کہ سراب زار شوق ہے دل کو آسودہ خاطری کی طرف لائے گی۔

اس فشارِ اندوہ میں جیسا کہ ہوتا بھی ہے پرششِ غم کے وقت میرے ہر بنِ مو سے خون کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں اور میں غمگساری کی توقع کے ساتھ اس انجمن کے ماسوا

اور کسی طرف رُخ نہیں کرتا۔ دیدار کے واسطے میری طبیعت کو رغبت بھی بس ایک ہی بار ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی آشفتہ سری کے باعث ایسا سوچتا رہا ہوں۔ سبب میرے دوست کی کوچک دلی ہے جس نے مجھے گوناگوں اندیشوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

وارستگیٔ مزاج کے باعث میری زبان سخت اور میرا دل نرم ہے اور خوئے دوست اس سے بھی سوا نازک اور بندِ غم گراں تر۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دیدار کرنے والی آنکھیں دیدہ ہائے اشکبار میں بدل جاتیں اور میری کنارا جوئی کی بھری بزم میں آبرو ریزی ہوتی۔ اگر دل قابو میں بھی رہتا تو زبان پند و نصیحت پر مائل ہو جاتی اور جنبشِ لب دوست کی طبع نازک پر گراں گزرتی۔

غرض کہ میں دوست کا غم خواری میں جان سے ہاتھ دھو لیتا اور جو کچھ میرے دل میں ہوتا کہہ ڈالتا۔ اور دوستوں کے لیے ایک بے درد انسان بن جاتا۔ صرف اسی کشمکش میں دل اندھیرے اور اسی سوچ میں راتیں صبح ہو گئیں تا اینکہ دن چڑھے میں ہمایوں کدے کے دروازے پر پہنچا اور آستاں نشینوں سے میں نے یہ سنا کہ بندگان بارگاہ جہانگیر آباد گئے ہوئے ہیں اور کچھ وقت کے لیے خود کو اس پریشانی سے الگ کر لیا ہے۔ میں نے کہا خدا ملاذ زمان والا پر مہربان ہوا اور اندیشۂ صائب سے تقویت بخشے

باوجودیکہ میں نے یہ سن لیا ہے پھر بھی میرا دل کشاکش سے رہائی نہیں پاتا اور میرے سینہ میں تڑپتا رہتا ہے ہاں یہ اندازہ شناسی کے باعث ہے کہ میں اپنے نامہ کو طول نہیں دیتا اور اس آرزو کے ساتھ سلسلۂ سخن کو تاہ کرتا ہوں کہ آں محب گرامی جواب نامہ تحریر فرمائیں تو بات اس طرح زبان قلم پر آئے کہ جو کچھ دل میں ہے وہ اس پردہ سے ظاہر ہو جائے بلکہ خود پردہ درمیان سے اٹھ جائے تاکہ میں یہ جان سکوں کہ آں عزیز والا کے دل اور میرے نصیب میں کیا ہے۔

آپ کو اپنے غمِ دل کے بارے میں کیا کرنا چاہیے اور ہمیں آپ کے غم میں کیسے جینا چاہیے۔ خدا آپ کو بخت سازگار، دلِ دانا اور دانشِ سودمند ارزانی فرمائیے۔

نگاشتہ دو می روز از ماہ روزہ

ایضاً

[۵۷]

میرے امید گاہ۔ جمعہ کا دن تھا جب بزمِ سخن کی نوید سامعہ افروز ہوئی۔ شام کے وقت وہی دو مبارک فرشتے دروازے سے آئے اور مجھے اپنے ساتھ اس انجمن میں لے گئے۔ میر نظام الدین ممنونؔ اور مولوی امام بخش صہبائیؔ کی طبیعت ناساز تھی اس لیے وہ نہیں آسکے۔ حضرتِ آزردہؔ کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا گیا اگرچہ دیر سے آئے لیکن اُن کی آمد نے میرے دل کو صفا اور میری زبان کو نوا بخشی۔

اس بندۂ عاجز کو "گریستن" والی زمین میں نگارشِ قصیدہ کا اتفاق ہوا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس ورق کو ناپسندیدہ متاع کی طرح واپس لے جاؤں اور ریختہ گویوں کو دردِ سر میں مبتلا نہ کروں۔ حضرتِ آزردہ کے آنے سے میرا دل بڑھ گیا اور میری زبان کو زمزمہ سنجی کی اجازت مل گئی۔ سحابی بھی بن بلائے وہاں حاضر تھا وراس زمین گریستن میں اس نے ایک غزل لکھی تھی۔ جب میرے قصیدے کو سُنا تو شرمندہ ہوا اور یہی ہوئی اپنی غزل کے چند اشعار سُنا کے واپس لوٹ گیا۔ آج میں اس خیال میں تھا کہ قصیدہ ایک ورق پر لکھ لوں اور آپ کے درِ دولت کے پرستاروں کی دید کے لیے اُسے روانہ کروں۔ دوپہر تک فرصتِ نگارش نہ ملی اور نمازِ ظہر کا وقت تھا کہ شہابی اور فتاحی آگئے۔ اس کی آستین گویا آنسوؤں سے بھیگی تھی اور اِس کے ہاتھوں میں ایک خوش رنگ گلدستہ تھا۔ یعنی آپ کا نامۂ مبارک جو ڈاک میں آیا تھا، فتاحی نے مجھے سپرد کیا وہ چلے گئے اور بارش برسنا شروع ہوئی۔ بادل قطرات آب برسا رہے تھے اور میں والا نامہ کے صفحے سے موتی چن رہا تھا۔ یہاں تک کہ میرا گھر پانی سے اور میرا دامن آبدار موتیوں سے بھر گیا۔

سبحان اللہ کیا غزل ہے اور کیا اندازِ بیان آپ نے سخن کے مرتبے کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا اور شاعری کو زمین والوں پر نوازش کرنے کی غرض سے آسمان سے زمین پر اتار لائے اور زمزمہ سرا ہوئے اس طرح سخن سرائی آپ کا حق ہے۔ اگر ہم

اس کی ستایش سے بھی عہدہ برآ ہو جائیں تو ہمارے لیے یہ بڑے فخر و ناز کی بات ہوگی۔ زیادہ زیادہ

ایضاً

[۷۶]

بہ وصف یکرنگی زبان یعنی پارسی ناآمیختہ بہ عربی

فرد

بے تو گر زیستم سختیِ ایں درد بسنج

بگذر از مرگ کہ وابستہ بہنگامے ہست

(اگر میں تیرے فراق میں زندہ ہوں تو یہ سوچ کہ میں نے درد جدائی کی کس شدید تکلیف کو برداشت کیا ہے۔ یہاں موت کی بات بے معنی ہے کہ وہ تو کسی خاص ہنگامے یا وقت پر موقوف ہے۔)

اس شیوۂ عالی پر طمانیتِ خاطر کے ساتھ شاد و آباد رہیے کہ جب تک زبان حرکت کرتی ہے اس قادر توانا کی سپاس گزاری واجب ہے کہ ہر گونہ ثنا و ستایش جس کی ذات پاک کے لیے ہے خود قوتِ گویائی اسی کا سازِ آہنگ ہے۔

وہ کون ہوگا جو اس شیوۂ دل کشا اور اس کی رواں افروزی کا پرستار نہ ہو اور اس بخشایشِ ایزدی پر آفریں نہ کہے، غور تو کیجیے کہ اس انبساط آگیں ہوا کو کس قدر نیرنگ نمائی اور روح افزائی کی قوت عطا کی گئی ہے کہ اس کے فرمان جنبش پر (جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے) فرزانوں کا دل بیتاب، زبان آمادۂ گفتار اور قلم سرگرم رفتار ہوتا ہے۔

مزید حیران کن بات یہ کہ اس ہوا کا نرم نرمک چلنا ایک ایسا دستور ہے کہ اندازِ سازگاری کے ساتھ اس کے لیے مقرر ہے تاکہ اس سے ان دو روشوں میں کوئی خلل نہ پڑے۔ جن کو زبانِ گویا کا حسنِ کلام اور خامۂ حرف نگار کا اندازِ خرام کہنا چاہیے فکر کا ان سے رشتہ بھی نہ ٹوٹے اور وہی ان دونوں کے پردہ سے بھی نمود پائے جو دل کی خواہش ہے۔

یہ ایک ایسی رنگین و شفاف حقیقت ہے کہ جب ہم روئے سخن کی طرف ذرا بھی توجہ فرما ہوتے ہیں تو یہ پردے اٹھ جاتے ہیں اور ایک جہان نو نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ یہاں آرزو کے واسطے عالم عالم روزِ بازار ہے اور آگہی کا رنگا رنگ سلسلہ اپنے ہنگاموں کے ساتھ جلوہ فرما۔

(آج وہ تاریخ ہے) جسے مسیحی تقویم یا آفتاب کے اندازِ رفتار کے مطابق ۲۲ اپریل کہا جاسکتا ہے۔ اب دیکھئے زندگی کیسے بسر ہوتی ہے اور یہ کہ میری چشم انتظار آپ کے نامۂ رنگاریں سے کب تابناکیاں حاصل کرتی ہے۔ خدا کرے آپ کی راتیں دن سے زیادہ روشن اور دن صبحِ نوروز سے زیادہ نور و سرور سے بھرے ہوں۔ آمین۔

ایضاً

[۷۷]

رشکِ طالب و فخرِ غالب۔ سلامت باشد

قصیدہ بہ زمینِ "گریستن" اس کے باوجود کہ میرے دل سے زبان تک پہنچ گیا اور میری زبان سے اس نے تراوش پائی اور خاطر نشان ہوا اُس غزل کو دیکھ کر جو آج مجھ تک پہنچی میں اُسے بھول گیا اور وہ میری نظر سے گر گیا۔ سبحان اللہ کیا غزل ہے اور کتنی عمدہ غزل ہے۔

اگرچہ میں نارسا بیان اور کج مج زبان ہوں لیکن اس کے ہر شعر کی تعریف میں ایک ایک قصیدہ لکھوں تو میں ایسا کرسکتا ہوں اور پھر اس کے مقطع کا کیا کہنا ارے قیامت۔ اس مقطع کی ستایش کس زبان سے ہو۔ اس کے باوجود کہ میں سخن سرائی میں آپ کا ہوا خواہ اور ستایش گر ہوں مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔ جاوداں رہئے کہ آپ نے پیکرِ سخن کو زندگی بخشی۔

جو مشاعرہ کہ ابھی پچھلے دنوں ہوا اس میں میری خاک زمین گیر ریختہ گویوں کی آنکھوں کا غبار نہ بنی۔ ایک ہفتہ اس سے پیشتر کہ غزل خوانی کا موقع آئے میں نے

اُسے حضرتِ آزردہ کی خدمت میں بھیج دیا خدا اُن کو قائم رکھے۔ میرا خیال تھا کہ جب آپ کا خط آجائے گا اور میں اس کا جواب لکھوں گا تو اس غزل کی نگارش بھی میرا سرمایۂ ناز ہو گی۔

اب کہ جناب کا والا نامہ پہنچا اسی وقت میں جواب دینے کے لیے بیٹھ گیا اور جب تک خط تمام نہ ہوا میں مائل بہ طعام نہ ہوا۔

فرد دیدم آں ہنگامہ بے جا خوفِ محشر داشتم
خود ہمہ شورے سکندر زیست در سر داشتم

(میں نے اس ہنگامے کو دیکھا ہے کہ اب خوفِ محشر رکھنا میرے لیے بے جا ہے آخر قیامت اس شورش کے علاوہ اور کیا ہے جو زندگی میں میرے سر کا حصہ بنی رہی۔)

والسّلام

(مکتوب منظوم)

۲۲

ہاں خواجہ بے پروا — من بندہ کہ غمناکم
وز غصہ جگر چاکم — آں روز کہ میر فتند
آں نامہ فرستادند — کز دیدنِ آں خوں شد
دل تا جگر از اندہ — گفتم چہ کنم غالب
چوں کار دگرگوں شد — میبایدم انیک رفت
تا مُغذر سخن خواہم — چوں گردو غبارے میکد
رفتن نہ توانستم — آں روز بشام آمد
لا بلکہ سیہ تر شد — سرماندہ ببالیں بر
چوں غم زدگان خفتم — ہے ہے چہ تواند خفت
آں خستہ اغم خوارش — برزخم نمک پاشد

وز دیدهٔ بیدارش — شورا بہ رواں باشد
چوں از افقِ شرقی — خورشیدِ درخشندہ
ناگاہ سرے بر زد — آتش بجہاں در زد
مرغِ سحری بر زد — رفتم بجگر کاوی
آں رازِ نہانی را — از دل بزباں دادم
در خلوت تنہائی — بے پردہ چو ہمرازاں
نے آمد و ہمدم شد — چنداں کہ دم اندازے
از مہر دمیدم من — چوں من بنوا آمد
واں نالہ کہ بر لب بود — از باطنِ نے سر زد
آندم کہ نفس با نے — زینگونہ کشاکش کرد
یک کاغذ نوشتہ — بودست بدستم در
چوں نامہ نمودے داشت — زاں شعلہ کہ دودے داشت
بر صفحہ نشانہا ماند — گفتم مگر ایں صفحہ
غمنامۂ رازستے — فہرست نیازستے
باید کہ فرو پیچم — دانگہ زنش بندی
زی خواجہ رواں سازم — کوتاہ بکنم گفتن
آں نامہ کہ من گفتم — تجاب زرِ دانہ
بردن و رواں کردند — ہر چند در اندیشہ
پیداست کہ خوش باشد — با خواجگی استغنا
با ایں ہم خوش نبود — پوزش نہ پذیرفتن
دیروز سحرگاہاں — روشن گہراں نیز
کش روح و رواں دانم — بل خوشتر ازاں دانم
دیوانِ نظامی را — آورد بسوے من

زینگونہ خواہد بُد   وز پردۂ گفتارش
کز ذوق بر بنجارش   ایں زمزمہ سرکردم
والا گہر اکبر خاں   خوانند سلام از من

ترجمہ

ہاں، اے خواجۂ بے پروا۔ میں کہ ایک غم زدہ انسان ہو، غم و اندوہ کے ہاتھوں میرا جگر پارہ پارہ ہے۔ جس روز کہ آپ جا رہے تھے اور مجھے خط بھیجا تھا مجھے دیکھ کر دل سے جگر تک میرا سینہ لہو سے بھر گیا تھا تو میں نے اپنے دل میں کہا تھا کہ اے غالب میں کیا کروں کہ اب تو میرا کام ہی دگرگوں ہو گیا ہے۔

مجھے اب جانا چاہئے تاکہ میں عذر سخن پیش کر سکوں چونکہ راہ گرد و غبار سے پُر تھی میں گھر سے باہر نہ نکل سکا دن رات میں بدل گیا بلکہ زیادہ تیرہ و تار ہو گیا میں اپنے بالین غم پر سر رکھ کر سو گیا۔ ہے ہے وہ غم زدہ سو کیسے سکتا ہے جس کا غم خوار اس کے زخموں پر نمک چھڑکتا رہے اور جس کے دیدۂ نمناک سے لہو کا دریا بہتا رہے۔

جب صبح ہوئی اور کنارۂ مشرق سے خورشیدِ جہاں تاب نمودار ہوا۔ اور ادھر سے اُدھر تک آسماں کی وسعتوں میں شفق کی سرخیاں پھیل گئیں اور صبح کے پرندے آمادۂ پرواز ہوئے۔ میں جگر کاوی پر مایل ہوا اور اس راز نہاں کو دل سے زبان پر لایا۔

گوشۂ تنہائی میں ہمرازوں کی طرح جو ایک دوسرے کے ہمدم ہوتے میں نے آئی اور میرے لبوں سے ہمدم ہو گئی۔ اور جیسے ہی کہ مہر و محبت کے ساتھ میں سینۂ نے میں اپنے نفس کو پھونکا تو میری طرح اس سے نغمے نکلنے لگے۔ اور میرے لبوں پر جو نالہ تھا وہ نے کے دل سے نوا پرداز ہوا۔

جس وقت کہ میرے نفس اور "نے" میں یہ کشاکش جاری تھی میرے ہاتھ میں ایک لکھا ہوا کاغذ تھا، اس میں بھی نالۂ نے کی طرح ایک انداز نمود اور شعلۂ

بے درد موجود تھا صفحہ پر تپش کے نشان نظر آرہے تھے میں نے اپنے دل میں کہا کہ شاید یہ ورق غمنامۂ راز ہے یا پھر فہرست نامۂ نیاز۔ اب مجھے اس ورق کو لپیٹ دینا چاہیے اس پر خواجۂ عالی مقام کا نام و نشان لکھ کر اس کو روانہ کردو۔

سخن مختصر، میں نے جس خط کے بارہ میں بیان کیا ہے دروالا کے حاجب اس کو لے گئے اور روانہ کردیا۔ ہرچند خیال کہتا ہے کہ ہر طرح آپ ہر طرح خوش و خرم ہوں گے خواجگی کے ساتھ استغنا اور وہ بھی اس پیمانہ پر شاید کوئی اچھی بات نہیں اور اس پر عذر و معذرت کا قبول نہ کرنا۔

کل صبح کے وقت، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں جسے میں اپنے لیے روح و رواں خیال کرتا ہوں میرے پاس نظامی کا دیوان لے کر آئے اس کے پردۂ گفتار میں اس طرح کے ذوق فزا شعری نغمے تھے کہ ان سے متاثر ہو کر میں نے یہ زمزمہ کیا والا گہر اکبر خاں کو میرا سلام پہنچے۔

ایضاً

[۲۸]

آں محترم کو جو اس نوشتہ کو پڑھ لیتے ہیں کہ ابھی تحریر نہیں ہوا اور اس راز کو جان لیتے ہیں جو ہنوز سربستہ ہے، مجھ سادہ مزاج کی طرف سے کہ پابند وفا ہے، زبان ذلم کی میانجی گری کے بغیر جواب نامہ لکھ کر بھیجا یا پھر یہ ہے کہ جو کچھ مجھے حرف راز کے لکھنے میں رگ خامہ سے ٹپک پڑا نامہ برکو از روئے نامہ قطع راہ میں وہی مرحلہ پیش آیا۔

سخن ناگفتہ بار دل ہے۔ یک گونہ بے ادبی کا عذر ہزار رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے جو دل پہ گزرتی ہے وہ زبان سے کیوں نہ کہوں۔ ہیہات، ورق سادہ کی توجیہ حروف اور لفظوں کو محو کرنے سے نہیں خال و خط کا نقش دل سے مٹا دینے کے عمل سے کی جانی چاہیے۔ کسی روئے سادہ پر آنکھوں کے سی دینے سے نہیں۔

فرد

گمان زیست بود بر منت ز بے دردی
بدست مرگ چہ بدتر از گمان تو نیست

(مجھ پر زندہ ہونے کا گمان تیری طرف سے ایک بے دردی ہے میں موت کے

پہنچے میں ہوں لیکن یہ صورت تیری بدگمانی سے تو بدتر نہیں ہے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کو اس بات کا خیال آیا ہوگا کہ خط نہ لکھنا اس سے بہتر ہے کہ خط لکھا جائے اور اس نگارش میں آیئنِ غزل نگاری کو فراموش کردیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ نے غزل نہیں کہی اگر اشعار کے موتی پروئے تو میری نگاہوں سے انھیں چھپایا ہے۔

میں کہتا ہوں اور ہزار بار کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر ستم روا رکھا گیا اور اپنی آمد کے بارے میں مجھے خط نہیں لکھا۔ میں کہ دوست، کی خواہش کی تکمیل پر چاہے وہ میرے واسطے سرتاسر آزار ہی کیوں نہ ہو شادماں ہوں۔ میں نے تو ہم پرستی سے سے اپنی بیماری کو اور بڑھالیا ہے۔ نہ لکھنے سے مجھے یہ خیال ہو رہا ہے کہ دیر سے آئیں گے خدایا جیسا کہ دوست کا گمان میرے بارہ میں غلط ہے، میرا خیال بھی اس دوست سے متعلق غلط ثابت ہو۔ والسلام

ایضاً
[۹۷]

فرد مردم ز فرطِ ذوق تسلّی نمی شدم
یارب کجا برم دل خنجر ستائے را

(میں اس لیے موت کے آغوش میں پہنچ گیا کہ فراوانیٔ ذوق کے باعث میں کبھی خود کو سکون سے نہ رکھ سکا اور اپنے اس دل کو تسلی نہیں دے سکا جو خنجر کو بے طرح نذرانۂ ستائش پیش کرتا تھا۔ آخر میں خنجر کی تعریف کرنے والے دل کو کہاں لے جاتا۔)

صبح کے وقت جب کہ میرا دل تکلیف شانہ سے اس بُری طرح مبتلائے آزار ہوتا ہے جس طرح ایک مومن مہر پیشہ کا دل ہمسایے کے رنج سے بے قرار نظر آتا ہے۔ میرے ہاتھ میں درد کی اذیتوں کے باعث رعشہ ہوتا ہے۔ ایک مبارک قدم فرشتہ صفت آدمی دروازہ سے اندر آیا اور نامۂ بہار ساماں اس طرح میرے سپرد کیا جیسے جیب تمنا میں کوئی پھول کھلا دے۔

ہر چند یہ خطِ سفارش امید کے لیے کیمیا اور دیدۂ جاں کے لیے طوطیا کا حکم رکھتا ہے جس نے اقبال کی پیشانی کو تاج اور پیکرِ آرزو کو زیورِ زینت عطا کیا۔ لیکن چونکہ نامۂ مقدس شعر و غزل سے اسی طرح خالی تھا جیسا کہ زاہد کا نامۂ اعمال مئے ارغواں اور شاہدِ سادہ رو کے ذکر سے خالی ہوتا ہے میرا دلِ سودا زدہ اس سے خوش نہ ہوا اور میرا خمارِ شرابِ شعر کے ان دو چار جرعوں سے نہ ٹوٹا۔

میں نے کہا نہ مژدۂ دیدار ہے کہ وجہِ دل بستگی ہو اور نہ کرشمۂ غزل کہ اس کی زمزمہ پردازیوں پر لب کشا ہو سکوں۔ ہر چند آغازِ حال میں دراز نفسی نے مجھے مائل بہ خروش کر دیا میرا دل چاہتا تھا کہ خواہی نخواہی غبارِ نالہ سراپردۂ گوش تک پہنچے کہ حقیقت نیوش ہے لیکن میری فطرت کی دور اندیشی آمادۂ ستیز نظر آئی۔

بعد ازاں کہ روئے کار کردگی سے پردہ اٹھا اور نارسائی فہم و ناتمامی دانش کا راز میرے ہم نفسوں پر افشا اور خود میرے خاطر نشاں ہوا تو میں اس عربدہ کاری کے آہنگ سے باز آیا اور خاموشی کی مہر میں نے اپنے لبوں پر ثبت کر لی۔ گاہ گاہ قاصد کے آنے اور مکتوبِ محبت کے پہنچنے سے میرا دل خوش ہوا۔ اس بزلہ سنجی کو دسترخوانِ گفتگو کے لیے شکر اور شکوہ طرازی کو مائدہ دوستی کے واسطے نمک خیال کیا۔

خواب خط میں جو اندازِ نگارش میں نے اختیار کیا اگر سوئے ادب کا خیال نہ ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجھے اس جرم میں ماخوذ نہیں کیا جا سکتا۔ نامۂ عنایت کی تحریر نے کہ طرزِ گفتار کی گراں مائیگی کا نمونہ ہے دردِ شانہ کے اثر کو کچھ اور بڑھا دیا اور میں کم و بیش دو ہفتہ اس رنجِ روز افزوں میں گرفتار رہا۔

جب شانہ کی یہ روح فرسا تکلیف ---- باقی نہ رہی اور ہاتھ اس بندِ گراں کی کشاکش سے آزاد ہوا تو قلم کو جنبش ہوئی اور صفحۂ قرطاس کھلا مجھے شکر کی بات یاد آئی اور شکوۂ سادہ کو رنگ آمیز زبان میں تحریر کر دیا۔

اب بغیر کسی تاخیر کے نگارشِ غزل سے مجھے شاد کام فرمائیں اس کے ساتھ اگر روز ہائے فراق کے کوتاہ ہونے کی نوید بھی پہنچ جائے تو کیا ہی اچھا ہو کہ آج خسرو درز

بعنج اسو میں فروکش ہے۔ دولت واقبال روز افزوں باد۔

ایضاً

[۸۰]

سبحان اللہ، عنقا شکار صیادوں نے جو ذات حق کے رمز شناس ہیں نقطۂ آگہی کو اس حلقۂ دام خیال کا دانہ بنا ڈالا ہے کہ کوئی شے وجود مطلق سے استفادہ کے بغیر "رنگ نمود" کو قبول نہیں کرتی اور پھر وہ شکل ہستی جسے فروغ وجود نصیب ہو جاتا ہے (کہ اس کے تئیں وجہ تابانی ہے) یعنی "برق پیرائی" اس کے ناصیۂ ہستی میں جلوہ گر ہوتی ہے اور "نیستی" کی تیرگی اس کے نشان وجود میں کسی طرح راہ نہیں پاسکتی۔

دوسرے یہ کہ دستگاہ کرم کے اندازے کے مطابق جو "نقش نمود" میدار فیاض سے بہرہ یاب نہیں ہوا اس کا "ورق پیدائی" "نگارۂ نمایش" سے سادہ رہا۔ اسے اپنے آئینۂ نمود کے واسطے وہی عکس معنی درکار ہے جسے "نقش نیم رخ" کہنا چاہیے اور جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہے اگر "فیض ہستی" عام ہے تو ہر نقش وجود اپنی جگہ تمام و مکمل ہے نیست (ہیچ) ہونے کے باوصف "نشاطِ ہمگی" سے بہرہ ور ہے اور "ناتمامی" کے باوجود "تمامیت " کے ساتھ نمود پذیر ہوا ہے۔

نیستی اصل وجود میں "ہمگی" کا رتبہ رکھتی تھی جب اُسے اپنے اس "سرچشمہ" کی طرف بازگشت میسر آئی تو "ہست و بود" کا ہنگامہ ختم ہوا اور عدم و نیستی کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔

سخن مختصر میری طبع نادرسا ایک زمانہ سے اس مسئلہ سے متعلق سوچ میں گرفتار تھی میرے اور میری عقل کے مابین پردہ در پردہ باتیں ہوتی تھیں تا اینکہ وقت سحر "پردۂ اسرار" سے ایک روزن میری آنکھوں پر کھول دیا گیا آگہی کا آفتاب چمکنے لگا اس روشنی میں رمز حقیقت کا سررشتہ میرے ہاتھ آیا۔ اسی طرح ناتمامی اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمام تھی۔ جب اس کا بڑا حصہ صورتِ وجود کو مل گیا تو تمام و ناتمام کا اعتباری تعلق باقی نہ رہا۔

یارب میں بھی کیا عجیب و غریب حقیقت ہوں کہ "نیستی" میں "ہمگی" کا رتبہ مجھے حاصل ہے اور ناتمامی میں مرادِ وجود "تمامیت" سے آشنا۔ میں سبک ہوتے ہوئے گراں ہوں اور برشتگی کے باوجود خام۔ میرا دل دردمند بھی ہے اور چارہ جو بھی اور میری زبان خودپسند بھی ہے اور طولِ کلام کی خوگر بھی۔ اب لازم ہے کہ رازگوئی کا خیال چھوڑ دوں اور رہ گزارِ فکر میں سنگریزے چننا شروع کروں تاکہ پائے سخن ان سنگ پاروں سے زخمی نہ ہو۔

مرے اس درد سے زیادہ کوئی جاں گداز غم کیا ہوگا کہ جب تک مری دکان فکر کا در کشادہ تھا اور رنگا رنگ متاعِ سخن فراوانی کے ساتھ اس میں موجود تھی، مشتریوں میں سے کسی نے دروازے پر دستک نہ دی اور خریداری کا سودا کسی سر میں نہ پیدا ہوا۔ جب دکان میں سامان نہ رہا اور حرف ہائے جگر گداز زبان سے غائب ہوگئے تو ایک بلند پایہ و گرانمایہ خریدار پیدا ہوا جو اپنے سخن کے نقدِ رائج کو میری گفتارِ ناسرہ کے بدلے میں بطور قیمت ادا کرتا ہے اور موتیوں کو خزفِ بے مایہ کے برابر تولتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ میں اگر سخن کو سخن کے مقابلے میں رکھتا اور آواز سے آواز ملاتا تو شرمسار نہ ہوتا۔ لیکن جو اداشناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خجالت اس شرمندگی سے بھی کچھ زیادہ ہے کہ کوئی شخص ایسی انجمن میں جہاں ہر کسی کی چادر میں موتی ٹکے ہوئے ہوں برہنہ تن جائے کہ خس پوشی سے بھی زبوں تر ہے۔

آپ سے کہ دکانِ بے رونق کے خریدار ہیں، ہمایوں نامہ کے ورود مسعود اور اس کی بخشی ہوئی مسرتِ فراواں کے بارے میں کیا کہوں کہ مجھے اس کے باوصف کہ اپنی جلائی چتا پہ تپا رہتا ہوں اس لمحہ میں یہ کیسے خود اپنے اوپر رشک آنے لگا۔ زمانے کے ستائے ہوئے کسی مجھ ایسے انسان کے حوصلے میں یہ سمائی کہاں کہ میں ایسی کسی خوشی کو برداشت کرسکوں اور میرے اندیشۂ بےخیال میں کہ (دورباشِ یاراں سے مضمحل ہے) اس پذیرائی و قبولیت کی تاب کجا۔ سوچتا ہوں کہ زمانہ مجھے آزار دینے پر کس قدر شرمندہ ہوگا جب

اس کے بدلے میں آپ ایسے کسی دوست کی توجہ فرمائی مجھے بے پایاں مسرت بخش رہی ہوگی اپنے احباب کو میں کس حد تک قدر ناشناس تصور کرتا رہا ہوں اب آپ ایسے کسی قدر شناس کی مدح جب اپنے بارے میں سنتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ شیوہ بیانوں کی زبان سے اپنی ستایش سننا کوئی آسان بات بھی نہیں اور اُس سے بھی کچھ زیادہ دشوار مرحلہ اندازہ دانوں کی طرف سے اداشناسی کی صورت ہے۔

قبلہ چالیس سال کی جگر کاوی کا حاصل یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کہا تھا اس کو اکٹھا کیا اور ایک ایسے آدمی کے سر پر نچھاور کر دیا جس کے فرق دان کی بلندی ستاروں سے باتیں کرتی ہے۔

اب کہ میری طبیعت کے زلال میں وہ روانی اور فکر کی آگ میں وہ گرمی باقی نہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خزانہ فراہم کرنے کے بعد صاحبِ خزانہ خود خفیف ہو گیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کے سلسلے میں روزِ ازل جو کچھ میری زبان کو بخشا گیا تھا وہ کہا جا چکا یہ خیال نہ فرمایا جائے کہ میں بہ تصنع یہ باتیں کر رہا ہوں مجھے دیکھئے اور دفتر اشعار پر نظر ڈالیے کہ اس غزل کے ماسوا جس کا مطلع و مقطع سنایا جا چکا ہے کوئی زمین خاطر میں ہوتی تو کوئی غزل ضرور ہو جاتی جو گذر چکا ہے وہی نظر سے گزر رہا ہے اور جو کچھ لکھا جا چکا وہی دوبارہ بھی نذرِ قرطاس ہو رہا ہے۔ اب اِسے صرف خیال فرمائیے کہ آسمان کو چھونے والی فکر اس زمین کی طرف مائل ہو اور ایک غزل گلدستۂ رنگ و بو کی شکل اختیار کرے۔

من بہ وفا مردم و رقیب بدر زد
نیم نیش رنگین و نیم تبر زد
در کشمکش بین و اعتماد نغوذش
گر کسے افگند ہم بہ زخم جگر زد
زاں بتِ نازک چہ جائے دعویٔ خونست
دست دی و داستے کہ او بہ کمر زد
کیست درین خانہ کز حظوظ شعامی

مہر نفس ریزہ با بروزن در زد
غیرت پروانہ ہم بروز مبارک
نالہ چہ آتش بہ بال مرغ سحر زد
دعوی او ورد ابود دلیل بدیہہ
خندۂ دنداں نما بہ حسن گہر زد
لشکر ہوشم بزور می نہ شکستی
غمزۂ ساقی بخست راہ نظر زد
برگ طرب ساختیم و بادہ گرفتن
ہرچہ ز طبع زمانہ بے ہودہ سر زد
شاخ چہ بالد گر ارمغاں گل آورد
تاک چہ نازد اگر صلای ثمر زد
کام نہ بخشیدہ گنہ چہ شماری
غالب مسکین بالتفات نیز زد

بنام مولوی محمد فضل حق

[۸۱]

قبلہ و کعبہ اگر یہ نہ ہوتا کہ لالہ ہیرا لال کے دل میں عنقا کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہو اور وہ ناگاہ شام کے وقت پنج شنبہ کے دن اور ماہِ ربیع الاول کی بیسویں تاریخ کو میرے نشیمن تنہائی میں وارد ہوں تو میں کاشانۂ والا کے گرد آگ لگ جانے، گھر جلنے، ہمسایوں کے مال و اسباب کے آگ پکڑ لینے اور ملازمانِ والا کے اس سانحہ میں محفوظ رہنے کی بابت کیسے جان سکتا۔

یہ سب نہ سنتا تو احباب پرسی کا حق کیسے ادا ہوتا کہ دوست داری کا تقاضا اور غم گساری کا شیوہ ہے اور یہ نہ ہوتا تو ایزدی عنایات کا شکرانہ اور اکو بی بخشایشوں کی سپاس گزاری کیسے ممکن ہوتی۔

ہاں اے وفا دشمن، یہ کیا کہ بیگانے 'نامۂ پیام' سے کامیاب ہوں اور دوست

آشنا رشحاتِ خامہ کو ترستے رہیں۔

فرد اے برمن کہ رقیب از تو بمن بنماید
نامۂ واشدۂ مہر بعنوان زدۂ

اے کہ تو ہمیشہ میرے دل سے قریب ہے۔ ذرا یہ بھی تو دیکھ کہ رقیب کس طرح تیرا وہ خط مجھے دکھلاتا ہے جو کھلا ہوا ہے اور جس کے سر عنوان پر تیری مہر لگی ہوئی ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس جلانے والی آگ نے میری گرمیٔ شوق کو چرا لیا تھا جو بیتابانہ اس نے سرِ مبارک کے گرد طواف کیا۔ اس مصیبت و ابتلاء کی ساعتوں میں شرار و شعلہ نے بھی حدادب کو نگاہ میں رکھا۔

افسوس کہ میں کہاں اور یہ تمام دعوے داریاں کہاں۔ خود نمائیاں مہر و وفا کی تاثیر پر اعتماد کو ظاہر کرتی ہیں اور یہی وہ اعتماد ہے جو مجھے یاوہ گوئی و ہرزہ سرائی پر آمادہ کرتا ہے، ورنہ دل جلوں کی آہ سے جس کا دامن نہ جلے کوئی تعجب نہیں کہ اس کے ہمسایہ میں آگ لگے اور اس کا سراپائے وجود اس سے محفوظ رہے اب میں نزاع کی باتیں نہ کرتے ہوئے حرف شکوہ زبان پر لاتا ہوں اور آپ کے گوشِ سماعت تک پہنچاتا ہوں۔

میں اس قادر توانا کا شکر گزار ہوں جو بلائے بے درماں سے اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ تاکہ بے بصروں کو نظر اور نظر والوں کو بصیرت میسر آئے۔ اس واقعہ نے پر جبریل کی قوت اعجاز اور حضرت ابراہیم کے محفوظ رہ جانے کی یاد کو تازہ کر دیا۔ خدایا اس سلامتی کو جو تیرا کرشمۂ قدرت ہے اور اس میں گوناگوں سعادتیں چھپی ہیں اس سے بھی زیادہ نیک بختیوں کا نمونہ بنا کہ دل و نظر کے دائرۂ شمار میں بھی نہ آ سکیں۔

اگر میں جانتا کہ میں اپنی نگاہ میں شرمسار نہ ہوں گا اور مجھ پر ناممکن کو ممکن بنا دینے کی خواہش کے لیے زبانِ طعنہ دراز نہ کی جائے گی تو میں اپنے عنایت فرما مخدوم سے اس خط کے جواب اور اس واقعہ کی تفصیلات تحریر فرمانے کی درخواست کرتا کہ جب آگ لگی، دھوئیں کے بادل اٹھے اور لپٹیں بلند ہوئیں اس وقت جناب والا کہاں تھے

ادا کیا کرتے تھے اور مردمی و فرزانگی کے نورِ چشم مولوی عبدالحق موجود تھے یا نہیں۔

نیز جب کہ یہ قیامت برپا ہوئی، ہمسایہ میں غل مچا اور انجمن میں سراسیمگی پھیل گئی تو گھر میں اہلِ خانہ اور باہر اہلِ محلہ اور ہوا خواہوں کی شور و فریاد نے کیا حشر اٹھایا، یہ فتنۂ و آشوب کس وقت تک دلوں اور دماغوں پر مسلط رہا نوکر پیشہ لوگوں کے مکانات کی چھتوں اور چھپروں پر کیا بیتی اور اس تمام کارخانہ و بن گاہ کا کیا بنا کہ یہ سب جناب کی رہائش گاہ کے قریب و جوار ہی میں تو موجود تھے یعنی یہ طعمۂ آتش تو ہو ہی گئے ہوں گے بلکہ انھوں نے تو آگ کے پھیلنے اور بھڑکنے میں معاونت کی ہوگی۔

لیکن چونکہ ارزش التفات مجھ سے سلب کرلی گئی بلکہ آپ نے دل سے کچھ اس طرح گرا دیا ہے کہ اس گوشۂ خاطر میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی جو کچھ میں نے کہا وہ بطریق آرزو ہے نہ باندازِ سوال۔ والسلام مع الاکرام۔

ایضاً

[۸۴]

سبحان اللہ۔ اس کے باوصف کہ میں کشتگانِ تغافل میں سے ہوں اور جانتا ہوں کہ دوست مجھے "جو کے دو دانوں" بلکہ ایک "پرِ کاہ" کے بدلے میں بھی نہیں لینا چاہتا اور جب میں گلہ گزاری کا ارادہ کرتا ہوں اور مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اس پردۂ ساز کو تو بے پردہ بھی چھیڑا جاسکتا ہے تو "دور باش اندیشہ" مجھے اپنی نگاہ قہر سے روک دیتا ہے۔ لاجرم اس تصور کا سہارا لیتا ہوں کہ دل کو درازنفسی کی رخصت دنیا بھی اس کی آبرو بڑھاتا ہے اور یہ بھی کیا کم ہے کہ میرا روئے سخن ہنوز دوست کی طرف ہے اور میں اس پر بھی اتنا خوش ہوں کہ دوست کی فراموش کاری کا خیال تک مجھے نہیں آتا اور شکوہ سنجی کے نغمہ نے گویا میرے لبوں کو فراموش کر دیا ہے میں اس پر بھی خاموش ہوں۔

فرد

از خویشتن بذوق جفا با تو ساختیم
با ما دگر مناز کہ ما با تو ساختیم

میں نے خود کو بھلا دیا اور ترے ذوق جفا کو اپنے دل میں جگہ دیدی۔ اب تو ہم سے ہم آہنگی کی بات نہ سوچ کر ہم خود تجھ سے ہم آہنگ ہو چکے ہیں۔

اِن دنوں یہ خیال آیا کہ چند شعر وحدتِ خداوندی کے بارہ میں عرفی کے جواب میں انشا کیے جائیں۔ جب کوشش اور فکر فرمائی اِس مقام پر آگئی کہ نہ عرفی کیلیے کوئی محل باقی رہا اور نہ میرے لیے کوئی جگہ۔ مجبوراً ان ابیات کو میں ایک ایسے شخص کی خدمت میں پیش کرنے پر مجبور ہوا کہ مجھ جیسے یک صد اور عرفی جیسے صد ہزار اصحابِ سخن کی پرورش کر سکتا ہے اور ہر ایک کے مرتبہ کو ایک دوسرے کے سامنے رکھ سکتا ہے۔

اے ز وہم غیر، غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے و خود را، در گماں انداختہ
دیدۂ بیرون و درون از خویش بر دل وانگہے
پردۂ رسم پرستش درمیان انداختہ

(اے کہ تو نے خود ہی وہم غیر پیدا کر کے دنیا میں شور و غوغا پیدا کیا تو نے خود بات کی اور خود اس وہم کا انداز اختیار کیا یہ آواز کہاں سے آئی اپنے اندر اور اپنے باہر کو اس نے خود ہی دیکھا وہاں اس کے ماسوا کوئی تھا ہی نہیں اس پر بھی اس نے رسم پرستش کا پردہ درمیان میں ڈال دیا۔)

بنام میر اعظم علی مدرس مدرسۂ اکبر آباد
[۸۳]

امروز شرارۂ بدا غم زدہ اند — نشتر بہ رگِ صبر و فراغم زدہ اند
از کثرتِ شورِ عطر مغزم ریش است — تا عطر چہ فتنہ بود ما غم زدہ اند

(آج میرے داغِ دل پر کسی نے پھر شرارۂ زندگی کی۔ پھر نوک نشتر نے میرے رشتۂ صبر و فراغ کو کاٹ دیا۔ شورش عطر کے باعث میرا مغزِ جاں آفت میں مبتلا ہے یہ کیسا عطر فتنہ تھا جس کی خوشبو نے میرے دماغ میں قیامت برپا کر دی ہے۔)

میں اپنے مخدوم مکرم کی جنبشِ خامہ پر ناز کرتا ہوں۔ جو نفسِ عیسوی کی طرح ہنگامۂ گرم کن حیات ہے۔ جس نے میری آرزوؤں کو زندہ کر کے میرے سوادِ خاطر کو عرصۂ محشر میں بدل دیا اور بازار رستاخیز گرم ہو گیا۔ دیرینہ عناد کے کانٹے دل پر آرزو سے نکل گئے اور یاد آیا کہ کبھی اس دنیا میں اب سے پیشتر میرا بھی کوئی وطن تھا اور میرے مہربانوں کی بھی ایک انجمن تھی۔ چونکہ آپ نے پرسشِ احوال کا نشتر رگِ جاں میں پیوست کر دیا ہے اب آپ کو معلوم ہو گا کہ میری خونابہ فشانیاں بھی دیدنی ہیں۔

زمانۂ فراق کی جو درازی آں مخدوم کے خیال کے مطابق سو (۱۰۰) سال ہے وہ اس نامہ نگار کی رائے میں بیس سال سے کم نہ ہو گی اور اس مدت کو ایک کزلکِ خیال کرنا چاہیے جس نے میرے صفحۂ خاطر سے آسائش کے نقوش کو مٹا دیا ہے۔ شہر دہلی میں اپنے ورود کے آغاز میں کہ میرے پیمانہ میں شرابِ غفلت کی تلچھٹ موجود تھی عمر کا ایک حصہ حادثاتِ کامرانی کی ہوس پیمائی اور آوارہ خرامی میں گزر گیا۔ اس سرشاری اور اس عالم بیخودی میں رہ گزارِ شوق کو طے کرنے والے قدم لڑکھڑا گئے اور اندوہ و ملال کی گرد سر میں بھر گئی تو مجھے ہوش آیا۔

ہنگامۂ دیوانگیٔ برادر ایک طرف اور قرض خواہوں کا شور و شر دوسری طرف عجیب

پُرآشوب دور تھا کہ نفس نے لبوں کی راہ فراموش کی اور آنکھوں کی روشنی پتلیوں کو بھول گئی۔ اپنی تمام تابناکیوں کے باوصف دنیا میری نگاہوں میں تاریک ہوگئی، میں نے اپنے لبوں کو سی لیا اور اپنی طرف سے خود ہی آنکھیں بند کرلیں۔ جہاں جہاں شکستگی اور عالم عالم تشنگی میرے وجود کا حصہ بن گئی۔ زمانے کی بیداد سے فریاد بہ لب اور تلوار کی دھار پر سینے کے بل چلتے ہوئے میں کلکتہ پہنچا۔

وہاں کے حاکموں نے بزرگی و کوچک دلی کا مظاہرہ کرکے میرے دل کو تقویت بخشی۔ انھوں نے میرے حال پر جو مہربانیاں کیں اس سے کار برآری کی امید پیدا ہوئی اور آوارگی کی خواہش اور "بیاباں مرگی" کی آرزو دل سے نکل گئی۔ شہر یزد کے آتش کدوں اور شیراز کے خم خانوں کی سیر کی کشش جو مجھے بے اختیار سرزمین پارس کی طرف کھینچ رہی تھی مری خاطر سے فراموش ہوگئی۔

دو سال تک اس شہر میں فروکش رہا۔ جب گورنر جنرل نے ہندوستان کا رخ کیا تو میں ان کے پیشا پیش دوڑ بھاگ کرتا ہوا دہلی پہنچا لیکن زمانہ بدل گیا، حالات نے دوسرا رخ اختیار کیا اور تمناؤں کا شیرازہ بکھر گیا۔ اب چھٹا سال ہونے کو ہے، میں خانماں برباد مرگ ناگہانی کی توقع لیے ایک کونے میں بیٹھا ہوں بیگانوں یگانوں پر ملاقات کا دروازہ بند کردیا۔ اُن تمام آلام و مصائب کے ساتھ کہ اُن کا ایک ذرا سا حصہ یہاں بیان کیا ہے، اگر میں خطوط کی نگارش اور پیغام دل کی گزارش میں کوتاہ قلم ہو جاؤں اور بزرگانِ وطن کو یاد نہ کروں تو نگاہِ عدل میں قصوروار نہ ٹھیروں گا۔

لیکن جہاں مہر و وفا کے بلند پایہ و گراں مایہ افراد جنھوں نے اس زمانہ میں دور افتادہ دوستوں کو نہ پوچھا اور ان کے احوالِ مرگ و زیست کے پُرساں نہ بنے ان سے البتہ شکوہ کیا جا سکتا ہے وہ کیسے عنان در عنان اس راہ میں چل سکتے ہیں اور اپنے دعوۂ دوستی کو وہ کیسے ثابت کرسکیں گے۔ مجھ ایسے بے زبان حریفِ سادہ کی بات جانے دیجیے خدا کے سامنے وہ کیسے جواب دہ ہوں گے۔

فرد کس از اہل وطن غم خوار من نیست

مرا در دہر پنداری وطن نیست

اہل وطن میں سے کوئی میرا غم خوار نہیں ہے گویا میرا حال اس شخص کا سا ہے جس کا دنیا میں کوئی وطن ہی نہ ہو۔

میرے مخدوم فرماتے ہیں کہ جلد ہی گورنمنٹ اور عدالت دیوانی کی ایک انجمن (برنچ) آگرہ میں قائم ہو جائے گی اور اس لیے آپ نے یہ خیال فرمایا ہے کہ غالب داد خواہ اس عدالت گاہ کی طرف رخ کرے گا اور اس کا بگڑا کام یہاں بن جائے گا حاشا ثم حاشا یہ جمعیت میری پریشانیوں ہی کو بڑھائے گی مجھے اس ہنگامہ سے اب کوئی علاقہ نہیں۔ اس لیے کہ عدالت دیوانی میرے نزدیک اس فریاد کی شنوائی کے لیے ہے ہی نہیں اور سر محکمہ گورنمنٹ کیا وہی خود رائے اور دردمند کش نہیں ہے کہ میں جس کے خنجر ادا کا زخمی ہوں۔ ع

روزم سیاہ کردۂ چشم سیاہ اوست

خدا اُسے وہیں بٹھائے جہاں میں بدنصیب بیٹھا ہوں اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہی زمانے کے ہاتھوں سے وہ بھی دیکھے۔ قصہ کوتاہ میرا دل سوائے آرزوئے مرگ کے اور کسی بات سے آسودہ نہیں ہوتا اور اپنے خط میں اہل دنیا سے اب کسی حسن سلوک کی توقع نہیں رکھتا۔ غالب مغلوب کا دل جس کے ہزار ٹکڑے ہو چکے ہیں انھیں ٹکڑوں میں سے ایک یہ ٹکڑا بھی ہے۔

خوش بخت ازلی مخدوم زادہ میر وزیر علی کی سعادت دیدار سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ میں نے ان کے بچپن کے زمانے کو یاد کیا اور ان کے لیے دل سے یہ دعا نکلی کہ وہ ایک طویل عرصے تک حیات رہیں اور زندگی کی مختلف بہاریں دیکھیں امید کہ وہ والا مرتبت اور کردار و گفتار کے جامع ہوں گے۔

والسلام بہ الوف احترام

نواب حسام الدین حیدر خاں [۸۴]
کی
طرف سے عرض داشت

یہ فدوی بارگاہ

حضرت قدر قدرت کی عرضہ گاہِ والا میں التماس گزار ہے (جن کی انجمن چاند ستاروں سے آراستہ ہے فرشتے جس کی پاسبانی کرتے ہیں اور جن کے آستانۂ عالی کی فضا بہشت کی طرح حسین و کار آفرین ہے) اللہ تعالیٰ ان کی سلطنت کو قیام اور ان کی دولت کو دوام عطا فرمائے۔ (آمین)

حضرت فلک رفعت کے اسم ہمایوں سے، کہ وہ (اپنے عہد کے) سلیمان ثانی اور وجہ توقیر جہاں بانی ہیں، صحیفۂ شہریاری کے تابناک ورق کو جو زیب و زینت نصیب ہوئی ہے وہ اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ جوہریاں شعر و سخن کے ضمیر میں پرتو فگن ہو۔

سچ یہ ہے کہ سریرِ سلطنت کا رتبہ جو ہمیشہ بلندیوں کی طرف مائل رہتا ہے اب اس جگہ پہنچ گیا ہے کہ آسمان بلکہ ہفت سپہر پر ناز و فرمانروائی کر سکے فرشتوں نے جو ہمیشہ فلک ثوابت کی ماہ و انجم سے آئینہ بندی کرتے اور اس فروزندہ انجمن میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو آسمان کے روشن سوادوں کو صیقلِ آئینہ کی تربیت دیتے رہے ہیں اسی شغل میں ایک عمر گزار دی تو بالآخر آج اس آئینۂ خیال میں شاہدِ مدعا کا جلوہ دیکھا۔

اس دور میں ابرِ نیساں کی بیاضِ پیشانی موتیوں کی ناروائی کے باعث عرقِ انفعال سے اس لیے بھیگی ہوئی نظر نہیں آتی کہ انجام کار اس نے ایک مدت تک جمع کردہ اس "گوہریں اندوختہ" کو دریا دل سلطان کے قدموں پر نچھاور کر دیا اور مہرِ درخشاں کہ ایک زمانہ سے یاقوت سازی میں مصروف تھا اب اس عہد میں اُسے اپنی سعی و کاوش کا یہ صلا عطا ہوا کہ بدخشان و یمن کی معدنوں کے یہ جگر پارے (ان کے پروردۂ آغوش یہ لعل و جواہر) سلطنت کے سریرِ عرش نظر کی آرایش میں کام آئے۔

اس جلوسِ میمنت مانوس کی سعادتوں کے باعث زمین آسمان کی منت کش ہے خود آسمان کی نگاہ میں زمیں کا شکوہ بڑھ گیا ہے۔ زمین اس بارِ منت کی بدولت اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتی اور آسمان، زمین کے علوئے شکوہ کے باعث اپنی گردش کو روک نہیں سکتا۔ یہ صبح کے طلوع کا وقت ہے نیرِ اقبال کی درخشندگی کا ہنگام ہے۔

سبحان اللہ کیسی مبارک ساعت میں اقبال و سعادت کا ستارہ چمکا اور نئی سحر کا طلوع ہوا جس کی آمد آمد کا اتنے دنوں سے اہلِ عالم کو انتظار تھا اور سریرِ سلطنت کی آرزو جو ایک مدت سے جان و جہاں میں پرورش پا رہی تھی اپنی بہترین صورت میں پوری ہوئی۔ اس شادمانیوں سے بھرے ہوئے منظر کی دید کے لیے ذرہ و آفتاب ایک دوسرے کا آئینہ بنے ہوئے ہیں اور پھول سے لے کر خار تک نشاط و کامرانی کی۔ اُفق افروزیوں کے ساتھ اس آمدِ فصلِ بہار کی دل ربائیوں میں کھوئے ہوئے ہیں تاکہ دامن دامن برگِ گل ہائے تازہ نظرگاہِ خسروی میں نثار کر دیں۔ دل و جاں کہ فروغِ خرد سے

نورانی ہو گئے ہیں جو بہترین ایزدی بخشائشوں میں سے ہیں انھیں سمندر وجود کے بیش بہا موتیوں کی طرح اس پر نچھاور کر دیا جائے۔ تختِ حکومت پر جلوس فرمائی کی تہنیت اور دوامِ دولت کے واسطے دعاگوئی میں عالم واہلِ عالم کو اپنا ہم نوا اور اس پر آمین کہنے میں اپنا ہم زبان بنایا جائے۔

کلیاں جلد از جلد شگفتہ ہو کر پھول بن جانا چاہتی ہیں تاکہ بارگاہِ خسروی میں ان کو تحفہ ہائے رنگ و بو کے طور پر پیش کیا جائے' ابرِ بہار اس مقصد سے صدف زار بنا ہوا ہے کہ بادشاہ کے بر و دوش پر بیش قدر مروارید کا خزانہ نچھاور کرے اور بارش کے قطرے دُرہائے شہوار بنے نظر آتے ہیں کہ دامن ہوا سے بادشاہ عالم و عالیاں پر سچے موتیوں کا مینہ برسائیں۔

ہر چند یہ وہ مقام جاہ مندی ہے جہاں خسرو کی فرزانگی، بہرام کی توانائی، سکندر کی خوش نصیبی دربار شاہی کے سرہنگوں کو مالِ یغما کے طور پر میسر آجائے اور برجیس سے انگشتری' ستارۂ مریخ سے تلوار مہرِ عالم تاب سے تاج بندگانِ بارگاہ کے واسطے بطورِ پیش کش آئے۔ کسی دوسرے کی کیا مجال کہ اس عرصہ گاہ میں خود کو کسی لائق تصور کرے اور زمین والوں کو یہ مرتبہ کہاں کہ سمندر کو پانی کی نذر گزرانیں۔

لیکن چونکہ عقیدت ہر رنگ میں جگہ تشنۂ اظہار رہتی ہے ہم سے کمترین خانہ زاد' نذرانہ کی پیش کش اور استدعائے قبول کے معاملے میں بے اختیار ہیں۔ سچ یہ ہے کہ آفتاب جہاں تاب کے پرتو کا یہ عمل کہ وہ تیرگی کو دور کرتے اور اس کے سامنے سایے سمٹ جائیں۔ مہر کی تابانی اور ہنگامۂ درخشانی ایک ادنیٰ سا صدقہ ہے' قطرہ کی رہ آورد کو قبول کرنا کو بہار کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔

یارب آوازۂ دوامِ سلطنت' اوجِ کمال کی طرف بڑھتا رہے اور سریر مملکت کا پرچم ہمیشہ بلندیوں پر لہرائے۔

بنام مبارز الدولہ ممتاز الملک

مرزا حسام الدین حیدر خاں بہادر

۱۸۵۴ء

[حسام]

قبلۂ حاجات خداوند آپ کے سایہ عاطفت کو دراز فرمائے بندگان کم خدمت کی طرح جو ازراہ شرمندگی سر بہ گریباں ہوتے ہیں میں بھی اپنے دل میں سوچتا ہوں اور شرم نارسائی سے عرض کرتا ہوں کہ میری طبیعت فکر نثر کی طرف مایل نہیں ہوتی اور میں آپ کے گرامی نامہ کا جواب لکھ نہیں پاتا۔ اگر یہ چاہوں کہ اپنے خاص انداز میں سخن طرازی کروں تو یہ سلسلۂ "چیستاں" اس ستایش کے اور یہ مکتوب اس صحیفہ مودت کے جواب کے لایق نہ ہوگا۔

جب کہ اس خط کا جواب پہلو دار نہیں سرسری ہونا چاہیے اور اگر یہ چاہوں کہ اس روش کو بدل دوں تو لاجرم یہ بات میرے ناموس سخنوری کے خلاف ہوگی جب صورت حال یہ ہو تو ملازمان درگاہ بھی یہ پسند نہ کریں گے کہ میں اس کش مکش میں گرفتار رہوں۔ خلاصہ اس حالت میں کہ ایک خدمت شایستہ بجا لا چکا ہوں اور ناپذیرائی فرمان کی میری طرف سے بہترین صورت میں تلافی ہو چکی ہے۔

شاہ اودھ نے جو خواب دیکھا ہے اس کی تعریف میں یہ چار رباعیاں خدمت والا میں پیش ہیں میں نے یہ سوچا ہے کہ ان رباعیوں کو زرنگار کاغذ پر لکھوایا جائے (جو کاغذ فروشوں کے یہاں مل جاتا ہے) اور اس خط کے ساتھ جو ظفر الدولہ کے نام لکھا جا رہا ہے انھیں بھی (ان کے پاس) بھیجا جائے تاکہ ظفر الدولہ ان کو حضور شاہ میں پیش کر دیں اور عرض کریں کہ یہ رباعیاں مبارز الدولہ نے یاد فرمائی اور عطائے مثنوی کے سلسلہ میں نذرانۂ تشکر کے طور پر، بادشاہ کی ان روشن آنکھوں کے سامنے پیش کش کی غرض سے بھیجی ہیں جنھوں نے وہ خواب دیکھا ہے۔

خوابے کہ فروغ ایں از جلوہ گرست
در روز نصیبِ شہِ روشن گہرست
پیداست کہ دیدنِ چنیں خواب بروز
تعجیلِ نتیجۂ دعائے سحرست "

رباعی

بر دل از دیدہ فتح یاب است ایں خواب
بارانِ امیدرا سحاب است ایں خواب
زنہار گماں مبر کہ خواب است ایں خواب
تعبیرِ ولائے بوتراب است ایں خواب

بینائیٔ چشم مہر و ماہست ایں خواب
پیرایۂ پیکرِ نگاہست ایں خواب
بر صحتِ ذاتِ شہ گواہست ایں خواب
بیداریٔ بختِ بادشاہست ایں خواب

ایں خواب کہ روشناس روزش گویند
چوں صبحِ مراد دلفروزش گویند
زاں رو کہ بروز دیدہ خسرو بہ عجب
گر خسرو ملکِ نیم روزش گویند

قبلہ گاہ من اس صورت میں نوازش خسروی کا شکریہ ادا ہو جائے گا۔ اور خواہی نخواہی آپ کی طرف سے نذرانۂ سخن بادشاہ تک پہنچ جائے گا۔ فتح علی خاں نے اپنی کتاب "چیستاں" کے باب میں کس قدر سخن سرائیاں کی ہیں جو عامۃ الناس کی نگارش

قلم کی صورت میں ممکن نہیں۔

ایضاً

[۸۶]

قبلہ و کعبۂ دو جہاں سلامت بدرالدین دو بار آیا اور ملازمان بارگاہ کی طرف سے دو غزلیں مجھ سے طلب کیں میں سنے پہلے تو یہ کہا شاید کہنے والے نے غلط کہہ دیا اور مثنوی کو غزل سمجھ لیا۔ میں نے اسی قاعدہ سے جواب بھی دیا۔ وہ چلا گیا اور پھر واپس آیا اور بار اوّل جو کہا تھا وہی کہا۔ میں سے جواب میں کہا حاشا و کلّا کہ اس طرح کا میں نے کوئی پیمان ہی نہیں کیا تھا کہ میں دو غزلیں بھیجوں گا۔

اس کے جانے کے بعد بہت سوچا خیال دوڑایا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ حضرت نواب صاحب قبلہ نے فرمایا ہوگا اس نے دو غزلیں سمجھ لیا۔ اور وہ یہ ہیں۔

یاد باد آں ذوق کاندر قطع صحرائے جنوں
خود عصائے بود گر در پائے خارے داشتم
اتفاق سفر افتاد بہ پیری غالب
آنچہ از پائے نیاید ز عصا می آید

تا سر خار کجا ہیں دشت در جاں می خلد
کز ہجوم ذوق می خارد کف پایم ہنوز

نم اشکے چو بجا کم بفشانی از مہر
خاک بالد بخود و رگ بخیر دازو

بسکہ لبریز ست از اندوہ سراپائے من
نالہ می روید چو خار ہائی از اعضائے من

نیز کہ راز دروں در جگرے دیم
نالۂ خود راز خویش داد شنیدن دہیم

زسعیٔ ہرزہ بے حاصلی علم گشتیم جو باد بید پدید آمد از اعمالِ ما

دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ ان ابیات کی تحریر سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں ایسے اشعار کے بارہ میں سوچ رہا تھا کہ جو عصا کے مضامین پر مشتمل ہوں لیکن چونکہ اس زمانہ میں اوراق مسودہ میری نظر کے سامنے تھے۔ چند ایسے شعر جو میرے مدعا سے مناسبت رکھتے تھے میں نے ان کا انتخاب کرلیا زیادہ حد ادب۔

راقم محمد اسد اللہ

ایضاً

[۸۷]

خداوند نعمت سلامت

کسی جوہر شناس کے سامنے عرض بے جوہر کو ارزش کی امید کے ساتھ پیش کرنا آبروے عہد وفا کو ضایع کرنے کے مترادف ہے۔ ہر چند مجھ نیاز مند کے لیے یہی مناسب ہے کہ میں ملازمانِ والا کو کوئی بے جا زحمت نہ دوں اور دائرہ ادب سے باہر قدم نہ رکھوں لیکن کیا عرض کردوں کہ "ابرام" کے ماسوا میرے لیے کوئی چارہ نہیں اور میری بے کسی گستاخی کی عذر خواہ ہے۔

اب میں اپنا فائدہ اسی میں دیکھتا ہوں کہ ملازمان بارگاہ والا کسی کو بھیجیں اور اندرجیت و ہیرالال کو بلالیں ان کو اپنے دیوان خانہ میں بٹھائیں انھیں کے ساتھ مجھے بھی یاد فرمالیں۔ جب وہ لوگ آجائیں گے تو باتوں کا سلسلہ میں شروع کردوں گا اور جو کچھ بھی کہا جائے گا ما حصل اس گفتگو کا یہ ہوگا کہ اسد اللہ تمہارا دام پرست (قرض خواہ) ہے اور اس کی زندگی کا سررشتہ اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔

وہ اندوہ تنگ دستی سے بے طرح دل خستہ ہے اور حالات نے اسے بالکل عاجز و درماندہ کر رکھا ہے اُسے ایک ہزار روپیہ قرض دیکر اس کے کام آؤ تمہاری یہ سعی ہرگز ضائع نہ جائیگی بلکہ یہ بات تمہارے اور اس بیچارے کے لیے سودمند ہوگی

اور یہ امر طرفین کی خوشی کا موجب ہوگا اب اس امر اتفاق سے فائدہ اٹھا لیا جائے آئندہ جو پس پردۂ تقدیر ہوگا وہ سامنے آئے گا زیادہ حد ادب

ایضاً
[۸۸]

جناب نواب صاحب قبلہ و کعبۂ دو جہان۔ ایزد تعالیٰ آپ کے ظل ہمایونی کو قیام و دوام عطا فرمائے۔ آداب و کورنش کے بعد عرض خدمت ہے کہ بندہ کو آج ایک انگریز افسر سے ملاقات کی غرض سے جانا ہے ان صاحب کا مسکن چونکہ بیرون شہر ہے اور باغ محلدار خاں کے قریب، ماہ مرداد کی شدید گرمی کے باعث طبیعت خوف زدہ ہے اگر آپ پینس مرحمت فرما دیں تو گویا تمازت آفتاب میں تپتی ہوئی راہ کا سفر آپ کے سایہ عاطفت میں سکون و اطمینان سے کیا جا سکے گا۔

اتنی بات اور بھی خاطر نشان رہے کہ ملاقات کا وقت دو بجے کے قریب ہے کہاروں کو یہ ہدایت فرما دیں کہ جب فلاں شخص کی طرف سے کوئی آدمی آئے اس کے ہمراہ پینس روانہ کر دیں اس وقت جناب والا قیلولہ فرما رہے ہوں گے۔ اس سے زیادہ میں اور کیا عرض کروں۔ فقیر راہ محمد اسد اللہ

ایضاً
[۸۹]

حضرت نواب صاحب قبلہ مدظلہ العالی۔ لالہ ہری چند، صاحب آپ کی بے کراں عنایات کے شکر گزاری میں رطب اللسان ہیں اور میں اس بارۂ خاص میں ان کا ہم زبان۔ آپ نے ان پر جو کرم فرمایا ہے اور آئندہ فرمائیں گے وہ مجھ پر احسان ہوگا کہ انھوں نے حالات کی ناساعدت سے پریشان ہو کر ایسا خیال کیا ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں مراتب عروج کی طرف رخ کریں۔ لاجرم انھوں نے جناب والا کی کریم فرمائیوں کو اپنے لیے بام رفعت کا نردبان سمجھا ہے اور نامہ نگار کی سفارش و گزارش کو حضور والا کے التفات کا ذریعہ تصور کیا ہے کیا ہی اچھا ہو اگر وہ اپنی خوش گمانی اور میں خود ان کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔ زیادہ حد ادب

ایضاً
[۹۰]

حضرت قبلۂ حاجات مدظلہ العالی۔ برادرم حسین مرزا نے چند باتیں میری زبان سے عرضہ گاہِ والا میں پیش کی ہونگی۔ وہ افسانہ ہنوز ناتمام ہے جب تک کہ میں حاضرِ خدمت ہو کر بہ تفصیل عرض نہ کروں ان کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ لالہ ہری چند صاحب نواب امین الدین خاں بہادر کا خط لا رہے ہیں جو کرنیل اسکنر صاحب بہادر کے نام ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ لالہ صاحب حضرت والا کے ہمراہ کرنیل اسکنر کے حضور میں پہنچیں اس نامہ کو پیش کریں اور جناب کی زبانِ گوہر فشاں کی جنبش فرمائی کی بدولت اپنے مدعائے دل کو پہنچیں۔ لالہ صاحب یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ رہوں جب کہ میں خود کسی لائق نہیں ہوں۔

امید کہ یہ کام ملازمانِ حضور کی التفات فرمائی کے باعث حسنِ انجام کو پہنچ جائے گا

زیادہ حدِ ادب

ایضاً
(۹۱)

غالب آشفتہ نوا کے نورِ دیدہ یوسف مرزا۔ اب کیا کہوں کہ اس کے جانے سے مجھ پر کیا بیت گئی آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ آپ نے خواہ مخواہ یہ دوادوا ختیار کی اور رہ روی کی زحمتیں برداشت فرمائیں۔ آپ نے فرخ آباد میں اپنی دادی کو نہ پایا ہو گا لیکن جو سعادت اپنے فرخ فال ماموں کی خدمت گزاری و غم گساری کے باب میں آپ نے حاصل کی وہ مفت میں ہاتھ آئی۔

میر مہدی بے پور میں ہیں اور یارِ عزیز یوسف علی خاں کہ بنا اس دیار میں اقامت گزیں ہیں آپ کو بہت سے سلام بطور ارمغاں بھیجتے ہیں یہ سب میرے پاس جمع ہیں جب ادھر آئے گا تو یہ سب آپ کو پیش کر دیے جائیں گے۔ ان کا نگارش نامہ مجھے مل گیا ہے یہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں اس کا جواب ہے۔ زنہار اس شہر کے لوگوں سے آویزشیں نہ پیدا کریں اور ستیزہ کاریوں میں نہ الجھیں۔

وہ گفتار موزوں کہ جسے شعر کہتے ہیں اس کی جگہ ہر دل میں جداگانہ اور اس کا رنگ

ہر دیکھنے والی آنکھ میں الگ ہوتا ہے۔ سخن سرایوں کا ہر زخمۂ تار الگ اور ہر ساز کا آہنگ جدا، دوسرے کی دید و دانست سے چشم پوشی اختیار کیجیے اور اپنی آگاہی کو بڑھاتے رہیے۔

عرض داشت من جانب حسام الدین حیدر خاں

[۹۲]

حضرت قدر قدرت کی بارگاہِ عرش پایگاہ میں کہ سپہر بریں جس کا آستانہ ہے ستارے جس کی انجمن آرائی کرتے ہیں عرصہ گاہ بہشت کی طرح جس کی فضا حسین و کار آفریں ہے اور فرشتے جس کے در دولت کے دربان۔ ایزد تعالیٰ ان کی سلطنت کو قیام اور ان کی دولت کو دوام بخشے۔

حضرت فلک رفعت کے اسم ہمایوں سے کہ سلیمان ثانی ہیں، صحیفۂ جہاں بانی کو جو زیب و زینت اور ورق شہر یاری کے سر عنوان کو جو آرایش و زیبایش نصیب ہوئی ہے اس کی گراں مایگی و بلند پایگی اس سے کہیں ارفع ہے کہ سخنوروں کے ضمیر میں پرتو فگن ہو سکے۔

سریر سلطنت کہ ایک مدت سے بلندیوں کی طرف مایل رہا ہے اب اس رتبۂ عالی پر ہے کہ سات آسمان اس پر اپنا سرمایۂ ناز نچھاور کریں۔ فرشتے کہ ہمیشہ سے فلک ثوابت کو مزین اور آئینہ بند کرتے رہے ہیں اب اس فروزندہ انجمن میں باچشم روشن و دل شادماں، زانو بہ زانو بیٹھے ہوئے ہیں۔

روشن سوادانِ سپہر ایک زمانۂ دراز سے آئینۂ فلک کی روشن گری کرتے رہے تاکہ آج کے دن وہ شاہد مدعا کے جلوۂ تمثال کو دیکھ سکیں۔ ابر نیساں کی پیشانی نارواییٔ گوہر کے باعث اب عرقِ ندامت سے آلودہ نہیں کہ اس نے اپنے فراہم کردہ

موتیوں کے دیرینہ خزانے کو جلوس فرمائی کی نذر کے طور پر بادشاہ جم جاہ کے مبارک قدموں پر نثار کر دیا۔

زمانہ دراز سے عہد موجود تک مہر درخشاں کی ضیا باریوں کی دست مزد یاقوت سازی تھی اس کی غرض و غایت سامنے آئی کہ وہ تمام لعل و جواہر سریر عرش نظیر کی زیبائی و صورت آرائی میں کام آئے اور خود ان جگر گوشگانِ معدن کو اقبال و سعادت کی کرسی نشینی میسر آئی۔

اس پیراس سعادت مانوس کی بدولت روئے گیتی پر آسمان کا بڑا احسان ہے اور خود آسمان کی نگاہ میں زمین کا شکوہ بڑھ گیا ہے کہ زمین فلک کے بار احسان کے باعث اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتی اور آسمان، زمین کے اس دبدبہ و شکوہ کے سبب اپنی گردش کو بھول گیا ہے۔

یہ صبح اقبال و سعادت کے چمکنے کا وقت ہے اور فرخی و فرح مندی کی ضوفشانیوں کا ہنگام۔ گلبن دولت کی شگفتگی اور نسیم فتح و کامرانی کے خرامِ ناز نے دل اہل عالم کو مسرور اور مشام جہاں کو معطر کر دیا ہے چتر شاہی سے زمین پر ایک نیا آسمان بن گیا ہے اور قلم کو ستارہ افشانی کا مرتبہ گراں مایہ مل گیا ہے۔

زمانہ کی طرف سے اہل زمانہ کو صلائے عیش دوام مل گئی ہے اور اہل دہر نے دستِ دہر سے شادمانی جاوید کی سند حاصل کر لی ہے، کوئی ایسی نذر جس کے ساتھ جبینِ عجز کو اس آستانۂ عالی پر کہ ہم زاد آسمان ہے ہزار بار سجدہ ریز کیا جا سکے۔ اگر ان کمترین خانہ زادوں کی طرف سے نظرگاہ التفات میں عطیۂ قبول سے سرفرازی پائے تو وہ نقد آبرو اور زرِ عزت کے لیے وجہ اعتبار ہو گی۔ یہ دریوزہ گرِ آبرو اس کی پذیرائی کی آرزو رکھتا ہے۔

سلطنت خداداد کا کوکبۂ اقبال جاوداں رہے اور مسند اقبال حضرت صاحب الزماں کے رخش کی ہم عنانی کے شرف سے مشرف ہو

بنام مولوی ولایت حسین خاں بہادر

[۹۳]

(بہ پوزش جرم کاہل قلمی و مبارک باد حصول منصب قاضی القضاتی)

شب گیر سرا روشنی اختر من بس

در راہ ادب حسن طلب رہبر من بس

اس تیرہ و تار زندگی کے ماحول میں میری قسمت کے ستارے کی روشنی ہی میرے لیے کافی ہے۔ اور راہ ادب میں حسن طلب ہی میرا بہترین رہبر ہے۔

وہ دستور جس کی بنیاد شعور و دانش پر قایم ہے اس کارگاہ کہن میں جسے ایزدی دبستاں کہنا چاہیے کہ جب خداوند اپنے بندہ سے ناخوش ہوتا ہے تو ایسی حالت میں کہ وہ بندہ اپنے کردار و گفتار کی دل آویزی اور اپنے حسن رخ اور رویہ کی خوبی سے وجہ کشش ہے۔ اس کے آقائے ولی نعمت کا دل بھی اس کی دوری پر بہت کم صبر کرتا ہے اور جو افراد اس آکے قریب تر لوگوں میں شامل ہوتے ہیں وہ بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کے چلے جانے سے ان کی خوشیاں کم ہو گئی ہیں۔

اس کی آمرزش کا جذبہ درون خاطر سے بھی ابھرتا ہے اور اس کے حق میں چارہ جوئی کرتا ہے اور باہر سے بھی اس کے واسطے سفارش اور شایستہ گوئی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے لاجرم اس طرح کے کسی روشن روش غلام کے دل پر محرومیوں کا بند مستقل طور پر باقی نہیں رہتا اور ایک دوروزہ جُدائی کے بعد کہ وہ پاداش عمل ہوتی ہے پھر اس کو بزم انس میں جگہ دیدی جاتی ہے۔

لیکن ایسا بندہ کم خرد کہ اس میں بسیار گوئی اور دشوار جوئی اس کا شیوہ ہوتا ہے اور نہ ستایش و بندگی میں اس کا کوئی خاص درجہ ہوتا ہے اور نہ شائستگی و ادب شناسی میں اس کا کوئی خاص مقام اس لیے وہ بے توجہی و نیم نگاہی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی بود و نابود سے کسی کو کوئی دل چسپی نہیں ہوتی اور نہ کوئی دل میں اسے یاد کرتا ہے اور نہ آشکارا زبانوں پر اس کا نام آتا ہے۔

میں ایسا ہی ایک بندۂ ناساز بخت ہوں کہ میں انجمن سے باہر نکل گیا تو میرے آقا نے یہ محسوس کیا کہ اس کے اوقاتِ روزی میرے شور و غوغا سے محفوظ ہو گئے اور میرے ہمدموں کے لیے میری ہمدمی وجہ اندوہ و ملال نہیں رہی۔ نہ ضمیر منیر میں میرے خیال کا گزر ہے اور نہ میرا نام شفاعت کرنے والے لبوں کے گرد کبھی طواف کرتا ہے۔

اس تمام ناکسی و نارسائی کے باوصف میں اپنی اس دیدہ وری پر خوش ہوں کہ مجھے شایستہ گفتار و شایستہ کردار لوگوں کا شناس بنایا گیا ہے اور میری طرف سے بے جا گلہ مندیوں کو انھوں نے اپنی خاطر ناعاطر میں کوئی جگہ نہیں دی۔ ہرگز ایسا نہیں ہوا کہ اس آویزش خاطر کے باب میں ملازمان والا کی طرف سے میرے دل میں کوئی خیال شکوہ پیدا ہوا ہو۔

جب اپنی تقاضۂ بخت ابرام کے باعث میں دامن مقصود سے بے طرح الجھا ہوا تھا اور جب افزوں سری کی وجہ سے میں نے آبروے گفتار اپنے انداز ناباہست کے سبب بالکل ہی برباد کردی تھی۔ نتیجہ یہ کہ شرمساری مجھ پر غالب تھی اور فشار بے خودی نے نچوڑ کر رکھ دیا تھا کہ جب میں عریضہ نگاری کے ارادے سے بیٹھتا تو میرا ہاتھ بیتابیٔ جاں سے اس طرح کانپنے لگتا کہ میرے دل میں پیدا ہونے والے عذر اس سے پیشتر کہ قلم و قرطاس کے حوالے کیے جاتے ان کا شیرازہ بکھر جاتا۔ اور مدعا نگاری و پوزش گزاری کا سرشتہ میرے ہاتھوں ہی سے نکل جاتا

فرد

الکہ دیدی بجحیم طلب رقم خطاست
سخنے چند زغم ہائے نہانی بشنو

(تو یہ جانتا ہے کہ میرے ذہن کے اس دوزخ میں طلب رقم خطا ہے۔ اس لیے دل کے پردوں میں چھپے ہوئے غم کے بارہ میں سن لے۔)

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کشاکش میں جب میرے دل میں جذبۂ محبت جوش زن ہوتا تھا اور ذوق آگہی فکر و خیال کی دنیا میں فتنہ برپا کرتا تھا تو مکرمی میر سید علی

میرے حال فرخندہ فال کی پرسش فرماتے تھے وہ تمام شوقِ طلب اور تشنگیٔ دریافت کے باوجود اگر نامۂ نامی کے پہنچنے کی بات میں دوبارہ سنتا تو رشک کے باعث بھڑکتی ہوئی آگ کا شعلہ میرے خرمنِ خاطر میں جا پڑتا اور میرے جگر سے بوئے کباب آنے لگتی۔

ہنوز محبت و فطرت کی آویزش آتشِ ہنگامہ کو تیز رکھے ہوئے تھی اور عقل و جذبات کی کش مکش آشوبِ قیامت کا سا انداز رکھتی تھی کہ آسمان نے میری سرگشتگیوں پر رحم کھایا اور قسمت نے کارسازی کے لیے خوابِ گراں سے سر اٹھایا۔ موکبِ گورنری جس کی رہ نوردیٔ مبارک ستاروں کی فلک پیمائی سے کم نہیں۔ الٰہ آباد پہنچا خوش بختی کو ایک سازِ جمیل کی شکل دی گئی اور اس ساز سے آں مخدوم کی ترقیٔ جاہ کی تہنیت کے نغمے اور خوش آہنگ آوازوں کے مرغولے پیدا کیے گئے۔

اس آہنگِ نشاط اور زمزمۂ مسرت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا اور میں کہ خود اپنے ہی ساتھ دست و گریباں تھا مجھے اس دل و جاں کے جدال سے الگ کیا گیا اور ادائے مراسمِ تہنیت کی تقریب اور شوقِ بہانہ جو کے تقاضے نے مجھے اس بندِ حجاب سے باہر نکالا اور میرا شرم زدہ دل جو خود کو افسردہ اور مجھے زار و نزار رکھتا تھا سرشاری و طرب انگیزی کے باعث رقص کرنے لگا۔ شاہدِ ارادت نے کہ حیا کا نقاب اپنے چہرے پر ڈال رکھا تھا جب اس کے تار و پود کو بکھرتے دیکھا تو ادائے کشادہ روئی سے آہنگ پابوسی کیا اور "چشمِ ما روشن" کہنے والوں کے انداز سے مسرتوں سے بھرا نغمہ اس کے لبوں کو چھونے لگا۔

عہدۂ قاضی القضاۃ کی پیش گاہِ گورنری سے عطا فرمایا گیا ہے اگر دیکھا جائے تو وہ فرمانِ دہلی کے نقطۂ نگاہ سے شہریاری اور عہدۂ سلطانی ہے۔ یہ فرخی و فجستگی سے ہم قران ہے اور منصبِ علا کہ جو ترقی خواہوں کے لیے معراجِ کمال کی انتہا ہے آں مخدوم کے خدامِ والا مقام کے لیے بامِ مراد ثابت ہوا اور تحسین و آفرین کی نظر سے

دیکھا جائے۔

امید کہ اس کے بعد کوتاہ قلمی کا جرم جسے دراز نفسی کا عذر کہنا چاہیے، خاطر عاطر کے لیے وجہِ ناخوشی نہ ہوگا اور اسد اللہ نامہ سیاہ کو نیّر مقبولیت کی تابانی اور فیض رسانی سے روسپیدیٔ جاوداں عطا کی جائے گی۔

نگاشتہ یکم جنوری ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ)

ایضاً

[۹۴]

بیکسوں کے امیدگاہ اور غربت زدوں کی جائے پناہ۔ مہربانی نامہ مع قطعہ/ زر دو صد روپیہ وصول پایا اس نوازش فرمائی نے مجھے اپنی نارسائیوں پر شرمندہ اور جناب والا کی کرم نمائیوں پر سپاس گزار بنایا۔ شاید کہ اس طرح کا عذر کا بھیجا جانا حضرت مولوی محمد علی خاں کے ایما پر تھا۔ حضرت قبلہ گاہی نے اپنے عنایت نامہ کے نوشتہ ورق میں اس سے متعلق ایک حرف بھی تحریر نہیں فرمایا تھا اس وجہ سے اور بھی حیرت ہوئی اور عجیب سا خیال آیا۔

اس عطیہ کو قبول کرنا روح اور عقل کے واسطے سرمایۂ تیرگی ہے اسی کے ساتھ عطائے بزرگان کو رد کرنا سوئے ادب اور کمالِ خودسری نتیجہ یہ کہ میں نے تینوں قطعہ ہائے زر کو اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ جب تک میں خدمت عالی میں نہ پہنچوں اور اپنا ماجرا اس تمام نظرگاہِ والا میں پیش نہ کروں اور حضرت قبلہ گاہی کی تحریر کو جو اس عطا و بخشش کی کیفیتِ احوال کی آئینہ دار ہوگی، نہ دیکھ لوں نیز اس حقیقت کا مجھے پوری طرح علم نہ ہو جائے میری روح کو سکون نہ ملے گا اور دل کی وحشت دور نہ ہوگی۔ یک شنبہ کی صبح کو میں خدمتِ اقدس میں پہنچ رہا ہوں انشاء اللہ۔

ایضاً
[۹۴]

قبلۂ حاجات۔ ہر چند ہجر میں جینا دشوار ہے اور بے دوست "زندگی یوں بھی جینے کے لائق کہاں ہوتی ہے لیکن اپنی طرف بنداِرادت کو میں اتنا استوار پاتا ہوں کہ اگر بغرضِ محال صد سال بلکہ صد ہزار سال جدائی میں گزر جائیں تو بھی میری طبیعت اسی طرح وفا پر مایل اور میری محبت روز افزوں رہے گی اور میں امید کرتا ہوں کہ اسی طرح آپ کی جانب سے بھی برابر التفات بڑھتا جائے گا۔

صداقت پیشہ، حافظ کریم بخش جو لاہور گئے ہوئے تھے اس ماہ کے شروع میں دہلی واپس آئے اور ایک رات کارواں سرائے میں آرام کر کے صبح سویرے رہ نوردی کے خیال سے جب شاہدرہ پہنچے کہ دہلی سے مشرق کی سمت تین کوس پر واقع ہے اثنائے راہ میں حافظ قادر بخش کو دیکھا کہ ان کے بڑے بھائی ہیں اور باندا (بندیل کھنڈ) سے آرہے ہیں بھائی کو راہ میں پاکر ان کے ساتھ واپس لوٹے اور دوبارہ شہر میں آئے۔

ہر چند یہ بیچارے چاہتے تھے کہ دو تین دن اپنے بھائی کے دیدار سے آسودہ ہو کر ان کی مراجعت وطن کے بعد خود الہٰ آباد روانہ ہو جائیں ان کے بڑے بھائی نے پسند نہ کیا اور خواہی نخواہی انھیں اپنے ساتھ رکھا یہ مردِ مخلص اس آستاں سے دوری کے دکھ کو محسوس کر کے روتے اور کہتے تھے کہ میں اس راہ کو اپنے پاؤں سے چل کر طے نہیں کر رہا ہوں بلکہ بے دست و پا ہوں اور مجھے قید کر کے لے جایا جا رہا ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں قرآن پاک کا ایک نسخہ مولوی سعادت حسین کے واسطے ہدیتہً لایا ہوں اور دوبارہ اُسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں جب واپس لوٹوں گا تو اپنے ساتھ لاؤں گا۔

دیگر یہ کہ انھوں نے ایک مسکوک بنام گرو گوبند سنگھ کہ والئ لاہور کے فرمان کے مطابق اس سرزمین میں سکۂ رائج الوقت ہے انھوں نے مجھے سپرد کیا ہے اور مجھ سے یہ خواہش کی ہے کہ میں اسے الہٰ آباد بھیجوں تاکہ ایک نئے سکے کو دیکھ کر مشاہدہ کرنے والوں کا دل خوش ہو۔

نامہ نگار نے ان کے کہنے کے مطابق روپیہ کو کاغذ میں لپیٹ کر خط کو ڈاک کے سپرد کر دیا۔ لیکن محکمے کے کارگزاروں نے اُسے واپس کر دیا — کہ ایسے کسی ملفوف خط کو قبول نہیں کیا جا سکتا جس میں سکہ رکھا ہو ناچار میں نے اس "پیکرِ شنگرف" کو ورقِ خط سے جدا کیا اور اُسے اپنے پاس رکھ لیا تاکہ جب کسی رہرو کو اس طرف جاتا ہوا دیکھوں تو اُسے یہ امانت سپرد کر دوں۔ امید کہ جب قبلۂ جان و دل مولوی سراج الدین احمد اس انجمن ہمایوں کی طرف آئیں تو یہ اُن کی نظر سے گزر جائے۔ تاکہ حافظ صاحب سے بصورت وداع (کذا) اور غالب سے اس کی نیازمندی کے باعث آسودہ خاطر ہوں خط کو ختم کرنے کے بعد ہم زبانی کے ذوق نے مجھے دوبارہ آمادۂ گفتگو کر دیا۔

مخفی نہ رہے کہ انھیں ایام میں نواب ذوالفقار الدولہ بہادر کے خاص آدمیوں میں سے کچھ لوگ یہاں دہلی آئے اور دیرینہ آشنائی کے باعث میرے غربت کدہ پر بھی انھوں نے قدم رنجہ فرمایا اور جب اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران نورالدین علی خاں کا احوال پوچھا گیا تو مولوی محمد علی خاں کے پس ماندوں میں کسی کا باندا ہیں نہ ہونا اور دوسرے افراد کے مابین نزاع و پرخاش کے ظہور پذیر ہونے کی بات انھوں نے کچھ اس طرح بیان کی کہ میرا دل غم آگیں اور طبیعت افسردہ ہو گئی۔

لاجرم میں نے بیتابیٔ دل کی تسکین اس میں دیکھی کہ میرے مخدوم حضرت والا کا خامۂ عطارد ہنگامہ جنبش میں آئے اور مجھے اس واقعہ کی حقیقت معلوم ہو جائے اور میں اس گروہ کی طرف سے مخالفت کے اسباب اور ستم زدہ مخدوم زادوں کا انجام کار معلوم کر سکوں۔

دولت و اقبال آپ کے پیش کار اور آسمان و ستارہ ہائے آسمان آپ کے مددگار رہیں۔ والسلام

بنام میر سیّد علی خاں بہادر غمگین (عرف حضرت پیر جی)

[۹۵]

فرد
در دل ز تمنائے قدم بوس تو شوریست
شوقت چہ نمک داد مذاق ادھم را

(دل میں تیری تمنا کے باعث ایک عجیب شور برپا رہتا ہے۔ تیرے شوق ملاقات نے میرے دل کے زخموں کو کس طرح اپنی نمک نشانی سے زندہ کر دیا ہے!)

براست رووں کے قبلہ گاہ کے قدموں پر جان نچھاور کرنے کا خیال دل میں گزرتا ہے اور گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ میں رہروانِ منزل کے کعبۂ مقصود یعنی آپ کے سر کے گرد پھر جانے کی آرزو دل میں رکھتا ہوں اور اگر ادب اجازت دے تو یہ کہوں کہ نامہ ہائے دل آویز کے پہنچنے اور محبت پیدا کرنے والے نکتوں کو سننے کی خواہش، مجھے یاوریٔ بخت کی امید سے ہم کنار کرتی ہے خدا کرے کہ یہ میرے لیے زیادہ مبارک ہو۔

جب سے مجھے آپ کے دیدہ و دل میں جگہ مل گئی ہے اگر بلندیوں کی طرف مایل ہونے کی وجہ سے میرا سر آسمان سے جا لگے تو نامناسب نہ ہوگا اور اگر خود نمائی کی وجہ سے مجھے اپنی خبر نہ رہے تو کوئی ناروا بات نہیں۔

طالع یار خاں صاحب اس محیطِ کرم کی عنایتوں کی گنتی کے مطابق مجھے عالمِ بیخودی میں اپنے سے دور کر گئے اور میری ارادتیں کچھ اس طرح بڑھ گئیں کہ اب وہ دائرۂ شمار میں بھی نہیں آتیں۔ میں اس لائق کہاں ہوں کہ اس التفات کا مستحق سمجھا جاؤں۔ نیکوئی میں میرا یہ درجہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اور مجھے دیکھنے کا آرزومند ہو اور وہ بھی ایسا کوئی بلند پایہ و عالی مرتبت شخص جو اپنے گوہرِ ذات کے اعتبار سے آبروئے ہفت دریا ہو، اور جو اپنی پاکیزہ

نفسی کے لحاظ سے رنگ و بوئے بہشت گلشن ہو۔

شبلی ماسوا اللہ قطع نظر کے باوجود اپنے درویشانہ مرقعہ میں اس کے قدوم محنت لزوم کی تمنا میں آنکھیں بچھائے رہتا ہے اور منصور اپنے ترانۂ اناالحق کے تمام شور و ہنگامہ کے باوصف اس کی زبانِ صدق ترجمان سے حق سننے کے لیے گوش بر آواز رہتا ہے۔

سبحان اللہ جس شخص کے لیے شمع طور پر پروانہ کی طرح طواف جمال کی آرزو مند ہو وہ ایسے کسی فردِ کے واسطے "ارنی گو" نیا ہوا نظر آوے اور نگاہ جس کے دیدار کی تاب نہ لاسکے وہ میرا طالب دیدار ہو۔

میں کیا کروں ایک زمانے سے میری ہمت ایک کام میں اٹکی ہوئی ہے اور ایک مقصد کی تکمیل کی آرزو جس سے میرے پیراہن کو جلا رہا ہے اور وہ ایک بہت ہی نازک کام اور ایک مطلب مشکل ہے۔ اس سے پہلے کئی سال تک ریزیڈنٹ دہلی کی سرکار میں کئی سال تک معرض کشاکش میں رہا اور ایک اچھے خاصے لمبے عرصہ تک فرمانروایان کلکتہ کی دادگاہ میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اور اب دو سال کا عرصہ ہوا کہ وہ داوری گاہ لندن میں پیش ہے اور اس پر غور و خوض ہو رہا ہے جبتک اس کا کوئی فیصلہ اور وہاں سے کوئی حکم صادر نہیں ہو جاتا میں یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا کہ دہلی سے باہر کہیں اور جا سکوں۔ اگر میں یہ چاہتا ہوں کہ اس داوری اور اس کی صورت حال ... کہانی ہے، اختصار سے بھی بیان کروں تو سلسلۂ سخن درازی کے باعث کہیں بھی راہ میں گم ہو جائے گا اور گوہر راز سننے والے کے ہاتھ نہیں آئے ... مختصر مری آنکھیں ایک راہ پر لگی ہیں اور فیصلہ اس کا اہلِ جاہ کی نگاہِ لطف پر موقوف ہے۔

یہ کشمکش جس نے میرے اور دروں و بروں کو درہم برہم کر رکھا ہے مجھے سفر سے باز رکھتی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ انتظار کا دور ختم ہوا چاہتا ہے اور کشمکش کا وقت آگیا ہے اب میں اس پر آمادہ ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ

جیسے ہی ولایت سے قطع خصومت کا حکم نامہ آجائے اس کے بعد میں صرف اتنے دن کہاں ٹھیروں جو اسباب سفر مہیا کرنے کے لیے کافی ہوں اور بس پھر دلی میں ہرگز قیام نہ کروں اور گوالیار کا سفر اختیار کروں اگر اور لوگ پاؤں کے بل چلتے ہیں تو میں سر کے بل راہ سفر طے کروں کہ ہر مرحلہ اور ہر روش پر ہم ایسے ریزہ چینوں اور زلہ ربائی کرنے والے بندگان حضور کے لیے یہ فرمان صادر ہو کہ وہ خاص وقت میں میرے اور مرے کام کے لیے دعا فرمائیں کہ میرا کام جلد از جلد ہو جائے اور میری مراد پوری ہو تاکہ میرے قدم رہ سپار ہوں اور جادۂ راہ گوالیار کو میری سجدہ گاہ عقیدت بنے۔ مخفی نہ رہے کہ طالع یار خاں صاحب کے پہنچنے سے تین دن پہلے حضرت والا کا صحیفۂ کرم کہ سراسر بہجت رنگ و بے رنگی کا رقم نامہ تھا نظر فروز ہو چکا تھا اور اسی طرح مجھے امید ہے کہ اس عریضہ کے خدمت اقدس میں ورود سے چند روز پیشتر سید امانت علی بارگاہ والا میں پہنچ جائیں گے اور آداب نیاز کو عرصہ گاہ قبول میں پہنچانے کے علاوہ فارسی غزلیات کو نگاہ عطوفت پناہ تک پہنچا چکے ہوں گے۔

اسی زمانے میں میرے عنایت فرما میجر جان صاکوب بہادر کے دو عنایت نامے تعمیر دولت خانہ کی تاریخ کی فرمائش کے سلسلہ میں موصول ہوئے۔ ہر دو مکتوب کے جوابات کہ قطعہ تاریخ پر مشتمل ہیں اس عریضہ کے ساتھ ہم نورد ہو کر —— نظر گاہ والا تک پہنچ رہے ہیں۔ کشادہ عنوان ہیں حضرت والا ان کو پڑھ سکتے ہیں۔

حکیم رضی الدین صاحب کہ مجھے اپنے اور پرسش احوال سے نوازتے ہیں اور میں اس غم زدگی میں ان کے دیدار سے اپنی روح کو شادماں کرتا ہوں۔ سلام نیاز پہنچا رہے ہیں اور میری طرح حضرت والا کے مشتاق جمال ہیں زیادہ ادب۔

بنام میجر جان جاکوب بہادر

[۹۶]

مخلصوں کے امید گاہ، میں کہ بندۂ محبت اور خانہ زادِ وفا ہوں ایک بار یاد آوری کے بدلے میں سو بار سپاس بجالاتا ہوں اور ایک گونہ بندہ پروری کا احساس کرکے ہزار گونہ ستایش سے اپنی زبان کو آشنا کرتا ہوں۔ دل نواز نامہ بسبیل ڈاک سے مجھے مل گیا اور اس نے کالبدِ شوق میں نئی روح پھونک دی۔ اس کے بعد طالع یار خاں نے ایک اور خط میرے سپرد کیا اور اس طرح اس بے جان کو نئی تاب و تواں بخش دی۔

خامۂ مشکیں رقم کی جنبش ابروان دو پردوں میں اس طرح نوا پرداز ہوتی ہے کہ آپ گوالیار میں، ہر طرح راحت بخشنے والی موری تعمیر کرا رہے ہیں اور اس کی تاریخ تعمیر کے لیے اس جناب نے نادر رقم سے فرمایش کی ہے۔

محبت جو میرا دین ہے اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی فن دعا و تاریخ

کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی اور صنعت الفاظ کو معنی کے مقابلہ میں کبھی قبول نہیں کیا۔

لیکن چونکہ آپ کی خاطر عاطر اسی کو پسند کرتی ہے کہ میرا قلم اس راہِ نگارش میں گام زن ہو اور میری رگِ اندیشہ اس خیال کے ساتھ جنبش میں آئے میرے قلم کی کیا مجال کہ وہ اس راہ میں سر کے بل نہ چلے اور فکر کی کیا مجال کہ وہ اِس روش کے ماسوا کسی دوسری راہ کو اختیار کرے۔

سات شعروں پر مشتمل ایک قطعہ اسی خط کے ساتھ لکھ رہا ہوں آپ کی عنایت سے یہ بعید نہیں اسے پسند فرمائیں، اور اگر قبول کرلیں تو اس پر مجھے تعجب نہ ہوگا۔

جانِ جانگوب آں امیرِ نامور
دستِ وے آرائشِ تیغ و نگیں
ساخت زانساں منظرے کز دید نش
حور گفت احسنت و رضوان آفریں
در بلندی افسرے فرقِ سپہر
در صفا گلگونۂ روئے زمین
بایدش گفتن گلستانِ ارم
زیبدش خواندن نگارستانِ چین
خود سر شکوب و مشکویش ز اوج
در نظر باشد سپہرِ ہفتمین
غالب جادو دم نازک خیال
کش بود اندیشۂ معنی آفریں
گفت تاریخ بنائے ایں مکاں
آسمانی پایۂ کاخ دل نشیں

۱۲۵۴

والسلام والاکرام

ایضاً

[۹۷]

فرد حق نہ آنست کہ از رفتنِ باطل برود
فرد مہرِ تو از دل، خود اگر دل برود

(حق وہ نہیں ہے کہ باطل کے غائب ہو جانے کے نتیجہ میں وہ بھی غائب ہو جائے۔ تیری محبت اس وقت بھی نہ جائے گی اگر خود دل ہاتھوں سے نکل جائے۔)

مہر و محبت سے بھرا خط جو گلہ آمیز بھی تھا نظر فروز ہوا دل کو مژدۂ حیات اور روح کو نوید فرحت بخشی میرا خط نہ پہنچنے کی وجہ سے آپ گلہ گزار ہیں۔ میں کیسے کہوں کہ یہ شکوہ جائز نہیں لیکن اتنا تو میں کہہ ہی سکتا ہوں کہ اگر ادھر سے صحیفۂ مودت آتا اور میری طرف سے جواب نہ لکھا گیا ہوتا تو شکوہ کرنا حق بجانب ہوتا۔ میں ایک درویش طبع اور فقیر منش ہوں جو وفا شعار اور راست گفتار ہے۔

میرا یہ شیوہ نہیں کہ میں اپنی گم نامی کو نام آوروں کی ہوائے نام کے سپرد کردوں اور اپنی یاد آوری کا بندِ زحمت دوسروں کے دل پہ رکھنے کو پسند کروں میرا اپنا یہ انداز بھی نہیں کہ وفاداری میں سست روی کو راہ دوں اور دوستوں کے مخلصانہ خطوں کا جواب دینے میں تاخیر کروں میں آزردہ نہیں ہوں میری دل جوئی کی فکر نہ کریں اور اپنے دل سے یہ ملال دور کر کے مجھ پر احسان فرمائیں۔

چاہ یعنی کنوئیں کے لیے مادۂ تاریخ بھیجنا اور مجھ سے تاریخ کی فرمایش کرنا بھی عنایت فرمائی کا ایک انداز ہے۔ حق یہ ہے آپ نے نہیں چاہا کہ غالب غم زدہ اور درماندۂ راہ کا دل فکرِ تاریخ میں پریشاں ہو اور یہ کہ مادۂ تاریخ بھی ایسا نہیں کہ اس کا حقِ ستایش ادا ہو اس کے ہم پلہ فکرِ سخن کیا جا سکے۔

قطعہ آپ کی خدمت میں پہنچ رہا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمائیں اور میری ناکردہ خطاؤں سے درگزر دیں۔

آں سپہرِ فرزانہ کہ موسوم بہ جان است

وان راست دم ودانش والائے کہ دریافت
فرمودئیے کندن چاہے کہ دراٰنست
آبے کہ سکندر بہوس محبت خضر یافت
خود چشمۂ رفیض ابدی گفتہ بہ غائب
نبوشت چوں آں دل زدہ زیں نکتۂ خبر یافت
بستودو درین قطعہ در آورد رہماں وقت
تاریخ دگر نیز با معانی نظر یافت
خورشید زمیں گفت و دریں زمزمہ دل بست
۱۳۴۷
دیں تعبیہ را خوب ترا ز گنج گہر یافت
۱۳۴۷

ایضاً
[۹۸]

ایں نامہ کہ راحت بدل ریش آورد
سرمایۂ آبروئے درویش آورد
در ہر بن مو دمید جانے یعنی
سامان نثار خویش با خویش آورد

(یہ نامۂ عنایت کہ دل مجروح کے لیے خوشبوں کا پیغام لے کر آیا اور اس درویش بے نوا کے واسطے فخر و ناز کا سرمایہ بن گیا اس نے میرے ہر بن مو میں ایک جان تازہ پھونک دی اور اپنے اوپر نچھاور کرنے کا سامان خود اپنے ساتھ لے کر آیا۔)

اس نامۂ عنایت کی دل آسائی اور رواں افزائی میں جس قدر مسرت کا اظہار کروں کم ہے۔ کہ وہ اپنی دل نوازی میں نمود سحر ہے تو اپنی جاں فزائی میں رقص نسیم سحرگاہی بہ شگفتن گلہائے تازہ" کی مثال ہے۔

اگر اس کی سپاس نگاری جنبش قلم پر مجھے سرورواں کا دھوکا ہو تو جائز ہے اور اگر صریر خامہ کو ہیں نغمۂ عندلیب صبح سے تعبیر تو کون تعجب کی بات ہوگی۔ ہاں وہاں

جب طلوعِ صبح کا ہنگام ہو تو نسیمِ سحر کو اہتزاز فرمائی سے کون روک سکتا ہے اور جب شگفتنِ گلہائے ناز کا وقت ہو تو سرو کو محوِ خرام ہونا ہی چاہیئے اور یہ سب ہو تو بلبل محوِ فریاد و فغاں کیوں نہ ہو میر نواب نے خط پہنچا کر مجھ پر احسان کیا وہی احسان جو ابرِ نیساں تودۂ خاک پر اور بادِ بہار رگِ تاک پر کرتی ہے۔

میں دور ہوں یا نزدیک بہر حال آپ کا ہوا خواہ ہوں اور چاہے "گویا" ہوں یا خاموش آپ کا بہر حال شکر گزار ہوں۔

میرے پراگندہ خیالات کا مجموعہ جسے "دیوان" کہہ کر یاد کیا جاتا ہے اُسے ایک "گلدستہ" کے طور پر اس انجمن میں پیش کیا جائے یہ ایک ایسی ہی بات ہے کہ کوئی شخص خار و خس کا مجموعہ اہلِ چمن کو پیش کرے اس معاملہ میں میری فرو ماندگی کو وہ سمجھے اور میری سراسیمگی کو وہ جانے جو اپنی شکستہ پائی کے ساتھ رفتار میں آئے اور "الکن" ہوتے ہوئے گفتگو کرے۔

میرے کہے ہوئے کو وہ عزت و توقیر کہاں حاصل ہے کہ اس پر پسندیدگی کی مہر ثبت کی جا سکے میں اُسے بھیجوں تو شرمندگی نہ بھیجوں تو ندامت۔ حد سے بڑھی ہوئی شرمندگی۔ سخن کوتاہ میرے پاس کچھ ہے تو وہ ایک بے سر و پا مسودہ اور ایک ورق ورق تحریر ہے میں کسی ایسے کاتب کی تلاش میں ہوں جو درست لکھ سکے اور عبارت نگاری کا حق ادا کر سکے۔ جیسے ہی مل جائے گا میں اوراق اس کو سپرد کر دونگا تاکہ وہ اس سے ایک قلمی نسخہ تیار کر دے اور مجھے دیدے۔

امید کرتا ہے کہ جیسے ہی یہ نسخہ تیار ہوگا آپ تک پہنچایا جائے گا چاہے وہ میر نواب صاحب کی معرفت یا بہ سبیلِ ڈاک۔ اس کی طرف سے خاطر جمع رکھیں۔

ایضاً

[۹۹]

ایکہ بر نامۂ نام تو ز دیوانِ ازل

بستہ اند از اثرِ دولتِ جاوید طراز

دا ہے کہ تیرے نام کی سرنوشت کے ساتھ دیوان ازل میں لکھا گیا ہے کہ اس پر دولت جاوید کا سایہ ہے)

نامۂ اندوہ ربا کے ورود سے جو کل مجھ تک پہنچا وہ مسرت حاصل ہوئی کہ فرادائے قیامت تک دل کو ہر روز نئی شادمانی بخشتی رہے گی۔

سبحان اللہ ایک ایسے آدمی بلکہ بیکس و ناکس کو جو اس لایق بھی نہ تھا کہ اس سے پرسش احوال کی جاتی اور جو اس خطا کا احساس کرکے جو اس سے سرزد ہوئی ہے خود ہی لرزہ براندام رہتا ہے مہربانی و لطف فرمائی کے خیال سے اس کے اندوہ خاطر کو دور کرنے اس کی دل جوئی اختیار فرمانے اور خط کی سیاہی کے زلال رواں سے اس کے چہرہ سے گرد ملال کو دھونے کی یہ سعی و کاوش۔

اتنا ہی نہیں بلکہ انداز کریمانہ کے ساتھ اس کو نوازنے اور کم خدمتی کے شکوے سے شرمسار نہ کرنے کی یہ روش اب میں کیا عرض کروں میں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ یہ کتنی بڑی بخشایش و مہرورزی ہے۔

آپ نے سیدالاخبار کے بارہ میں داد نگارش دی ہے اور یہ دوسرا احسان ہے جو مجھ پر کیا گیا ہے۔

پنہاں نہ رہے کہ مطبع سلطانی کا نقش میرے داستان روحانی میں سے ایک دوست کی طبع عالی کا نمونہ ہے۔ نئے دستور کی نمایندگی کرنے والے اس مطبع کے بارہ میں ایک کارفرما کی یہ رائے ہے کہ اس میں نو بنو نقش صورت پذیر ہوتے ہیں اور یہی وہ "نو آیین کدہ" ہے جس نے غالب بے نوا کے رشحات قلم کو زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے اس میں "دیوان ریختہ" بھی ہے کہ وہ ناتمامی کا "نمونۂ تمام" ہے ممکن ہے اسی ماہ میں اس کی طباعت کا کام پورا ہو جائے اور پھر وہ نظرگاہ والا میں پیش ہو۔

اسی طرح "پنج آہنگ" اور دیوان فارسی کا معاملہ ہے ان کا انطباع اس پر منحصر ہے کہ خریداروں کی درخواستیں کتنی موصول ہوتی ہیں بہرحال جب ان کا وقت آئے گا یہ کتابیں آپ کی خدمت میں پہنچ جائیں گی۔

اوراق اخبار ہر ہفتہ پہنچتے ہیں اور اس سلسلہ کے ٹوٹ جانے کا کوئی خطرہ نہیں کہ کارپردازان مطبع نے نام نامی کو فہرست خریداران کا تمغۂ عنوان بنا دیا ہے اور مجھے اس والا نظر کے نظر پروردوں میں شمار کیا ہے۔

دوسرے اس عطوفت نامے جس کا میں اس وقت جواب لکھ رہا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جو قطعۂ تہنیت شہزادۂ والا تبار کے تولّد سے متعلق تہنیت کے طور پر لکھ کر بارگاہ خسروی میں پیش کیا تھا آپ نے اُسے "زبدۃ الاخبار" کے اوراق میں پڑھا اور اس کے حق میں کلمات تحسین نگارش فرمائے۔ اسے دیکھ کر میری حیرت اور مسرت میں اور بھی اضافہ ہوا چاہ دواں رہیے کہ آپ سخن رس و سخن داں ہیں۔

والسلام مع الاکرام

ایضاً

[۱۰۰]

قطعہ اے نشانات خرد در تو ہویدا تر ازاں

کہ سرود از لب و آب از گہر و تاب زِ مہر

ہم ز روے تو نمودار توانائی راے

ہم زخوے تو پدیدار دل آرائی مہر

(اے کہ تجھ میں نشانات خرد اس سے زیادہ نمایاں ہیں، کہ نغمۂ سرود لبوں سے آب گہر سے اور درخشانی مہر عالم تاب سے تیری راے کی توانائی و تابناکی، تیرے رُخ روشن سے نمایاں ہے نیز تیری طبیعتِ عالی سے مہرِ فروزندہ سپہر کی دل آرائیاں نمودار ہوتی ہیں)

مہربانی نامہ اپنی فرخی و فیروزی کے ساتھ پہنچا، کہ دل رسی اس پر ناز کرتی ہے اور مسرتِ خواندگی اس سے بالیدگی پاتی ہے۔ اس کی سیر نے نظر کو فروغ اور دل کو فراغ بخشا اس کی تہ نوردیوں کو جیسے جیسے کھولا گیا اسی کی نسبت سے دامان نگاہ موتیوں سے بھرتا رہا۔

خامۂ آگہی ہنگامہ کی جنبش اس پردہ میں یہی آہنگ رکھتی تھی کہ جب دیوان حافظ کو جناب والا نے اپنی کوشش بسیار اور سعی خوش آثار کے وسیلہ سے دیوانِ حافظ کو غلط نگاریوں سے پاک کیا ہے اور اس شاہد روحانی کے زلف و رخسار کو شانہ کاری و غازہ آرائی کرکے اعجاز نمائی کے لائق بنا دیا ہے تو اب خاطر عاطر میں یہ بات آئی ہے کہ غالب خستہ جگر جو پتھر اور گوہر میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔

وہ اپنے سخن کے دریا قوت سے نئے انداز کے ساتھ دیباچہ نگاری کرے اور اسے نئے آیئن نگارش کے مرقع کے طور پر اس شاہد معنی کے ساتھ سجا دے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ جو کچھ اس باب میں خود جناب والا نے فرمایا ہے نیز جو نگارشات دوسروں کی تحریروں میں سامنے آئی ہیں ان کو بھی اس دیباچہ میں شامل کیا جائے۔

میرے مخلص میرے کرم فرما میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی بات تو الگ ہے جو مجھ تک نہیں پہنچا اس کی صحت و درستی کے فرمان و فرمایش سے اپا نازیبا نہیں اس لیے دیباچہ تو نہیں آیئن تقریظ نگاری کے بارہ میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

لغات عرب میں تقریظ اس عبارت کو کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ کتاب کو اتمام تک پہنچایا جاتا ہے چونکہ میں نے لکھ دیا ہے کہ جو کچھ میں نے سپرد قلم کیا ہے وہ تقریظ ہے دیباچہ نہیں — ہر آیئنہ اس لایق ضرور ہے کہ اس قدسی صحیفہ میں اسے جگہ دی جائے خود وہ کرم فرما دیباچہ کیوں نہ لکھیں۔ کہ دوسروں کی تحریروں کی نشان دہی بھی اس میں ہو جائے اور اس تقریظ کے تذکرہ کو بھی اس میں شمولیت کا شرف بخشا جائے۔

امید کہ آپ مجھے دوستانِ وفا شعار میں شمار کریں گے اور نگارش مکتوب کے ساتھ مجھے اپنے طبع زاد اشعار سے بھی نوازیں گے۔ نیز مہر و محبت کے رشتوں کو زیادہ مستحکم بنانے کی سعی فرمائیں گے۔

ایزدی بخشایش جناب والا کو وہ بختِ خوش ارزانی فرمائے جو پردہ کشائے خرد ہو اور اس عقل روشن گہر سے نوازے جو خوش بختی کی طرف رہنمائی کرے۔

عزت مآب شوکت انتساب مسٹر جیمس طامسن بہادر

[۱۰۱]

بجناب شوکت نصاب صاحب عالی مناقب والا شان امیدگاہ خیر اندیشاں و قدر افزائے نیاز کیشاں زاد افضالہ۔ (حضرت والا) یہ نیاز مند آداب نیایش اور نذرانۂ ستایش پیش کرتا ہے خوش قسمتی کی تاب و تواں کے سہارے یہ عریضہ نظر گاہ والا میں روانہ کر رہا ہوں۔

منشور لامع النور نے ورودِ مسعود سے نوازا اور سپہر سخن کو طلوع مہر کی طرح روشن و منور کیا اور بساط امید کو گوہر غلطاں سے سجا دیا اس کا عنوان بھی اپنی نظر فروزی کے باعث انتظار کرنے والے دلوں کے لیے اندوہ رُبا نیز اس کا مضمون اپنی دل نشینی

کے ساتھ آرزو مندوں کے واسطے اُمید افزا، تاکہ میں اس ہمایوں نامہ کے سرمۂ تحریر سے اپنے نورِ بینش میں اضافہ کر سکوں اور اس صحیفۂ آگہی کے جلوہ تمثال سے خوش وقت ہوتا رہوں، کہ ہنوز شبِ انتظار کی سحر نہیں ہوئی اور دادگاہ ولایت سے مقدمہ کے بارہ میں حکم نہیں آیا ہے۔

فرد۔ تا خود پس از رسیدن قاصد چہ رخ دہد
خوشم می کنم ولے ز امیدِ خبر ہنوز

قاصد کے آنے کے بعد کیا ہوگا یہ تو میں نہیں جانتا اس وقت تو میں اُس کی آمد کی خبر ہی سے خوش ہو گیا ہوں۔

فی الجملہ میں اس کے لیے آپ کا بے حد سپاس گزار ہوں کہ مجھ ایسے کو جو لطف وکرم کے لائق نہ تھا آپ جیسے ایک حاکم عدل گستر و فریاد رس کی شریفانہ خصلت نے اپنے رشحات قلم سے محروم نہ رکھا اگرچہ میری خاک وجود کا ذرہ ذرہ ساقی کی تردستی وسیرہ بخشی سے کام یاب ہے لیکن چونکہ میں راہِ اُمید کا ایک ایسا مسافر ہوں جو مدعا طلبی کے میدان میں کہ صرصر وسموم کی آماجگاہ ہے، ناکامی کی کڑی دھوپ میں اپنی جگر تشنگی کے باعث برابر جل رہا ہوں اس لیے زلالِ التفات کی پیاس باقی ہے۔

گورنر کلکتہ کی بارگاہ گیتی پناہ کا حکمنامہ کہ جو مجھ سے ملازمان حضور کے پاس رہ گیا تھا وہ آپ کے اس صحیفۂ قدسی کے ساتھ لپٹا ہوا مجھے واپس مل گیا خداوندا اس ذات والا صفات و ملکوتی آیات کے واسطے آثار جہاں گیری و جہاں داری کو جاوداں فرمادے اور مدعا بخشی کے اسباب اور بندہ پروری کے وسایل میں افزونی و فراوانی عطا کرے۔

عریضہ نگار و ہوا خواہ اسد اللہ۔

ایضاً

[۱۰۳]

بخدمت کثیر البرکات صاحب والا صفات، عالی گہر بندہ پرور، عیار افزائے آرزو منداں و امیدگاہ ثنا گستراں زاد افضالہٗ۔ مدحت گری کی توفیق نمود پذیری دکہ صحیفۂ نام

آوری کا تمغۂ عنوان ہے۔) اپنی خوش بختی پر نازاں ہے اور اس خوش نصیبی کی بخشی ہوئی تاب و تواں کو جو سخنوری کے طالع سازگار کے فروغ کا باعث ہے اپنے لیے عرضِ مدعا کا وسیلہ بناتا ہے۔ جس دن کہ یہ راہِ بندگی کا رہ نوردِ ستارہ عقیدان کے سرپرسیر رکھتا تھا یعنی اس مبارک انجمن میں اس کی جگہ تھی جو صاحبانِ فضل و کمال کے لیے عیار و اعتبار کی کسوٹی ہے۔ زمانے کی تنگ دلانہ خواہش کے علی الرغم دیدار فیض آثار سے دم بدم اپنے دل کو شادماں کرتا تھا اور خود کو ارزش التفات اور شعر و سخن کو حسنِ قبول کا مژدہ سناتا تھا تاآنکہ ان امید افزا نوازشوں کے مشاہدہ سے افسونِ آرزو نے نہادِ شوق میں اپنے نقوش مرتسم کیے۔

افزائشِ آبرو کی چشم داشت میں رشحاتِ قلم کی پیش کش پر مائل ہوا۔ ہر چند مقام ناشناسی کے باعث زمزمہ تمنا کو ساز دیا۔ لیکن ادب نے کہ حسنِ طلب کے قانون کا پردہ سنج ہے اسی پردہ سے آواز دی کہ مدح سرائی کے بغیر آفرین کا طلب گار ہونا اور بندگی کے بنا اس کے بدلہ کی آرزو رکھنا کہاں کا دستور اور کیسا آئین ہے۔

غرض کہ یہ خیال دامن گیرِ خاطر ہوا کہ خاموشی کو روا نہ رکھا جائے اور ایک آہنگ دل کشا کے ساتھ سازِ سخن کی پردہ بندی کی جائے اور غم کی دل گدازی، یاس کی جاں سوزی، زمانہ کی ناسازگاری رائے کی آشفتگی، تیرگیٔ اندیشہ، تنگیٔ دل اور تاریکیٔ ہوش کہ اگر ان سب میں سے ایک بھی کسی سخنور کے دل و دماغ پر بے طرح چھا جائے تو نفسِ ناطقہ کہ جس کو زندگی جاوداں اور چراغِ ہفت آسماں کہا جاتا ہے اس ستم زدہ کے پیکرِ خاکی میں شررِ مردہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

میں کہ ان سب آلام میں گرفتار ہوں (اور ان کے ماسوا کتنے غم ہیں کہ وہ سایے کی طرح ہمہ وقت میرے ساتھ لگے رہتے ہیں)، کیسے دادِ سخن دے سکتا ہوں اور لائقِ تعریف مدح سرائی کر سکتا ہوں۔ ناچار میں نے قصیدہ کی راہ اختیار نہیں کی اور ایک غزل کہ زدہ آورد کے طور پر میری فکر کا معقول کی گئی آپ کے ضمیرِ منیر پر کہ داور داوِ پیشہ و درست اندیشی میں بہ ادنیٰ تامل یہ بات روشن ہو جائے گی کہ ایسے ہاتھ میں جس کے ہر ناخنِ انگشت میں ایک

اذیت ناک پھانس چبھی ہوئی ہے غزل نگاری میں اس کی روشِ خامہ کا انداز کیا ہوگا۔

اگر بے نوا یوں کی طرف سے ایک برگِ سبز کو تازہ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی جگہ قبول کرلیں تو کیا تعجب کی بات ہے اور اگر غم زدوں کی نالہ کشی سے نشاط زمزمہ حاصل کریں تو کون سی انوکھی صورت پیدا ہوگی میں خود اس کے بعد اپنے لبوں پر خاموشی کی مہر لگاؤں گا اور جواب خط کا امیدوار رہوں گا۔ اب دیکھنا ہے کہ جناب والا کی مہربانی و کرم فرمائی کا تقاضہ کیا رہتا ہے اور اس پردہ سے کہ پردۂ رازِ ستایش ہے کیا جلوہ نما ہوتا ہے۔

غزل

تا بسویم نظرِ لطف جمس تا من است — سبزہ ام گلبن و خارم گل و خاکم چمن است

اے کہ تا نام تو آرایشِ عنواں بخشید — صفحۂ نامہ بشادابیٔ برگِ سمن است

کلکم از تازگیٔ مدحِ تو در بارۂ خویش — شارحِ افسانۂ بناگوشِ حسن است

گوہر افشانیٔ مدحِ تو بجنبش آورد — خامہ ام را کہ کلیدِ درِ گنجِ سخن است

ہر دم از رائے بلندِ تو کند کسبِ ضیا — مہرِ تاباں کہ فروزندۂ ایں انجمن است

بخیالِ تو بہ مہتاب شکیم کہ مگو — عکسِ روئے تو دریں آئینہ پرتو فگن است

راست گفتارم و یزداں نہ پسندد جز راست — حرفِ ناراست سرودن روشِ اہرمن است

آنچناں گشتہ یکے دل بجانم کہ مرا — می تواں گفت کہ گنجے ز دل اندرون است

راستی اینکہ دمِ مہر و وفائے تو بدل — باہم آمیختہ مانندِ رواں با بدن است

دوری از دیدہ اگر روئے دہد دور نہ — زانکہ پیوستہ ترا در دلِ زارم وطن است

داور اگرچہ ہمائیم بہ ہمایوں سخنے — لیک در دہر مرا طالعِ زاغ و زغن است

جز باندوہِ دل و رنجِ تنم نفزاید — نالہ ہر چند ز اندوہِ دل و رنجِ تن است

سینہ می سوزد ازاں رشک کہ در دتن ست — بجگر می خلد آں خار کہ در پیرہن است

بیکسی ہائے من از صورتِ حالم دریاب — مردہ ام بر سرِ راہ و کفِ خاکم کفن است

حیف باشد کہ دلم مردہ و پرسش نکنی — بجہاں پرسشِ ماتم زدہ رسمِ کہن است

چشم دارم کہ فرستی بجواب غزلم — آں رضا نامہ کہ از لطف تو مطلوب من است

غالب خستہ بجاں جاے برآں درد اود

گر تبن معتکف گوشۂ بیت الحزن است

میرا آئینہ صیقل چاہتا ہے میرا زخم دل طلب گار مرہم ہے اور میں ایک ایسا فقیر ہوں جو مدد چاہتا ہے اور میرا نام اسد اللہ ہے)۔

ایضاً

[۱۰۳]

(بہ سلسلۂ تقرری بہ گورنری اکبر آباد)

نواب عالی جناب کے حضور میں کہ فریدوں جیسا دبدبہ و شکوہ رکھنے والے حاکم ہیں جو شاہ نشان و سلطان شوکت ہیں عطارد و ستارہ جن کا پیش کار ہے اور کیوان جن کے در دولت کا پاسبان، ایزد پاک ان کے اقبال کو ہمیشہ قایم رکھے اور ان کے جاہ و جلال کو بڑھائے۔

میں بہ عنوان تہنیت بندگی بجا لاتا ہوں۔ زندگی میں جو سرمایۂ ناز و وجہ امتیاز ہے یہ نیاز مند آپ کی ہنر پسندی کے ساتھ فرماں روائی و جاہ مندی کو خود اپنے بخت کی بلندی تصور کرتا ہے۔

یہ بات ہنوز میرے دل نشین ہے اور بہ گمان غالب آپ کے بھی خاطر نشان ہوگی کہ اس دن جب اس فقیر نے سراپردۂ قرب میں دوبارہ راہ پائی تھی اور قسمت کی ہمدمی اور ستارۂ خوش بختی کی یاوری سے مجھے آپ کی بارگاہ اقدس میں یہ عرض داشت پیش کرنے کا موقع ملا کہ چند سطریں بطور فرمان خوشنودی قلم گہربار کی رگ جاں سے لکھوا کے تعویذ کامیابی کی طرح اس عریضہ نگار کی زنجیر گردن میں آویزاں فرما دیں تاکہ جب نقش جہاں داری و گورنری کرسی نشین دولت ہو تو یہ فرمان پذیر بندہ اپنی دیرینہ تمنا کو اس کے آئینۂ قبولیت میں جلوہ گر دیکھے۔ اس وقت جناب والا نے فرط عطوفت و مہربانی سے اس مبارک جواب کے ساتھ سائل کی آبرو بڑھائی

اور اس کے دل کو تقویت بخشی تھی کہ اس بندۂ توفیق طلب کی کارفرمائی اور آرزوئے دلی کی تکمیل کا وقت آئے گا تو اس نوع کے مہربانی نامہ کے صدور میں کوئی دریغ نہ کیا جائے گا

خدا آگاہ ہے اور یہ بندہ اس کا گواہ کہ یہ وعدہ اپنی بہترین صورت وادا کے ساتھ وفا پذیر ہوا اور وہ بخشایشِ عظیم ظہور میں آئی کہ اس کی سپاس گزاری ہزار زبان سے بھی نہیں ہوسکتی۔

اس کے باوجود کہ اس وقت میں تازہ تازہ بارگاہِ والا میں زمیں بوس ہوا تھا اور اس آستانِ سپہر نشان پر اپنا کوئی حق بندگی نہ رکھتا تھا میرے حال پر یہ سب عنایتیں اور نوازشیں تھیں۔ تو اب کہ میں اس بارگاہ کے دیرینہ متوسلین اور راہِ تعلق کے پرانے خاک نشینوں میں سے ہوں، ہر آئنہ اس دلی خواہش کے ساتھ کہ ہر روز کسی شرف بخشی کی امیدوار اور ہر دم کسی بخشش کی خواستگار رہی ہے۔ گورنریٔ اکبر آباد کی مسند نشینی اور اس عہدۂ جلیل کی وجود مسعود سے آرایش کو میں اپنی دعائے سحر گاہی کی قبولیت کا نتیجہ قرار دیتا ہوں۔

اس صورت حال نے میری آرزوؤں کے سامنے درِ دولت کھول دیا۔ نیز اس لیے کہ وہ شہر میرا مسقط الرآس ہے اور اسی سرزمین میں میری جاگیر بھی تھی، میری امیدوں میں ہزار گنا اضافہ کر دیا۔

میں بندۂ خالص الاخلاص تھا اب رعیت خاص الخاص کے زمرہ میں آگیا، میں بندگی میں بہت ہی چست کمر تھا اب رعیت گری میں رعایت خاص کا مستحق بن گیا۔

جس مسرت و شادمانی کے ساتھ یہ مژدۂ جانفزا میں نے سُنا، سوگند بخدا کہ اگر ہزار در ہزار خزانے میرے پاس ہوتے تو میں انھیں خلقت کی خوشنودیوں پر نچھاور کر دیتا اور اس بادۂ نشاط کی سرخوشی جو اس وقت میرے رگ و پے میں دوڑ رہی ہے اگر مجھے مغت کی خوردہ گیری کا خیال نہ ہوتا تو خود کو جمشید و خسرو پرویز قرار دیتا۔ زمین والے اس شادمانی کے دعوے کو اس وقت مانیں گے اور آسمان والے اس انبساط کے عیار

کو اس وقت تسلیم کریں گے کہ ہوا خواہوں کی شاخ تمنا گلفشاں ہو اور اکبر آباد نسیم بہار کے لطف خرام یعنی موکب شہریاری سے — رقع رنگ و بو بن جائے۔

اور میں کہ سیہ مست شوق ہوں عندلیب گلشن اقبال بن کر بیخودانہ اٹھوں اور حرف تہنیت کو پیش کرنے کے لیے اپنے نطق و شعر سے ہزار زمزمے پیدا کروں۔

قطعہ

ہوا نجیر نشانست و ابر گوہر بار
ہموں گل بہ سریر چمن مبارک باد
رباب نغمہ نواز ست و نے ترانہ فروش
خروش زمزمہ در انجمن مبارک باد
بہ بزم نغمۂ چنگ و رباب ارزانی
بہ باغ جلوۂ سرو سمن مبارک باد
ز بادہ ہا کہ بہ میخانۂ خیال کشند
طلوع نشۂ اہل سخن مبارک باد
فضائے آگرہ جولاں گاہ مسیح دمیست
ز من بہم نفسان وطن مبارک باد
بہ ایں گرختہ در نخور بودہ ام عمرے
نشاط خاطر و نیرو ئے تن مبارک باد
ہزار بار فزوں گفتم و کم است ہنوز
گو در تیرگی بہ جم ں ما گمسن مبارک باد

کرم خداوندی کے اعتماد پر کہ ذریعہ ارجمندی ہے اس عریضہ میں یہ مدعا رقم پذیر کیا جاتا ہے کہ میں ان کے جواب سے محروم نہ رکھا جاؤں تاکہ اس عرض داشت کے پہنچنے کے ساتھ آپ کی بارگاہ والا میں مجھے اپنی ارزش کا حال بھی معلوم ہو جائے۔ ہو سکے کہ اقبال مندی کا سورج فروغ بے زوال کا سرچشمہ بن جائے۔

بنام میر مہدی مجروحؔ

[۱۰۴]

یہ بات، نزدیکوں کے واسطے، باعث مسرت اور دور والوں کے لیے، یک گونہ بشارت ہے کہ بادشاہ سپہر پناہ نے، فرمان جاری کیا اور ناظر بارگاہ نے سخن وروں کو ایوان نظارت میں، اس امر کی اطلاع دی کہ جمعہ کے دن ماہ فروری کی ۲۵ تاریخ کو، اس خجستہ نشیمن میں آئیں اور جامِ سخن سے ایک دوسرے کے ساتھ بادہ پیمائی کریں۔ شہزادگان بابریہ کی ایک جماعت اور آزادگان شہر میں سے کچھ اشخاص جمع ہوئے لوگوں کا کچھ ایسا اژدہام ہوا کہ جگہ تنگ ہو گئی اور لوگ ٹھسا ٹھس بھر گئے۔

سب سے پہلے، سلطان الشعراء شیخ ابراہیم ذوقؔ نے، حضرت والا کی غزل اس خوش آوازی کے ساتھ پڑھی کہ زہرا جو مغنیۂ فلک ہے آسمان سے نیچے اتر آئی۔ بعد ازاں شہزادۂ یوسف دیدار، ہمایوں آثار، مرزا خضر سلطان بہادر نے اس طرح تازہ میں اپنی غزل پیش کی، گویا اپنے اشعار گوہر نثار کی صورت میں، بساط بزم پر ستاروں کی بارش کر دی، اس کے بعد مرزا حیدر شکوہ، مرزا نور الدین اور مرزا عالی بخت نے کہ عالیؔ تخلص کرتے ہیں، سازِ سخن چھیڑا اور نغماتِ شعر کو بلند آہنگ کیا۔

غالبؔ آشفتہ نوا نے کہ مرزا عالی بخت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اپنی طرف سے دس شعر اس بزمِ سخن میں پیش کیے، مجوی نام ایک امرد نے کہ تم کدۂ صہبائی کے مے نوشوں میں ہے، اپنی صدائے طفلانہ کے ساتھ اہل محفل کو متوجہ کیا مرزا حاجی شہرت نے کم بیش نو شعروں پر مشتمل، اپنی غزل طرح میں پڑھی اور سامع، اہل انجمن کو اپنا یہ شاعرانہ تحفہ پیش کیا، میں آب گزاری کا بہانہ کر کے محفلِ سخن سے باہر آیا اور اپنے غم کدہ کی راہ لی۔

دکانوں کے در کھلے ہوئے تھے اور چراغ روشن تھے، ابھی یہ کہیے نصف شب کا وقت گزرا نہیں تھا، میں نے بوریائے بے ریائی پر اپنی محفل سجائی، دو چار جام چلے اور بادۂ ناب کی جرعہ چشی کی

بعد صبح پھر ارک سلطانی میں گیا، چاروں مغل شہزادوں نے جن کا نام اس سے

پہلے لکھا جا چکا ہے زمزمہ شبانہ کو تازہ کیا۔ میں نے بھی دوبارہ غزل پڑھی بعض ہمدموں سے معلوم ہوا کہ تمام رات ہنگامہ شعر و سخن رہا صبح ہونے کے قریب محفل برخاست ہوئی۔ کہتے ہیں کہ سلطان الشعرا نے مشاعرہ کے اختتام پر اپنی دو غزلیں پڑھیں لیکن وہ طرح میں نہ تھیں۔

آج کے بعد ۱۲ دن روز نوروز میں باقی ہیں دیکھنا ہے کہ میرے عندلیب طبع کو کس نوا کے ساتھ آمادۂ زمزمہ سنجی کیا جائے گا تمہارے خط میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو دل کو برانگیختہ کر سکے۔ یہ غلط ہے کہ جینٹ دہلی آ رہا ہے وہ گوالیار سے براہِ راست اجمیر پہنچے گا اور وہیں آرام فرما ہوگا دو غزلیں اس سے پہلے کی بعد ازاں ایک اور یہ غزل تمہیں کون منع کرتا ہے کہ راجہ کے سامنے نہ پڑھنا۔ پڑھیں نہ پڑھیں یہ کاغذ جو میں بھیج رہا ہوں اسے ان کی نظر گاہ میں ضرور پیش کر دیں۔

نہیں نہیں بھائی میرے یہ رائے مناسب نہیں میں راول کی میاں جی گری کا روشناس ہو گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری کوئی چیز ان کے توسط کے بغیر راج دربار میں پیش ہو اگر اپنی طرف سے راجہ کو یہ چیزیں پیش نہ کرو تو بہت اچھا ہے اس لیے کہ سننے والا سخن ور نہیں ہے سخن رس نہیں ہے سخنداں نہیں ہے کہ اس کی طبیعت میں جوش مسرت سے بالیدگی پیدا ہو اور اس طرح وہ تمہارا سپاس گزار ہو اور ادمغان شعر کو اپنی نظر میں بڑا درجہ دے۔ میرے بھی دل میں کچھ وقت کے لیے یہ جذبہ پیدا ہوا تھا مگر وہ بہت جلد ٹھنڈا پڑ گیا۔

ع خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

غزلوں کو اپنے پاس رکھو اور اپنے گوش ہوش کے ساتھ راز کے لیے آمادہ رہو اور جو کچھ سنو اور دیکھو وہ مجھے لکھو۔ جون لارنس جو دہلی کا کلکٹر اور مجسٹریٹ ہے وہ اس ہنیری لارنس کا چھوٹا بھائی ہے میں اس کے بارہ میں کس سے پوچھوں اور کیا پوچھوں ایک زمانہ جانتا ہے میں بھی جانتا ہوں۔

ع بیا برادر ہمہ را بگذار و از ہمہ بگذر

ارے میاں چھوڑو ان سب باتوں کو اور سب سے گزر جاؤ۔

ایضاً

[۱۰۵]

نورِ چشم جہاں بین بن کر میں دنیا کو تمہارے چہرے کے آئینہ میں دیکھتا ہوں میری جانب سے تحسین و آفرین سنکر تمہیں خوش ہو جانا چاہیے۔ فردِ انتظار کا اس سے پہلے پہنچ جانا کہ انتظارِ طبیعت کے لیے وجہ گرانی بن جائے، اچھا لگا جی خوش ہوا، تم نے دیدۂ دیدار طلب کا خیال رکھا اور حقِ آرزم کو فراموش نہ کیا۔

سواد نامہ کی صورت میں تم نے جو شرمہ بطور ارمغاں بھیجا ہے شہر جے پور کی خوبی اور والی شہر کے شیوۂ محبوبی کو نگاہ کے سامنے رکھ دیا اور دل مجھ کو اس طرح بے چین ہوا کہ اگر میں بیخودانہ اس شہر کی طرف بھاگ نہ نکلا تو اس پر میں خود کو سرزنش بھی کر سکتا ہوں۔

ایسا کوئی گوہر گراں مایہ معدنِ آفرینش میں روز روز پیدا نہیں ہوتا، مہر جہانتاب کو اس میں صدیوں گام زنی درہ نوردی کرنی پڑتی ہے تب کہیں اس آب و رنگ کا کوئی پیکر پذیر ہوتا ہے۔ جب دو ہزار سال راجہ بکرماجیت کی فرماں روائی پر گزر گئے تب مہاراجہ رام سنگھ کو پیدا کیا تاکہ اہل دنیا نے جو کچھ کانوں سے سنا ہے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور انھیں معلوم ہو جائے کہ آسمانوں کی گردش اور ستاروں کی سیر بیکار نہیں ہے۔ خدا کہ اپنے بندوں کے حق میں انصاف کرنے والا ہے اس فرماں روائے حق شناس کو جو نیک خو و نیک رو ہے دیر تک سلامت رکھے اور دولت جاوداں بخشے۔

میرا احمد حسین اور مرزا قربان علی نے تمہارا خط پڑھا اور سات سو من نبات دونوں کے منہ میں گھل گئی۔ بادۂ ناب کی بات نہ تھی ورنہ میرا دل بھی کب قابو میں رہتا، میں نے فوراً ہی تمہاری بات مان لی ہے۔ سات شعر جو پرسوں خاقان سپہر آستاں کی نظرگاہ میں پیش کیے انھیں حاشیہ پر لکھتا ہوں۔

والسلام

بنام منشی نبی بخش صاحب

[۱۰۶]

(سررشتہ دار فوج داری کول ضلع علی گڑھ)

فرد
گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

(غالب ناکام پر کیا گزری یہ ناگفتنی ہے ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بندۂ نامراد کا کوئی خداوند نہ تھا۔)

اندیشہ گواہ ہے اور مشاہدہ شاہد کہ تراشنے یا آراستگی اور صاف کرنے کا مقصد تو صرف چمکانا ہے یعنی تابدار کرنا۔ حضور والا جب آراستہ کرتے ہیں تو پیراستہ کرنے کا عمل بھی اسی کا حصہ ہوتا ہے۔ شراب کو پیمانوں میں بھرا جاتا ہے تو اس سے پہلے اُسے بادۂ ناب بنا دیا جاتا ہے اور نَے کے ایک پورے کو جب تک تراشا نہیں جاتا اُس کا ایک حصہ الگ نہیں کر دیا جاتا اس سے قلم نہیں بنتا۔ اسی طرح کاغذ کو جب تک قرطاس پاروں میں تقسیم نہیں ہو جاتا اس وقت تک اُسے خط یا نامہ تو نہیں کہا جا سکتا۔

سچ یہ ہے کہ اس "کارگاہ کون و فساد" میں کوئی کوئی "کون" "بے" "فساد" نہیں اور کوئی فساد بے کون نہیں۔ مجھے مٹی سے پیدا کیا گیا اور اس مشتِ خاک کو آسمان پر پہنچایا گیا۔ اب اُسے کچھ وقت تک تو اسی حالت میں رکھا گیا پھر زمین پر ٹپک دیا یہاں تک کہ میرے پیکر خاکی نے ایک "نقش" کی صورت اختیار کر لی اب اُسے کسی "کزلک" کے ذریعہ صفحۂ خاک سے چھیل کر الگ تو نہیں کیا جا سکتا

ناگاہ مجھے اس "کارگاہ کون و فساد" سے اٹھا لیا گیا اور میری جگہ ایسے کمزور وجود کو لا بٹھایا، جو مرنے جینے ہنسنے اور رونے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ یارب یہ پیکر جسے نقش غالب بنا دیا گیا یا یہ نقش جسے خاک پر بٹھا دیا گیا یہ کیا تماشا ہے اب جلد ہی ایسا [illegible] خاک نشینی پھر اُسے خاک ہی کے سپرد کیا جائے گا۔

اس زمانہ میں کہ میں ستم پیشۂ روزگار کے کہنے سے آزاد اور بند غم میں گرفتار ہوں

سخنورِ جادو بیان، از خود رفتۂ منشی ہر گوپال داس تفتہ کا میرے یہاں گزر ہوا معلوم ہوا کہ وہ میرے حال پر مہربانیاں کرنے والے اپنے وطن مالوف گئے ہوئے تھے اب واپس ہوئے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ وہاں پہنچ کر میرے ان مہربان عطوفت نشان نے مجھے خطے یاد نہیں کیا گویا مرزا تفتہ کے ساتھ میری ہم نشینی و ہم زبانی کو خود اپنے ساتھ میری ہم زبانی و ہم نشینی قرار دیا اور سچ یہ ہے کہ ایسا ہی کچھ ہے بھی۔

کل تیموری شہزادوں میں سے ایک نے اپنے یہاں بزمِ سخن آراستہ کی۔ اور اہلِ سخن کو دعوتِ غزل خوانی دی ــــ مجھے کہ ریختہ گوئی سے کوئی واسطہ نہیں رہا اس باب میں بہت تردد تھا۔ سوچا کیا۔ لیکن اس دن جب اس بزم میں جانا تھا خاص طور پر اس وقت جب میں (ہوادار میں) سوار ہو کر راستہ طے کر رہا تھا چند شعر بے ارادہ اس غم زدہ و خوں شدہ دل سے ٹپک پڑے تمھیں وہ بھیج رہا ہوں اور چاہتا یہ ہوں کہ تم اس زمینِ سخن میں خود غزل کہہ کر مجھے بھیجو۔

اسد اللہ نگاشتہ ۱۶ ربیع الاول و ۲۲ فروری بوقت دوپہر۔

بنام مولوی رجب علی خاں بہادر

[۱۰۷]

ولی نعمت سلامت۔ نگاریں نامہ نے جسے ثریا و سہا سے مزین ایک مرقع کہنا چاہیے شرفِ نمود سے نوازا۔ سبحان اللہ اس کے سواد روشن کی کیا تعریف کی جائے جیسے پرتو ماہ اور شعاعِ مہر کو آپس میں ملا دیا گیا ہو میں نے اس کی آمد پر یہ محسوس کیا جیسے مجھ پر آیۂ نور نازل ہوئی ہو لا جرم میرا سر سودا زدہ سجدۂ شکر بجا لایا۔

یہ نورانی ردا جس سے دل و نظر کی تیرگی دور ہوتی ہے گویا خود آل عبا کا پرتو ہے۔

میرے ہر بن مو سے دجلہ دجلہ عرقِ ندامت ٹپکتا ہے اور ناخنِ اندیشہ میرے مغزِ جاں میں خراش پیدا کرتا ہے (اللہ اللہ) ادھر سے ایک دو ورق بطورِ ارمغاں پہنچتا ہے تو ادھر سے ایک نور آگیں ردا بطور تحفہ روانہ فرمائی جاتی ہے۔

نہ صرف یہ کہ یہ تمام عنایتیں نشانِ مہر و عطوفت ہیں بلکہ یہ صورت ظاہر کرتی ہے کہ اس میں کوئی اور بھید بھی چھپا ہوا ہے کہ مجھے بزرگوں کی بندگی میں شرفِ قبول بخشا گیا ہے۔ اس کے لیے میں آج بھی آپ کا شکر گزار ہوں اور روزِ فردا کے واسطے مبارک انجام کی توقع رکھتا ہوں۔

ترک و تاجیک کا احسان لینا باعثِ ننگ ہے تو میں اپنے خداوند کی اولاد کا احسان کیوں نہ لوں (کہ وہ آقا بھی ہیں بندہ پرور بھی — دنیا و دین کے سلطان بھی اور بخشندۂ زر و گوہر بھی)؟ انھیں کی طرف رُخ کیوں نہ کروں؟ آخر ہر مشکل کی گرہ کشائی اور کار برآری کی توقع اپنے ولی نعمت کے ماسوا کس سے کی جائے خاص طور پر وہ خداوند زادہ کہ دوسروں پر لطف و کرم اس کا شیوہ اور بخشایش اس کا مقصدِ زندگی ہے

اگر وہ مجھے زرِ خطیر عطا کرنے میں دریغ نہ فرمائے تو مجھے اس کی ثنا و ستایش میں تکلف کیوں ہو، سپاس گزاری اگر مبنی بر حقیقت ہو تو اس میں آخر قباحت کیا ہے۔ بہر حال کہنے والے کے واسطے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں

والسلام مع الاکرام

بنام آغا بزرگ شیرازی وفا

[۱۰۸]

رباعی

صبح شد خیز کہ رودادِ بتر بنمایم
چہرہ آغشتہ بہ خونِ نابِ جگر بنمایم
پنبہ یکسو فہم از داغ کہ رخشد چوں روز
آخرے نیست شبم را کہ سحر بنمایم

(صبح ہو گئی اب اٹھ کہ روداد ابتر پیش کروں اور تجھے اپنا وہ چہرہ دکھاؤں کہ جگر خون ہونے کے باعث لہو بھرا ہے۔ میں اپنے داغ دل سے روئی کا پھاہا ہٹا دوں کہ روز روشن کی طرح چمکتا ہے۔ جب میری رات کی کوئی انتہا نہیں تو میں جلوۂ

سحر کیسے دکھادوں۔)

آج صبح کے وقت کہ دن کی روشنیوں کا ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے، مخدوم کی نظرگاہِ التفات میری چشم تصور میں ہے اور میں زمین خدمت کو بوسہ دے رہا ہوں۔ اگر آپ یہ خیال فرمائیں کہ مجھ آشفتہ سر نے آئین آداب گزاری کو فراموش کر دیا اور نامہ نگاری میں شوخ چشمی اختیار کی تو بڑی حیرت کی بات ہوگی۔ تاہم اس صورت کو آبروئے وفا بھی کہاں پسند کرتی ہے اور خوئے آرزم کو اس سے کیا واسطہ کہ آپ ایسا کوئی خواجۂ عالی مقام کہ بزرگی و کوچک دلی جس کی صفات عالیہ میں سے ہوں کوئی ایسی بات سوچے یہ خیال کیوں نہ کرے کہ فراوانیٔ آرزو نے اسے اس پر آمادہ کیا کہ عالی طبع مرزا خاور کی گرمجوشی، یہ تحریر سپرد قلم کرے اور دل وزبان کے درمیانی فاصلہ کی راہ حدیث شوق سے گل وگلزار ہو جائے اگر ان سب کو دل سے نے کر زبان کے سپرد کر دیا جاتا تب بھی میرے لیے یہ سعیٔ گزارش شوق ممکن نہ ہوتی اور قوتِ گویائی ان تمام گُہر ہائے راز کی کوششِ شمار میں ناکام ہوتی۔

اور اب بھی بات وہی ہے کہ پہلے ان راز ہائے دل کو زبان کے سپرد کیا جائے پھر دامانِ زبان سے اٹھا کر خامۂ دوزبان کے منہ میں ڈال جائے اور پھر وہ نوک قلم سے صفحۂ قرطاس پر لائے جائیں، میں اس سہ گونہ ستم کی تاب کہاں لا سکوں گا۔ بہتر یہ ہے کہ میری آنکھیں دیدارِ فیض آثار سے بہرہ یاب ہوں اور میرا دل ہم زبانی کی مسرت آفرینیوں سے رقص کرنے لگے۔

اس زمانہ میں کہ شہر میرٹھ آپ کی آرام گاہ ہے، اگر راستہ کے فاصلوں کو کم کرتے ہوئے ہم خاک نشینوں کے خس پوش غربت کدہ کی طرف بھی رغبت فرمائیں اور ہم اپنے تنگ نائے اندوہ کے درماندگانِ بے شکوہ کی طرف بھی پرسشِ احوال کی غرض سے توجہ دیں، تو آپ کی عنایت فرمائیوں سے بعید نہیں ہو سکتا۔ یارب میری آرزو لوا پذیر ہو۔

ایک عمر ہو گئی کہ قلم کی نے غالب ہرزہ سرا وبے نوا کے بیان میں شاخ گل کی طرح

رقص میں ہے۔ نہیں نہیں میں نے غلط کہا کہ شاخِ بید کی طرح لرزاں ہی ہے۔ اگرچہ میں نہیں جانتا کہ یہ لاابالی خرام کس راہ میں گام فرسائی کر رہا ہے لیکن اپنی رفتار کے بے پروایانہ انداز سے اپنے شیوۂ دلبری کا اظہار ضرور کرتا ہے۔

مجھے اس پر فخر ہے کہ "نے قلم" کا تارِ جاں سے اس قدر گراں رشتہ ہونے کے باوجود، میری رگِ گردن پر فریب خوردگی کا کوئی احسان نہیں اور مجھے اپنی ذات پر فرزانگی کا گمان نہیں۔ لیکن مجھ ایسے کسی شخص کے واسطے کیا دانش مندی کا یہی وصف کافی نہیں کہ میں خود کو نادان سمجھتا ہوں؟ اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کون مایۂ نازش ہو سکتا ہے کہ میرا نام اہلِ ہوش و خرد کی زبان پر آتا ہے اور وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص اہلِ شعر و سخن میں سے ہے۔

خلیجم ولے نورِ چشمِ محیطم — غریبم ولے روشناسِ جہانم
بہ معیارِ دعویٰ خداوندِ رخشم — در اقلیمِ معنیٰ جہاں پہلوانم
گرفتم کہ از تخمِ افراسیابم — گرفتم کہ از نسلِ سلجوقیانم
دل و دستِ تیغ آزمائے ندارم — رہ و رسمِ کشورکشائی ندانم
چہل سال توقیعِ معنیٰ نبشتم — سزد گر نویسندہ صاحب قرانم

(دیکھنے میں اگرچہ میں ایک خلیج ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ سمندر کا نورِ چشم ہوں، میں اجنبی ہوں اس پر بھی روشناسِ عالم ہوں۔ دعوے کی کسوٹی پر میں خداوندِ رخش ہوں یعنی شہسوار اور اقلیمِ سخن کا رستمِ دستاں ہوں۔ میں نے مانا کہ میں اولادِ افراسیاب سے ہوں اور سلجوقیوں کی نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں تیغ آزمائی کی تاب و تواں اب اپنے دست و دل میں نہیں دیکھتا اور کشورکشائی کی رسم و راہ سے اب میرا کوئی رشتہ باقی نہیں۔ چالیس سال میں نے نگارشِ معنی کی خدمت انجام دی ہے، مجھے صاحب قراں لکھا جائے تو میں اس کے ہر طرح لائق ہوں۔)

عطیۂ قبول اور نویدِ وصول کی چشم داشت پر تین غزلیں بطور ارمغاں روانہ

کررہا ہوں۔ چونکہ جناب والا کی آرامش گاہ معین نہیں ہے، اس لیے یہ عریضہ مرزا خاور کے سپرد کیا جارہا ہے۔ والسلام

بنام مومن خاں صاحب

[۱۰۹]

فروغ طالع گفتار سلامت۔ اندیشہ نے کہ اُسے دیوانگی پیشہ کہنا چاہیے روشنان فلک کے واسطے ایک ایسی سرزنش شروع کی جو پرخاش کی بدانجامی کی طرف لے جاتی ہے اور جس نے اس رباعی کے چوتھے مصرع کی تیغ دودم کو ان سات فروزندہ پیکروں کے مابین لاکر رکھ دیا۔

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقی دہر
ریزد ہمہ دُردِ درد تلخابۂ زہر
یکروزہ سعادت و نحوست کہ مرا
ناہید بغمزہ کُشت و مریخ بہ قہر

اس کے باوجود کہ ہنوز میرے لب اس تلخی سے زہر فشاں ہیں دل انتہائے سادگی کے باعث اس تشویش میں پڑا ہے کہ اگر اس سال کی نگارشِ تقویم گراں خاطری کا باعث ہو تو میں بھی اسے دیکھوں، تاکہ خسروِ انجم کے شکوہ کی روز افزونی پر "چشم ما روشن" کہہ سکوں۔

میں بھی کس قدر ناداں و ہوس پیشہ ہوں کہ شرف خورشید پر شادمانی کا اظہار کررہا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ میرا آشنائے نوروزی سے کوئی خوش آیند توقع اور فرخی و فیروزی کی چشم داشت رکھنا اس کنیزک کی طرح ہے کہ جب عید کا چاند ہوگیا زمانہ کو ایک نشاطِ تازہ میسر آئی اور عید کی مسرتوں کے نغمے لبوں کو چھونے لگے تو وہ بھی خوش خوش نظر آئی، خاتونِ خانہ نے اس سے کہا کہ تیرے لیے عید آئے یا رمضان، تجھے اس سے کیا، تیرے حصہ میں تو وہی ادھ جلی روٹی آئیگی۔

سخن کوتاہ میں یہ خط بھیج رہا ہوں اور یہ دعا کررہا ہوں کہ خدایا نامہ بر اس دروازہ

سے خالی ہاتھ واپس نہ لوٹے ایسی صورت میں دمِ سرد اور ذوقِ غم واندوہ کے ماسوا جو میرے عکسِ مدّعا کے طور پر میرے سامنے آئے گا اور پاسِ ادب کے باوصف آستانِ دوست کو سپہر ستم کا درجہ دینا ہوگا۔ والسلام

بنام منشی فضل اللہ خاں

[۱۱۰]

ازجانب حکیم احسن اللہ خاں

فرد۔ شادم کہ گردشے بسز اگر در روزگار

بے بادہ، کام عیش روا گر در روزگار

(میں خوش ہوں کہ زمانہ کی گردش مرے کام دل کے موافق ہے اور بے بادہ و جام میرے لیے وقت نے سامان عیش مہیا کر دیا۔)

اس خجستہ دور اور مبارک زمانہ میں کہ ساقیٔ دہر اپنی تردستی کے واسطے انگشت نمائے خلق ہے اور اہل بزم کی آرزوئیں سرمستیوں سے روشناس، برادر والا گہر ہمایوں نظر کے گرامی نامے کی نسیم ورود نے۔ چمن زارِ محبت میں سبزہ کے رُخِ سادہ کو نمو اور گلِ نو شگفتہ کو تازہ رونق بخشی۔

سچ یہ ہے کہ یہ زُلالِ مشکبو جوارمغاں کے طور پر بھیجا گیا ہے اور اس کا نام عرقِ کیوڑہ رکھا ہے۔ یہ وہ آبِ معطّر ہے کہ جس کی خوشبو روح کو آسودگی اور جس کی جرعہ کشی خرد کو افزونی بخشنے والی ہے۔ یہ وہ آبِ نشاط انگیز نہیں ہے کہ جس کی خوشبو سے مبارک فرشتے روگرداں ہوں اور جس کو پینے سے تردامنی لازم آئے۔ یہ وہ رواں پرور عرق ہے جو گل خوشبو سے آگ پر کشید کیا گیا ہے یا پھر یہ کہا جائے کہ یہ وہ موجِ آب ہے کہ شعلۂ آتش سے جوش فزا ہوئی ہے۔

سبحان اللہ یہ وہ عرقِ مشکناب ہے کہ بالفرض اگر موج زن ہو تو خضر بھی اس کے مشاہدہ سے تردہن ہو جائے میں اسے عرق کہہ رہا ہوں اس کہنے سے کبھی شرمندہ ہوں اور یہی وہ عرقِ خجالت ہے، جو میری بیاضِ پیشانی سے ٹپک

رہا ہے عرق کیا ہے کہیے اجزائے گل کی تراوش ہے جس کی فرعِ اصل شادمانی ہے جب تک وہ پھول تھا تو برگِ گل سے اس کو شہپر ملے ہوئے تھے اور ہوائے پروازِ گویا اس کے سر میں بھری ہوئی تھی۔

آب و آتش کو اس پیکرِ ناز پر مقرر کیا اور اس کے بالِ رنگیں کو آگ کے شعلہ پر پگھلایا اور زنجیرِ آب میں اُسے قید کر دیا اگر شرابِ ہوش ربا نہ ہوتی اور عرقِ گلاب تلخ نہ ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ یہ وہ بادۂ ناب ہے جسے گلاب کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور اگر زیبا طلعتوں کے رخِ رنگین کا پسینہ درخورِ جرعہ نوشی ہوتا تو میں یہ خیال کرتا کہ یہ عرق ہے جو رخسارِ حور اور عارضِ پری سے ٹپکا ہے۔

وہ مے سرجوش کہ جمشید کے "جامِ جہاں نما" میں موج زن تھی اور وہ یاقوتِ سیال کہ پرویز کے پیمانۂ بلور میں جھلکتا تھا، چاہے کیسا ہی کیف آور اور خرد ربا ہو اس عرق سے زیادہ انبساط آفریں نہ ہوگا۔

بایں ہمہ اس عرقِ لطیف سے اگرچہ تشنہ لبی قدرے راحت پاتی ہے لیکن جگر کی آگ ذرا بھی نہیں بجھتی نتیجہ یہ کہ رگِ اندیشہ کی گرمی اور "دلِ مہر پیشہ" کی بیتابی اسی طرح باقی رہتی ہے۔

اس ارمغان کی سپاس گزاری کے بعد اس خط میں میں اپنے برادرِ مشفق و محبِ شفیق دیوان امین اللہ خاں کے والا نامہ کے بارہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں (خدا انھیں لمبی عمر دے اور ان کی جاہ مندی میں ترقی عطا فرمائے) میں اس قلم کے رشحات پر ناز کرتا ہوں، اس کے باوصف کہ اس میں نمک کم تھا میری تشنگی کو بڑھا دیا اور میرے لبوں کو کہ وہ ہمیشہ جوشِ سخن [جاری] اور نغمۂ نوا سے خالی رہتے ہیں شوروں سے بھر دیا۔

ہر آدمی اس بات کو جانتا ہے کہ اُسے اپنے رازِ دل کو اپنے دشمن سے چھپانا چاہیے لیکن مجھ پر ہزار افسوس ہے کہ میں اپنا دکھ درد اپنے دوست سے بھی پوشیدہ رکھنے پر مجبور ہوں۔ جب دوست بار بار کہتے ہیں کہ میں ان سے کہتا کیوں نہیں، کیا بغیر کہے وہ نہیں جانتے کہ دن تیزی سے گزر رہے ہیں اور زمانہ خطرات سے بھر گیا ہے نازک معاملات: میرا گریہ

تاخیر کو روا نہ رکھو۔

اب کہ بات یہاں تک آگئی اپنے دردمندانہ ابیات میں سے ایک بیت پیش کر رہا ہوں سلسلۂ سخن دراز ہوتا چلا گیا اس پر معذرت چاہتا ہوں۔

بیت

برِ دلِ نازکِ دلدار گرانی مکناد
خواہشِ ما کہ جگر گوشۂ ابرامی ہست

(خدا نہ کرے کہ محبوب کی خاطر نازک پر ہماری یہ خواہش گراں گزرے "ابرام" جس کی فطرت کا شاخسانہ ہے) حضرت والدہ صاحبہ دعا فرما رہی ہیں اور قبول دعا کی شادمانی بھی دعا کے ساتھ مانگ رہی ہیں۔

بنام میر احمد حسین میکش

[۱۱۱]

خرد مندِ ستودہ صفات میر احمد حسین میکش جواہر آئینہ، رازِ نہاں کے راز داں ہیں اور اس سے پیشتر کہ میں یہ کہوں کہ یہ بات ان پر مخفی نہ رہے وہ پہلے ہی مخفی نہیں رہتی۔ (اس معنی میں) آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ دل جو دردِ مجبوری میں تڑپتا ہے اور خون ہوا جاتا ہے کیوں؟ یاد کیجئے کہ ہم نے آپ کے پٹودی جانے کو کبھی روا نہیں جانا اور یقین فرمائیے کہ وہاں آپ کے قیام کو ہم کبھی روا نہ رکھیں گے۔

آخر اس شہر میں بھی تو آپ کو گوشہ و توشہ میسّر تھا عدالت دیوانی کی وکالت کا مشغلہ کیوں ترک کر دیا اس مبارک زمانے میں امیر سلطان شکوہ نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خاں بہادر حشمت جنگ، کہ مسند نشین ریاست فرخ آباد میں اس فروغِ خاطر کے باعث کہ نواب ہمایوں القاب کی ذات والا صفات کا حصہ ہے میرے قلم کی گوہر افشانیوں کو دیکھا اور میری طرف توجہ فرما ہو کر یہ چاہا کہ میں فرخ آباد کا رُخ کروں۔

اگرچہ نامُرادی و گوشہ نشینی میرا دستورِ زندگی بن گیا ہے لیکن اس محبت کو دیکھتے ہوئے کہ یہ والا جاہ مجھ سے رکھتا ہے میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ میں اپنے پائے خوابیدہ کو حرکت میں لاؤں اور دہلی سے فرخ آباد کا سفر اختیار کروں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہاں پٹودی میں قیام کے ارادہ کو ترک کریں اور اسی ہفتہ یہاں آکر مجھ سے ملیں

فرد

ہلاکِ شیوۂ تمکیں، مخواہ مستانِ ما

عناں گسستہ تراز بادِ نو بہار بیا

[مستوں کو اپنے شیوۂ تمکیں سے قتل نہ کر آ، اور بادِ نو بہار سے زیادہ والہانہ انداز سے آ۔ توفیق رفیقِ کار آگہی ہو]

بنام منشی رحمت اللہ خاں

[۱۱۳]

سر آغاز نامہ ایزد فرزانہ کے نام سے کرتا ہوں جس نے دانش و بینش کو پیدا کیا اور فرزانگی و فرہنگ کو برگزیدگی بخشی۔ اس کے دبستانِ کمال میں، موبدانِ آتش قلم کوچہ و برزن کے نے سوازیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور جس کے جہان شکوہ وجلال کے عنقا کے واسطے سپہر بلند کے ستارے زمین پر بکھرے ہوئے کنگنی کے دانوں سے زیادہ اہم نہیں۔

کاسۂ سر میں ہوش اور حلقہ ہائے چشم میں نگاہ اس کی بہترین آفرینش ہے اور دانشِ سودمند اور بینشِ خرد افزا اس کی برگزیدہ عنایات میں سے ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر کی سپاس گزاری کے بعد میں صحیفہ طرازی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اپنے نامہ کو دوست کے مکتوبِ عالی کے جواب سے رونق بخشتا ہوں۔ میں اس وقت یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ ایسے ایک محب یگانہ و فرزانہ کی بزم اُنس میں میرا گزر ہوا ہے اور میں خواجۂ عالی مرتبت کا ہم نشین و ہم زبان ہوں اور زبانِ قلم سے، کہ میرے دلِ خستہ کی طرح دو نیم ہے اپنے درد و غم کی داستان بیان کر رہا ہوں۔

افسوس کہ دوست کی خواہش کی تکمیل نہ کی جا سکی اور جو خدمت کہ مجھے سونپی گئی تھی اس کی سرانجام دہی ممکن نہ ہوئی ۔ خواہش کی پذیرائی اور خدمت کی سرانجامی منحصر اس پر تھی کہ قلم صفحہ نوردی اور سخن کے گوہرِ شب چراغ کی روشنی میں اندھیروں میں راستہ تلاش کرے ۔

انصاف بالائے طاعت ہے کس حد تک پراگندہ سخن ریزوں کو یکجا و فراہم کیا جائے کہ فارسی زبان بالخصوص نثر میں واسوخت لکھا جا سکے ۔ پہلوی زبان کے زور آوروں میں میرے علم میں کوئی ایسا نہیں کہ جس نے ان روشوں میں اپنی تاب سخن کا مظاہرہ کیا ہو ۔

ملّا وحشی (یزدی) کہ خراسان کے سخن پیوندوں میں ہے اس نے ایک جریدہ نظم مسدس انداز میں لکھی ہے کہ لوگ اُسے "واسوخت" کہتے ہیں ہر چند میں اپنے حافظہ پر اعتماد نہیں کر سکتا پھر بھی ممکن ہے یہ بیت اسی مسدس کا ہو ۔

تو نہ آئی کہ غمِ عاشق زارت باشد
ور شود خاک برآں خاک گزارت باشد

(تو وہ ہے ہی نہیں کہ تجھے اپنے عاشقِ زار کا غم ہو اور وہ مر بھی جائے تو اس کی خاک پر بھی تیرا گزر ہو ۔ حسبتہ اللہ اگر دیدہ ور و دانا دل فراہم ہوں اور ملا کے واسوخت کو لکھنؤ کے اردو شعراء کے واسوخت کے مقابلے میں رکھ کر پڑھیں ، حاشا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ شور انگیزی و ذوق افزائی میں فارسی ، ہندی کے مقابلہ میں آ سکے ۔ پہلوی و پارسی کی شان اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ اسے اس درجے تک کھینچ لایا جائے ۔ طوطیانِ ہند کے کرشمے اور اس طائفے کے دلزادگان کی شورش کو سوائے اس طائفے کے کسی دوسری زبان کے لب و لہجے میں پیش نہیں کیا جا سکتا ۔ اور اس کی سخن طرازی گفتار پارسی کے اپنے رنگ و آہنگ میں صورت پذیر نہیں ہو سکتی ۔

دہلی اور لکھنؤ کے چند شعرا ریختہ گو نے طرحِ تازہ ڈالی ہے اور عورتوں کی اپنی

بولی ٹھولی میں ایک دل انگیز رنگِ تغزل کو رواج دیا ہے۔ اس صنف شعر کو "ریختی" کہتے ہیں۔ زبان دری میں "واسوخت" کہنا ایسا ہی ہے جیسے اس بختہ زبان میں ریختی کہنے کی سعی کرنا۔ واسوخت میں پیش کش کا جو انداز اختیار کیا جاتا ہے وہ فارسی میں بیان ہی نہیں ہو سکتا۔ اور نثر میں تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اور نظم میں اردو زبان جیسا لطف اس میں پیدا نہیں کیا جا سکتا خط اس عذر خواہی کے ساتھ انجام کو پہنچتا ہے کہ غالب بے برگ و نوا شرمسار ہے اور اس معذرت کی پذیرائی کا امیدوار ہے

والسلام بالوف احترام

بنام منشی فضل اللہ خاں برادر منشی امین اللہ خاں

[۱۱۳]

دیوانِ راجہ الور

فرد
تنگ است دلم حوصلۂ راز ندارد
آہ از نۓ تیر تو کہ آواز ندارد

(میرا دل آج بہت تنگ ہے اور اخفائے راز کا حوصلہ نہیں رکھتا یہ "نے تیر" اے خدا کی پناہ کہ نشانے پر آلگتا ہے اور اس سے آواز نہیں ہوتی۔)

ابر بہار اگر دستگاہ کی فراوانی و کشایش کے باعث صرف گوہر شاہوار پیدا کرے تو کشتِ دہقان کیسے سرسبز ہو اور خزاں رسیدہ غنچہ زاروں میں شادابی کیسے آئے۔ اس طرح پرتو مہر اپنی درخشانی و ضوفشانی کے ساتھ مغزِ خاک کے ماسوا اگر کسی اور شے کی طرف توجہ فرمانہ ہو تو خوشوں میں دانے اور شاخوں میں پھل کہاں سے آئیں۔ ہر آئینہ قلم کہ اپنی ظاہری ہیئت میں "تیر" سے مشابہ ہے اگر صفحۂ قرطاس پر سیاہی کے نقطوں کے سوا کچھ اور نہ لکھے تو اہلِ سخن کے صافی الضمیر کی نگارش کی توقع کس سے کی جائے۔

آزادوں کا عنوان نامہ سادہ ہونا چاہیے اور زیادہ بہتر ہے کہ صحیفۂ والا جس کو مہر و وفا کی صبح صادق سے تعبیر کیا جانا چاہیے اس آغاز نگارش دل دادوں کے عرض

مدعا یہ ہوتا کہ زوائد کے حذف و اخراج کے باعث (کہ نفی ماسوا اللہ سے مراد ہے) اثبات حقیقت کی آئینہ داری کر سکے۔ میرے دل کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ بجز راستی وہاں کسی حقیقت کا گزر نہیں اور سوائے حرف راست کے میری زبان پر کوئی بات نہیں آتی۔

اس گوشہ نشینی کے عالم میں کہ میری زبان کی طرح میرا دل بھی زنجیری و زندانی ہے میں نے سنا ہے کہ میری جانب سے ایک عرض داشت مہاراجہ سلطان نشان کی بارگاہ والا میں پیش ہوئی ہے اور درخواست گزار کی زبان پر شایستہ آئین کے ساتھ کچھ کلمات آئے ہیں۔

اگرچہ اس عرض داشت کو پیش کرنے والے یعنی مخدومی منشی امین اللہ خاں کا سپاس گزار ہوں اور اس ستایش پر جو فرمان مہر و محبت کے زیر اثر تھی میں آفرین کہتا ہوں لیکن میں اس پر حیران ہوں کہ جو عرض داشت میں نے لکھی ہی نہیں وہ میرے مخدوم و مکرم تک کس نے پہنچائی اور میرے کہے بغیر اس انجمن تک وہ بات کیسے پہنچی۔

میں نے اپنے بارہ میں اس آفرین کو سن کر اپنے اوپر نفرین کہی اور اپنے جیب و دامن کو اپنے خونابۂ چشم سے رنگین کیا کہ افسوس میں نے اس نادیدہ دوست کی قدر نہ پہچانی اور اپنی آنکھوں کو اس کی کف پا سے روشناس نہ کیا۔ غالب بے نوا اپنے لیے عرض بندگی کا حوصلہ خود اپنے دوست سے مانگتا تاکہ اس عریضہ گزار کی غمخواریوں کی منت شناسی کے فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکتا جسے میں ابھی تک نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں۔

خدایا وہ فرشتہ کس طریقہ سے کہ میں اُسے جانتا بھی نہیں میرا عریضہ مجھ سے لے گیا اور میرا اسلوب نگارش وہ کہاں سے لایا کہ اس روشِ خاص کا بنانا تو فرشتوں کے بس کی بات بھی نہیں اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ بارے میں یہ چاہتا ہوں کہ حضرت والا اس عرض داشت کو دیکھیں اور شروع سے آخر تک

اس کے سراپا کی سیر کریں اور جب یہ دیکھ لیں کہ ایسا نہیں تو یہ بھی سمجھ لیں کہ وہ غالب اندوہ گیں کی تحریر نہیں ہے۔

بہر نوع اپنے برادر والا گہر سے پوچھیں کہ اس نوشتہ کو جو لکھا نہیں گیا اور اس فرستادہ تحریر کو جو بھیجی نہیں گئی آپ تک کس نے پہنچایا۔ صاحب من یہ حکایت ہے شکایت نہیں تکلّم ہے تظلّم نہیں نہ بھیجے ہوئے خط کا منشی امین اللہ کے پاس پہنچنا حیرت کی بات ہے اور یہ واقعہ سر سے ہوش اور دل سے تاب و تواں کو نابود کر دینے کے لیے کافی ہے خدارا مجھے اس بند غم سے نجات دلایئے اور اس راز کے انکشاف پر کمر ہمت باندھیے اس نامۂ حیرت ہنگامہ کو ملاحظہ کیجیے اور اپنے برادر خورد سے بھی پرسشِ سخن کیجیے اور جب اس ملفوف کو کھولیں تو خاتم کی مہر پر ضرور نظر ڈال لیں اور جب اس اندیشۂ تیز فہم اور اس زود یاب فکر کی جستجو اور پرسش کا سلسلہ ختم ہو جائے تو پھر کسی تاخیر کو راہ نہ دیں اور مجھے اپنے جواب نامہ سے نوازیں اور اس میں تمام صورت واقعہ کو بے کم و کاست پیش فرمادیں۔

والسلام

بنام مولوی حبیب اللہ منشی نواب مختار الملک

[۱۱۴]

نائبِ والیِ حیدر آباد

یزدان پاک کی بخشائشوں کے لیے شکر گزاری، فرخی بخت کے تئیں آفریں اور آرزو کے واسطے نیک فرجامی کی نوید۔ نامۂ اُمید افزا نظر فروز ہوا۔ جسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ خوش اقبالیوں کی فہرست ہے جو فراز سپہر بریں سے میرے لیے روئے زمین پر بھیجی گئی ہے یا پھر گوہریں خزانہ کا ایک مقالہ ہے کہ روز ازل میرے نام پر از راہ مہر و محبت جس پر مہر ثبت کی گئی تھی۔

ہر آئینہ میں اس روز فرخی افروز پر شادماں ہوں کہ رنگا رنگ خوش بختیاں میرے واسطے راہ میں ہیں اور مراد ان کے حصول و وصول کا ہنگام قریب۔ ہر چند یہ نامہ منشور عالی

نہیں ہے میں تو اپنے بختِ خوش کی اس فروغ مندی پر ناز کرتا ہوں کہ مجھ ایسے گوشہ نشین وخوش بیں کا نام اس دفتر میں لکھ لیا گیا۔

فرد
غالب بخود بیاں کہ گشتیم روشناس
در دفترِ وزیر نوشتند نام ما

یہ ایک تعجب پیدا کرنے والی روداد ہے کہ گفتنی ہے اور اس حد تک توجہ فرمائی کے لائق کہ اتنی دور سے بھی صریر خامہ نے گوش سماعت تک رسائی حاصل کی، موجب پذیر، گزشتہ ماہ میں کہ سال رواں کی فضائے عمرافزا میں ماہ اگست آگے آگے رواں تھا اور ماہ صفر پیچھے پیچھے چل رہا تھا منتخب دیوان ریختہ جس نے حال ہی میں قالب طباعت اختیار کیا ہے مومی جامے میں لپیٹ کر میں نے آصف سلیمان منزلت کی (نواب مختار الملک) نظرگاہ والا میں (کہ وہ روشنان فلک کی گزرگاہ ہے) بھیجا ہے۔

چونکہ صحیفۂ سامی کے ورود کا اتفاق پارسل کے روانہ کیے جانے کے بعد ہوا اس لیے مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ یہ نگارش خط پیش گاہ وزارت کے ایما پر ہے اور سفینۂ اشعار اردو کے پہنچنے کی بابت چونکہ اس میں کوئی تذکرہ نہیں اس سے یہ سمجھا جائے کہ مجموعہ فارسی کو طلب کیا گیا ہے یعنی اس سے کام نہ چلے گا فارسی کا دیوان بھیجا جائے۔

زہے تصور باطل زہے خیال محال

کہ وہاں سے ماہ نیم ماہ کی خواہش کی گئی۔ مگر ماہ نیم ماہ تو وہ اسم ہے جس کا کوئی مسمّٰی نہیں چونکہ سرنوشت سے روگردانی نہیں کی جاسکتی اس لیے اس سرگزشت کو دوبارہ بیان کرتا ہوں۔

یہ تو ستان میں جب آدھا حصہ مکمل ہوگیا تو اس کا نام "مہر نیم روز" رکھا گیا اب میں نے چاہا کہ ذرا دم لیلوں اس میں مزید کچھ تاخیر ہوگئی تو کارفرمائی جہاں داری کا دن بے نور ہوگیا اور زمانہ نے اپنا ورق الٹ دیا اور قراچار ترکمانوں کی دولت دیرینہ ان کا ساتھ چھوڑ گئی ماہ نیم ماہ اٹھائیسوی رات کے چاند کی طرح ناپید اور اس کا نام بعنوان بے نشانی

مہر نیم روز میں آشکارا۔

جس کا کوئی وجود ہی نہیں اُسے کیسے فراہم کروں۔ ہر آیئنہ چونکہ "پنج آہنگ"
و مہر نیم روز و دستنبو آپ کے پاس ہے اب میں جو میں بھیج سکتا ہوں وہ مجموعہ نظم فارسی
ہو سکتا ہے۔ میرا کلام میرے پاس کبھی نہیں رہا اور شہریوں کے پاس جو کچھ تھا وہ اس
فتنۂ آشوب قیامت میں برباد ہو گیا۔ اس آراستہ شہر کی تباہی اور آفات واد بار کی
اڑائی ہوئی اس گرد کے بیٹھ جانے کے بعد کہ ایک جاہ مند شخص نے جو میرے اعزا میں
ہوتے ہیں اس کی جمع آوری کا ارادہ کیا اور گلیم فقر کی طرح پارہ پارہ کرکے اس کو جمع کیا۔
تقریباً پچاس جزو بہم پہنچے اب میں اس فکر میں ہوں کہ طباعت کے ذریعہ اس کی شیرازہ بندی
ہو جائے کہ اس صورت میں اس کی دستیابی بہت سے آرزومندوں کے لیے ممکن الحصول ہو
اگر یہ نقش آرزو درست نہ ہوا تو پھر میں یہ چاہونگا کہ کوئی اچھا سا
لکھنے والا مل جائے اور وہ اسے لکھدے اور اس طرح اس کی فراہمی کا ایک راستہ
نکل آئے۔ اور کاتب کی اجرت طباعت کا خرچ تو ہے نہیں کہ وہ میں برداشت نہ کرسکوں
اور وہ میری دست رس سے باہر ہو۔ جناب والا کا وزیر ارسطو نظیر کی ملازمت آنے والے
اشخاص میں بہت نمایاں اور صاحب عظمت و نشان ہونا چاہیے۔ نامۂ نامی کی نگارش،
سراپا ارزش کی رو سے آپ نے یہ خواہش کی ہے کہ میں اسے نواب مختار الملک بہادر
کے دفتر کے پتہ سے روانہ کروں۔

اب میں آپ کی درویش نوازی سے یہ توقع کرتا ہوں کہ آپ عنایت بے نہایت
فرماتے ہوئے مجھ باخبری چاہنے والے کو یہ لکھ دیں گے۔ کہ دفتر وزارت سے خواجہ عالی
مقام کا تعلق کس سر رشتہ اور کس منصب و نشان۔ کے ساتھ ہے اور آپ کا گوہر ذات
کس معدن سے تعلق رکھتا ہے۔ تاکہ میں ان رسمی القاب و الفاظ سے آگاہ ہو جاؤں
جو از روئے بایست آپ کے نام کے ساتھ لکھے جاتے چاہئیں اور سر رشتہ اضافات
کو ذاتی تعلق کی وجہ سے پردۂ خفا میں نہ رکھوں۔

کلیات فارسی کی طلب جیسا کہ میرا خیال ہے نواب معلّی القاب کے ایما سے

یا پھر آپ کی جانب سے ہے کہ آپ نے یہ صحیفۂ عنایت بھی تحریر فرمایا ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں تعمیلِ ارشاد کی جائے گی کہ فرمان پزیری میری خوئے نیاز مندی کا دستور و آئین ہے

والسلام با لوفِ احترام
سہ شنبہ گیارہ ربیع الاوّل سنہ ۷ ۱۲ ہجری

بنام مظفر حسین خاں

[۱۱۵]

خدایا (یہ میں کیا سن رہا ہوں) کہ میرے مہربان فرخندہ نشان، فرّخ فرہنگ نے دیارِ کلکتہ کا سفر اختیار کیا جو بلا شبہ رشکِ ارضِ فرخار ہے اگر اُسے نہیں کہا جا سکتا تو وہ گلزارِ ارم تو ضرور ہے اور اس سے کچھ فزوں تر ہے کہ راہ سفر کی تکالیف اور نا سازی آب و ہوا کی زحمتوں کو اس فرحی و شادمانی کے برابر جگہ دی جائے۔

بعد ازاں کہ (آئینۂ گیتی نما، جامِ جہاں نما) میں دوبار وہاں تک رسائی کا نقشِ دلنشیں نگاہ دیدۂ پُر اشتیاق سے گزر چکا ہے۔ شفقی اعتماد الدولہ بہادر کی زبان دلربا بیان سے سنا کہ اس خط میں جو کلکتہ سے اس والا مقام کو لکھا گیا ہے مجھے بھی کہ دعا گویوں میں سے ہوں سلام سے یاد کیا ہے۔

یاد آوری کا یہ انداز کیا کہنا اے خدا کی پناہ اور دلربائی کا یہ ڈھنگ اے سبحان اللہ۔

اب کہ جناب والا کلکتہ پہنچ گئے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ دلنوازی و کار سازی کے لیے کوئی مستحکم بنیاد قایم ہو جائے اور کنعانِ معانی کے یوسفِ ثانی جن کا قلمِ اعجاز رقم گل افشانیاں کرتا ہے جن کا نفس خوشبوئیں بکھیرتا ہے اور جن کی زبان شیوہ بیان ہے یعنی مکرمی امیر حسن خاں بسمل میرے ساتھ صلح و آشتی پر آمادہ ہو جائیں خاطرِ عاطر کا زنگارِ آئینہ اب اتنا بھی گراں نشین نہیں ہے کہ اس کی صفائی کے لیے ہاتھ بڑھایا جائے اور وہ صاف نہ ہو اور باہمی تعلقات میں شگفتگی و شادابی نہ آئے۔

رگِ گردن کی تناوُ کاری تو انھیں نو آموزوں کو مبارک ہو کہ وہ اسی کے واسطے سے انگشت نمائی خلق وسیلہ کا اور اس زخمۂ نازِ شہرت کے سہارے اپنے سازِ سخن میں نوا

پیدا کر سکیں۔

میں کہ اس دیر کہن کا دیرینہ نغمہ پرداز ہوں اور میرے ساز سخن کا دائرہ کہ چرخ زبرجدی سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ اگر میں ذرا بھی مائل خروش ہوں تو چنگ کی طرح ضرب نوازی کا مستحق قرار پاؤں اگر میں فغاں بلب و فریاد کناں اس در دولت کے سامنے سے بھی گزروں تو دف کی طرح کف زنی کے لائق در تصور کیا جاؤں۔

"حاشا و کلا" میں فن سخن میں مقابلہ اور مجادلہ کو جائز خیال نہیں کرتا۔ وہ گفتگو جو ایک طرف سے بطور لاف و گزاف اور دوسری طرف سے بشکل تلافی و معذرت درمیان میں آئی میں نے اس کو پسند نہیں کیا اور کوئی بھی دانا و بینا اُسے پسند نہ کرے گا کہ نقد سخن کو کہ عالم قدس کی ایک متاع گراں مایہ ہے، سبکسرانہ انداز سے ہرزہ گوئی میں صرف کرے۔

اُس ناروا نگارش کے وقت یوں سمجھیے کہ قلم میری انگلیوں میں نہ تھا اور ان ناسزا گزارش کے لمحوں میں زبان ہرگز میری طبیعت کے تابع فرمان نہ تھی۔ منشی عاشق علی خاں کے ساتھ میری وفادارانہ روش کے یہ معنی تو ہرگز نہیں کہ امیر حسن خاں کو جان سے زیادہ عزیز نہ رکھوں اور خود ان کے حق گزاروں میں شمار نہ کروں۔

میں کیا کہوں کہ اس تند خو جواں مرد اور اس ناساز فطرت انسان کے سر میں یہ کیا سودا سمایا ہے اور کیا خیال اس کے دل میں آیا ہے کہ مجھ ایسے ایک غم زدہ اور گوشہ نشین شخص کے ساتھ اس طرح کے ناروا سلوک پر آمادہ ہو جائے۔

فرد

بداں معاملہ او بے دماغ و من بے دل
خوشا کہ معذرتے صرفِ ہر ستم گردد

(اس (خاص) معاملہ میں کہ وہ بے دماغ ہے اور میں بیدل ہوں اب اس سے زیادہ اور کیا بہتر ہوگا کہ ہر ستم کے ساتھ میں اس کی طرف سے ایک معذرت بھی خود ہی پیش کروں۔)

عذر تو اس طرف سے پیش ہونا چاہیے لیکن ہو یہ رہا ہے کہ معافی کی خواستگاری

اس طرف سے پیش کی جا رہی ہے تاکہ آزاد طبع لوگ اسے جان لیں کہ میرا دل حسرت منزل زخم کہنہ سے مجروح نہیں ہے اور میری طبیعت کا آئین دوستوں کے ساتھ بجز مہر و وفا کے اور کچھ نہیں۔

امید کہ میرے معاملے میں آزادگی و مروّت پیشگی سے دریغ نہیں فرمایا جائے گا اور جو کچھ ہوا اس سے صرف نظر، اور اپنی خصلت اور دوستوں کی خطا دونوں سے درگزر اختیار کیا جائے گا۔

والسلام بالوف احترام

ایضاً

[۱۱۶]

ایکہ گفتی کہ در سخن باشد — حاصلِ جنبش زباں گفتن
تا ندانی، کہ رازِ دل با دوست — جز بگفتن، نمی تواں گفتن،
خامہ را تیز در گزارشِ شوق — ہست دستے، بداستاں گفتن
گر قلم دو زبان ترانہ یکیست — ایں نوشتن شمار و واں گفتن
بقلم سازمی وہم گفتار — تا نہ گنجد دریں میاں گفتن
زانکہ دانم دریں خروش لبم — ریش گردد زنالہ ماں گفتن
مشکل افتادہ است دردِ فراق — با مظفر حسین خاں گفتن

اے کہ تو نے کہا کہ شعر و سخن میں جنبش زبان کا حاصل "کہنا" ہے تاکہ یہ نہ سوچا جائے کہ دل کا راز دوست کے سامنے اگر بیان کیا جا سکتا ہے تو صرف زبان سے ادا کرکے۔ زبانِ قلم بھی عرض شوق میں ایک خاص دستگاہ رکھتی ہے اور حرف مطلب کو داستان کے طور پر بیان کرنا اس کا خاص شیوہ ہے اگرچہ قلم "دو زبان" ہے لیکن اس کا ترانہ ایک ہی ہے ایک کو لکھنے میں شمار کرنا چاہیے اور دوسرے کی تعبیر کہنا ہے میں قلم کو ساز گفتار دیے دیتا ہوں تاکہ زبان و دہن سے کہنے کا واسطہ نہ رہے جاننا

ہوں کہ "اندماں" کہنے کے خروش سے میرے لب زخمی ہو جائیں گے۔ درد فراق کی کہانی مظفر حسین خاں کہنا مشکل ہو گیا ہے۔

ہر چند میں جانتا ہوں کہ ربط و تعلق کے حدود شناس یہ پسند نہیں کرتے کہ ربط کو اختلاط اور تعلق کو آشنائی بنا دیا جائے اور راہ بیگانگی کے ادا شناس، مہر و محبت کی "روان کشائی" کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتے لیکن میں کیا کروں کہ آئین مہر و وفا کو بدل دینا میرا شیوہ نہیں۔ ملک مایہ اور بد معاملہ لوگوں کی طرح میں دو دو جگہ اپنا دل گروی نہیں رکھتا۔

افسوس، وہ بات کہ عالم بے اختیاری میں میری زبان پر آ گئی اس کی وجہ سے مجھ پر اور میرے کاروبار آشنائی پر خوردہ گیری تو نہیں کرنا چاہیے۔ میرا دل بہت غم زدہ تھا کہ اعتقاد الدولہ نوروز علی خاں اے، یہ کیسے جدا کر لے گئے اور اپنے ایک دیرینہ دوست کے سپرد کر دیا۔ اب میں محبت کی اس عجوبہ کاری پر ناز کر رہا ہوں کہ شمع انجمن وصال روشن نہیں کی اور مجھے داغ فراق کی آذر فشانی کے حوالے کر دیا۔

اعتقاد الدولہ کے افسوں کی اس گیرائی پر تو جان دینے کو جی چاہتا ہے کہ بزم قربت میں رسائی نہ ہوئی اس پر بھی میں آپ کے ساتھ نوحہ سرائی میں ہم زبان ہوں۔ کاش میں ان کی فریب دینے والی باتیں نہ سنتا اور وہ غم نامہ کہ ان کے نام نامی اب کہ نشتر غم میری رگ جاں کے ساتھ سرگرم کاوش ہے اور چشمہ چشمہ خون دل، میری آنکھوں سے تراوش پا رہا ہے میں آہ و زاری سے کیسے بچوں اور دل کو کس حیلہ سے اس گرداب خوں سے باہر نکالوں۔

عالم جوانی میں جب میرے کالے بالوں سے زیادہ میرا چہرہ میرے اعمال کی وجہ سے سیاہ تھا اور پری رخوں سے محبت کا سودا میرے سر میں سمایا تھا زمانہ میرے ساغر کو بھی اس زہراب بلا سے پُر رکھتا تھا اور دوست کے جنازہ کی رہ گزار کے غم آشنا نظارہ نے میرے صبر و ثبات کو بھی غبار راہ کی طرح بکھیر دیا تھا۔

کتنے روز ہائے روشن مجھ پر ایسے بھی گزرے کہ میں اپنے محبوب کے غم میں سیہ

پوش اور پلاس نشین رہا۔ اور کتنی سیاہ راتیں ایسی بھی آئیں کہ میں اپنی خلوت غم میں پروانے کی طرح شعلہ درآغوش اور شمع خاموش کی طرح اشکبار تھا۔

وہ میری ہم خواب جسے رشک کی وجہ سے میں وقت وداع خدا کو بھی نہ سونپ سکتا تھا زمانے کا اب مجھ پر یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ میں اس کے تن نازنین کو خاک کے سپرد کردوں مری وہ محبوبہ دلنواز جسے نگاہ نرگس کی چشم زخم کے ڈر سے گل گشت چمن کی دعوت بھی نہیں دی جاسکتی تھی وقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کی نعش کو میں گورستان لے جاؤں۔

خاک خوں باد کہ در معرض آثار وجود
زلف و رخ در کشد و سنبل و گل باز دہد

اس خاک کا دل خون ہو جائے کہ جو آثار وجود کی عرض گاہ میں زلف ورخسار کو اپنے پردہ میں چھپالیتی ہے اور اس کے بدلے میں ہمیں تار سنبل و برگ گل واپس دیدیتی ہے۔

اس صیاد کو آسودگی سے کیا علاقہ جس کے حلقہ ہائے دام ٹوٹ گئے ہوں اور جس کا شکار اس کے شکستہ جال سے آزاد ہو گیا ہو اور اس گلچیں کو خوش خاطری سے کیا واسطہ جس کے ہاتھوں کے پھول مرجھا گئے ہوں اور پھولوں کی خاک نامرادی گر پڑی ہو۔ معشوق کا عاشق کی ہمدردی میں جاں دینا اگرچہ وہ ایک عمر کی جاں فشانی کے بعد ہو۔ پھر بھی جنھوں نے کبھی دل دیا ہے یہ بات ان سے چھپی نہیں کہ یہ بھی کتنی بڑی مہر پروری و مہربانی ہے۔ اس معشوق وفا شعار کی کیا بات کہ جس نے تلافی کا درجہ اندازہ بایست سے بڑھادیا اور اپنے عشوہ طناز سے جس کا دل لے لیا اسی کی محبت میں اپنی جان بھی دیدی اس کے باوجود کہ دوست کی موت کا غم جگر گداز ہے اور دائمی جدائی کا صدمہ جانکاہ

جب انصاف کی بات یہ ہے کہ راست پسند سچی بات سے رنجیدہ نہ ہوں میں چاہتا ہوں کہ اس جاں گدازی و جگر سوزی دیں، کہ ہر دو طرف سے روز افزوں ہے

میں آپ کا منت شناس ہوں اور وہ سلام آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں جو فروتنی میں بندگی سے فزوں تر ہے۔

بنام مولوی محمد صدرالدین خاں بہادر

[۱۱۷]

(صدر الصدور دہلی)

قبلہ حاجات۔ آج دوپہر دن گزرنے کے بعد کہ فریضہ ظہر کی ادائیگی کا وقت تھا میں در دولت پر سجدہ کرنے اور آستانہ قدسی کو بوسہ دینے کے لیے حاضر ہوا چونکہ دولت کدے کا دروازہ بند تھا میں نے چاہا کہ زنجیر در کھٹکھٹاؤں۔ مگر اس سے پہلے کہ زنجیر کو جنبش ہو آپ کے حلقہ بگوشوں میں سے ایک شخص دروازے پر آیا جو میرا خواجہ تاش اور سعادت اندوزی میں مجھ سے ہم قماش تھا اس نے کہا کہ دیوان عدل کی شمع روشن ہے اور جناب والا کا وجود مسعود سہیل یمن کی طرح وہاں نور افشاں ہے۔
ناچار از خود رفتہ ہوا اور کچھ دیر کے بعد جب میں اپنے غم کدے میں پہنچا تو اسی طرح خود کو آرزومند پایا۔ گویا وہ پرستار جو درِ دولت سے باہر آیا تھا میرے کام دل کا دشمن تھا اور میں خود بھی وہاں سے لوٹا تو اپنے بخت برگشتہ کی مثال بن گیا۔

ایضاً

(۱۱۸)

قبلہ حاجات

آپ کا یہ بندۂ ناچیز جو ستا کم ہے اور کہتا زیادہ ہے جو بہت جلد آمادۂ گستاخی ہو جاتا ہے اور اتنا ہی زود پشیمان ہے اب کیا اُسے حقِ بندگی بھی حاصل نہیں ؟ کہ اس بے بضاعت پر بخششوں کا دروازہ ہی بند کر دیا جائے۔

گوئی دماندار د اثر، ہم بر من گرائیے
زیں سادگی کر دل بہ اثر

جذبۂ عشق و وفا بے اثر ہے یہ جانتے ہوئے بھی مجھے نظر التفات سے محروم نہ کر مری اس سادگی پر ہی تجھے مہربان ہو جانا چاہیے کہ مجھے اپنی آہ بے اثر پر یقین ہے کہ وہ اثر کرے گی۔

آں مخدوم کی ان مہربانیوں کا شہرہ مجھ تک پہنچا جو مرزا اسد بیگ پر، اقبال نشان مرزا زین العابدین خاں عارف کی سفارش کی وجہ سے کی گئیں اور اسے سنانِ دورباش کے زخم سے بچا دیا گیا۔ اس خبر نے میرے زخم یاس پر یہ کیسے کہ نمک پاشی کی اور دامنِ آز کی ہوا نے مری آتشِ رشک کو بے طرح بھڑکا دیا۔

لیکن یہ جراحت ہنوز مرہم گزاری و چارہ سازی کے لائق ہے اور یہ آگ توجہ فرمائی کے ایک چھینٹے سے بھی ذرا سی دیر میں بجھائی جا سکتی ہے۔ سخن مختصر اس کارسازی میں آں مخدوم نے جس عنایتِ بے نہایت سے کام لیا اس کا باقی حصہ مرزا فاضل بیگ کے لیے صرف میں آنا چاہیے یہ صرف میرے حق میں چاہیے اسرافِ بے جا ہی کیوں نہ تصور فرمایا جائے اور میرے لیے پھر کچھ نہ بچے۔ عمر و دولت بے حساب۔

بنام منشی ہرگوپال (داس) تفتہ

[۲۴۹]

فرد
می سزد گر بخویشتن نازد
غالبؔ در خورش خاکسار تراست

(اُسے زیب دیتا ہے اگر وہ اپنے آپ پر ناز کرے یعنی غالبؔ کہ وہ افتاد طبع کے اعتبار سے بہت ہی انکسار پیشہ اور خاکسار منش ہے۔)

اس زمانے میں کہ میری عمر کے روز سیاہ کی رات ہو گئی ہے اور تم جانتے ہو کہ "روزِ سیاہ" تیرہ شبی میں کیسے بدلتا ہے میں تاریکی سے دل تنگ اور تنہائی کے باعث گویا خود سے معروفِ جنگ ہوں۔ میرے دل سودا زدہ کے ماسوا کہ جب وہ مجھے تنہا دیکھتا ہے تو میری بیکسی پر جل اٹھتا ہے میرے ظلمت کدے میں کوئی اور چراغ نہیں غیب سے کچھ "کشائش" ہوئی اور ایسے ایک شخص کو میرے پاس بھیجا گیا جو میری خستگی کے واسطے "مرہم چارہ گری" لے کر آیا اپنی ہمدمی سے مرے درد کا علاج کیا اور میری زندگی کی تاریک رات کو ہزار چراغوں سے روشن کر دیا۔

اس نے اپنے نطق کی شمع روشن کی اور اس شمعِ فروزاں کی روشنی میں مجھے اپنی گفتار کے موتیوں کی تابناکی اور اس صفائی کو دیکھنے کا موقع دیا جو میرے بختِ سیاہ کی تیرگی کے باعث خود میری نظر سے پوشیدہ تھی۔ اب میں نے اس کو آشکارا دیکھا ہاں! اے میرے دوست تفتہ! شیوا بیان و سخن گوے تو آئیں، تم سے اس فرد یگانہ ومردِ فرزانہ (منشی نبی بخش حقیر) کی طبیعت کی فرخی و فرزانگی اس کی دانش کی فرح مندی اور ذہن کی رسائی کے بارے میں کیا کہوں یہ سمجھو کہ میں شعر کہتا ہوں، فکرِ شعر کرتا ہوں، لیکن جب تک میں نے اس برگزیدہ شخص کو نہیں دیکھا یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ سخن فہمی کیا ہے اور سخن فہم کسے کہتے ہیں میں نے انسانوں میں دیکھا ہے کہ خداوند ہستی نے حسن کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ایک حصّہ یوسف کنعان کو دیا اور باقی نصف سارے اہلِ جہاں کو۔ کیا تعجب ہے کہ فہمِ سخن اور ذوقِ معنی کو بھی اسی طرح دو حصّوں میں بانٹ دیا ہو اس کا ایک حصّہ تو اس ستودہ صفات شخص کو بخشا گیا اور باقی دوسرا حصّہ دنیا جہاں کے لوگوں میں تقسیم ہوا۔

اب چاہے آسمان میرے کامِ دل کے مطابق گردش نہ کرے اور میری سوئی ہوئی قسمت اپنے خوابِ گراں سے کبھی سر نہ اٹھائے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ میں اس مخلص دوست کی ہمدمی کے ساتھ زمانہ کی دشمنی کے خیال کو خاطر میں نہیں لاؤنگا اور میں نے دنیا اور اہلِ دنیا میں سے اس دولت پر قناعت کر لی ہے۔

ان سے رات دن ملاقاتیں رہتی ہیں اور ایسی کوئی ملاقات نہیں ہوتی جس میں ہم دونوں مل کر تمہیں یاد نہ کرتے ہوں اور تم سے جدائی کا گلہ ایک دوسرے کی زبان پہ نہ آتا ہو کل کہ روزِ آدینہ تھا ماہ ربیع الاول کی پندرہ اور فروری کی نویں تاریخ تھی کہ تمہارا خط پہنچا۔ معلوم ہوا کہ تم ان دنوں پہلے اکبر آباد سے متھرا گئے اور پھر متھرا سے کول (علی گڑھ) پہنچے۔

دو ہزار بیت جن کے لیے تم نے خود لکھا ہے کہ اکبر آباد میں کہے گئے ہم لوگوں نے اخبار اکبر آباد کے اوراق میں ایک غزل دیکھی ہے۔ اچھی ہے تم نے وہی راہ اختیار

ئی ہے جس پر جی چاہتا تھا کہ تم چلو۔ منشی صاحب نے بھی یہ خط جو میرے نام ہے، پڑھا اور اس طرح وہ پیام ان کو مل گیا جو خاص ان کے لیے تھا۔

مجھ سے فرمایا کہ جب میں تمہارے خط کا جواب لکھوں تو وہ ورق ان کو سپرد کروں۔ وہ اسے اپنے خط کے ساتھ ملفوف کر کے روانہ کر دیں گے۔ میں نے ان کا حکم مانا اور ایسا ہی کیا۔ آج شنبہ کا دن ہے کل تمہارے مودّت نامہ کے ورود کا دن تھا۔ یہ خط میں نے اُن مخدوم کو سونپ دیا جلد پہنچ جائے تو ان کے شکر گزار ہوں دیر ہو جائے تو محکمۂ ڈاک کے گلہ مند۔ اب مجھ پر خفا ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ میں نے خط ان کے حوالے کر دیا ڈاک میں ڈالیں گے۔ عمر و دولت روز افزوں ہو۔

اسداللہ

۱۰ر فروری ۱۸۴۹ء مطابق ربیع الاوّل ۱۲۶۶ھ

بنام نواب ضیاء الدین احمد خاں

[۱۱۹]

جانِ برادر، غالبِ نامراد کے اشک و آہ یعنی اکبر آباد کی آب و ہوا تمہارے لیے سازگار ہو۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے سے دور ہیں، لیکن اندیشۂ فرزانگی پیشہ کو فکرِ سخن میں وہ انداز یک دلی و ہم نوائی بخشا گیا ہے کہ دوری اس کے قریب نہیں آتی۔

مانا کہ تم سفر میں ہو اور اپنے نزدیک مجھ سے بہت دور ہو گئے ہو لیکن چونکہ میرے وطن میں ہو اس لیے مجھ سے قریب تر ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے شوقِ دور اندیش نے دیدہ و دل کو اس سفر میں تمہارے ساتھ کر دیا ہے تاکہ اس غربت میں دیدارِ وطن کی شادمانیوں کی داد دے سکوں۔ زنہار اکبر آباد کو کم نگاہی سے نہ دیکھیں اور ان رہ گزاروں سے الاماں والحفیظ کہتے ہوئے گزریں کہ وہ ویرانہ آباد اور آباد چہ ویران مجھ ایسے مجنوں کی بازی گاہ بھی رہا ہے اور ہنوز اس بقعۂ زمین کی ہر کفِ خاک میں میرے خونِ آرزو کا چشمہ بہہ رہا ہے۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ اس گل زمین میں سوائے "مہر گیا" اور کوئی سبزہ نہ اگتا تھا اور شاخِ دل کے سوا کوئی اور شجر بار آور نہ ہوتا تھا۔ نسیمِ صبح گاہی اپنے خرامِ ناز اور روشِ مستانہ کے ساتھ اس گل زمین میں چلتی تھی تو والہانہ کیف و سرشاری کا دلوں پر وہ عالم ہوتا تھا کہ پارسا تسبیحِ نماز اور رندان قدح خوارجرعۂ صبوحی کو بھول جائیں۔

ہر چند اس گل زمین کے ہر ذرۂ خاک کے واسطے میرے تن کی طرف سے ایک پیام تھا دل نشیں پیام اور اس بقعۂ رنگ و بو کے ہر برگ کے لیے میری روح کی طرف سے ایک سلام تھا خاطر نشان سلام! لیکن تمہارے وقت کی تازگی کو نظر میں رکھتے ہوئے درود و سلام کو پردۂ پرسش بنایا تھا اور میں اس کے لیے چشم براہ تھا کہ آپ کب لکھتے ہیں اور افسوس کہ آپ نے کبھی نہیں لکھا کہ خشتِ سنگین نے میری دعا کو کس

انداز پزیرائی کے ساتھ قبول کیا اور "دریا" نے میرے سلام کے جواب میں اپنی لہروں کی زبان سے کیا کہا۔

اب میں آپ کے تمام ہمدموں بالخصوص میرزا زین العابدین خاں کو دُعا بھیج رہا ہوں اور میر کرم علی صاحب کو سلام ——— وہ سلام جس پر خیر اندیشی کی مہر لگی ہوئی ہے۔
والسلام

ایضاً
[۱۴۰]

فرد
غرقۂ بحریم از یار و دیارِ ما مپرس
لقمۂ کامِ نہنگیم از مزارِ ما مپرس

اب کہ ہم بحر طوفاں خیز میں ڈوب گئے اب ہمارے یار و دیار کے بارہ میں کیا معلوم کرتے ہو جو کام نہنگ کا لقمہ بن گیا ہو اس کے مزار کے بارے میں کیا پوچھتے پھرتے ہو۔

میرے اچھی عادتوں والے بھائی کو میری طرف سے آفرین اور اس ایزدی بخشایش کے لیے دعا کہ اُن کی قسمت اُن کی اچھی عادتوں کی طرح مبارک اور خوش آیند ہو۔
خط بھیجا اور جواب خط کے بارہ میں یاد پرسی کی یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ اچھی لگی۔ ویسے دونوں کو ایک دوسرے کے ہم سواد کہا جا سکتا ہے کہ یہ بے دردی ہے اور وہ مہربانی یہ دلبری ہے اور وہ جاں ستانی۔

ہر چند اس خواہش کی سازگاری دلبروں کے اندازِ گفتگو کی دل آسائی سے کم نہیں لیکن فسردگیٔ خیال کے باعث میرا معاملہ اب اس منزل سے گزر چکا ہے کہ میری تاب و تواں نازا ٹھانے میں وفا کرے۔

ضیائے چشمِ مردمی۔ اب میں کیا کہوں کہ پیشتر میرے قلم کو وہ روش خرام میسر تھی کہ اس کی طرزِ نگارش پر دوسروں سے پہلے خود لکھنے والے کا دل مچلنے لگتا تھا اور یہ اس وجہ سے تھا کہ سراپردۂ بزمِ راز کے مبارک فرشتے فراز گیتی سے نہاں خانۂ دل میں اترتے تھے۔ اور ان بوقلموں پر و بال والوں کی حسین پروازوں

وہ نقشہائے رنگ رنگ پیدا ہوتے تھے جو نشیمن خیال کے گرد قوس قزح کے سے خوش رنگ حلقے بنا دیتے تھے۔ کوئی پردہ
نظر گاہِ دل اور سیر گاہ اندیشہ کے مابین سوائے زبان کے نہیں اور یہ پردہ بہت ہی مہین ہے۔ جو کچھ اندرونِ خاطر رونما ہوتا ہے اس کا جلوہ پردۂ نظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے لیکن اب کہ طبیعت میں کشایش باقی نہیں رحسن بیان کہاں۔ اب وہ دل آویز نمایش کیسے آئے کہاں سے آئے۔

نہیں نہیں شباب ایک حسین رات تھی جسے ضمیر شبستاں کہنا چاہیئے اس پر خیال ایک رندِ شب زندہ دار اور گرمی نظم و نثر ایک خوب صورت ہنگامہ — اب کہ صبح پیری نمودار ہو رہی ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ انجمن کے شمع و چراغ افسردہ و نیم مردہ ہوئے جاتے ہیں اور شب زندہ داریوں کے حسین ہنگامے درہم برہم ہو چکے ہیں۔

فرد۔ نہ رقص پری پیکراں بر بساط
نہ غوغائے رامش گراں در رباط

(اب نہ محفل میں پری پیکروں کا رقص دلنواز ہے اور نہ رامش گروں کا ہنگامۂ جمیل جسے نغمہ و سرود کہنا چاہیے)۔

اس ناخوشی کے وقت میں جو باتیں زبان قلم پر آئیں وہ مرجھائے ہوئے پھولوں کو چن چن کر ان گلدستہ تیار کرنے کے مترادف ایک صورت ہے۔

وہ رنگ جو افروزشِ نگاہ کا باعث ہے وہ کہاں اور وہ جرعۂ انبساط جو راحت روح کا سبب ہو وہ کیسے میسر آئے اس بزم دل نشیں کے دوست اب کہاں۔

غیاث الدولہ نواب رضی الدین خاں سلام پہنچاتے ہیں میری طرف سے بھی اپنے ہمدموں خصوصًا خواجہ محمد علی کو مناسبات خلوص پہنچا دیجیے۔

بنام محمد علی خاں بہادر

[۱۲۱]

(عرف مرزا حیدر صاحب)

فرد
صبح سرمستانہ پیر خانقہ را در زدم
او سخن سر کرد از حق من دم از حیدر زدم

صبح میں نے سرمستانہ پیر خانقاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا اس نے "حق" کی بات کی اور میں نے نعرۂ حیدری سر کیا۔

حضرت نواب عالی جناب معلٰی القاب جو آزادوں کے قبلۂ حاجات ہیں اور زور افتادوں کے کعبۂ آمال، بید ستگاہوں کے باغِ امید کے واسطے وہ ابر بہار ہیں اور ہوا خواہوں کی کشتِ آرزو کے لیے ابرِ دریا بار۔

جناب والا نے سنا ہو گا کہ اس زمانہ میں شہر دہلی میں ایک آزادہ مزاج آشفتہ سر، نانا آشفتہ نوا، سخنور ہے جو اپنی آشفتہ نوائی کو رنگینی بخشنے کے لیے خونِ دل پیتا ہے اور رنگیں نوائی میں نہیں ۔ خونا بہ آشامی میں خود کو غالب کہتا ہے۔

فرد
غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

(میں غالب نام آور ہوں میرا نام و نشان مت پوچھو میں اسد اللہ بھی ہوں اور اسد اللّٰہی بھی۔)

اگر یہ کہا جائے کہ بزرگوں کے سامنے اپنی شناسائی کی بابت خود کوئی دعویداری گستاخی و آشفتہ سری ہے تو میں جواب دوں گا کہ میں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ اگرچہ یہ میری شناساگری ہے لیکن اسے آرزوئے خود نمائی نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ یہ تو ایک گونہ طلب عفو و معذرت ہے ایک زمانہ سے میں اس خاندان والا شان کے امرا کا روشناس ہوں اور داغِ بندگی کے "آئینِ نشان داری" کے ساتھ ان سے جان پہچان رکھتا ہوں۔

چونکہ روداد یہ ہے اس لیے ہر آئینہ طلبِ لطف و عنایت کی بات زبان پر آتی ہے کہ یہ بات سامنے آجائے کہ میرے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے' میں یہاں اپنی تھوڑی سی سرگزشت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ سالِ گزشتہ کے سرآغاز میں اس نیاز مند نے شاہ انجم سپاہ سپہر بارگاہ حضرت سلطان عالم کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور ایک عرض داشت نثر میں بھی تحریر کی تھی۔

اس قصیدے اور اس عرض داشت کو قطب الدولہ کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ قطب الدولہ نے شانِ مردمی سے کام لیتے ہوئے اسے سلطانِ دارا دربان کی نظرگاہ تک پہنچایا اور مولانا ضمیر جملہ نے حضرت گیہان خدیو کے فرمان کے بموجب اس نظم و نثر کو ایک ایسی ادائیگی کے ساتھ پڑھا کہ یہ خیال ہوا کہ گہر ہائے شاہوار نباطِ بزم شاہی پر بکھیر دیے گئے۔ بادشاہ کی طبع والا نے ان کو پسند کیا اور قطب الدولہ کو حکم فرمایا کہ کسی دوسرے وقت عرض داشت کو دوبارہ پیش کیا جائے تاکہ سائل کی امیدوں پر ہم احسان فرمائیں اور ان کے "جائزہ" کے واسطے حکم صادر کریں۔

اِس بنا پر کہ چشمِ بدگھات میں تھی اور قسمت نے کمان کھینچ لی تھی، ناگاہ وہ محفل درہم برہم ہو گئی اور قطب الدولہ کی جاہ مندی کا سورج ڈوب گیا اس غریب نے عرض داشت اور قصیدہ کو مجھے واپس کر دیا اور جو میں نے گویا اس تک پہنچایا تھا وہ اس نے دوبارہ مجھ تک پہنچا دیا۔

سردست بخت رسا کی رہنمائی اور اندیشۂ درست کی گرہ کشائی کا سہارا لے کر ان دونوں اوراق کو' کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم توردہونے کی وجہ سے، کفِ افسوس سے مشابہ نظر آتے ہیں' خدمتِ ہمایوں میں روانہ کر رہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ کارسازی آپ کا دستورِ حیات اور خستہ نوازی آپ کا شیوۂ زندگی ہے لاجرم آپ شیوۂ خستہ نوازی کو نظرانداز نہ فرمائیں گے اور آئینِ چارہ سازی کے سلسلے میں زحمت فرما ہوں گے۔

قسمت نے میری رہبری کی اور عقل نے دستگیری کر چارہ جوئی کے عوض میں، جناب والا کی طرف میں نے رُخ کیا میری خواہش یہ ہے کہ حضرت اس قصیدے اور عرض داشت کو نظر گاہ خاقانی میں لے جائیں اور اس امر کی سعی فرمائیں کہ یہ دونوں اوراق اسی وقت نظر سلطانی سے گزر جائیں اور حکم نوازش صادر فرمانے کا ارادہ کسی دوسرے وقت سے متعلق ہو، یہ درخواست کریں۔

خسرو جہاں سے صلہ حاصل کر کے اس فقیر تک پہنچا دیں جو سلطان عالم کی ستایش کرتا ہے اور رے رے میں یہ کیا کہہ رہا ہوں۔ آفتاب کو بھلا یہ کون سکھاتا ہے کہ تیرگی کیسے دور کی جاتی ہے اور نسیم سحر سے یہ کون کہتا ہے کہ غنچوں کی گرہ کشائی کیسے ہوتی ہے۔

ان باتوں کے بعد میں پریشانی گفتار کا عذر خواہ ہونا چاہتا ہوں۔ خط کو لپیٹ رہا ہوں اور دعا پر نگارش کو ختم کر رہا ہوں۔ نیز اقبال و جہاں بانی کو دائمی فروغ اور ابدی نورافشانی ارزانی باد۔

بنام مولوی عبدالوہاب لکھنوی

[۱۲۲]

حضرت والا خدام والا مقام، سپاس یاد آوری قبول فرمائیں، نگارش بصورت گزارش یہ ہے کہ آپ نے اکبر آباد (آگرہ) میں قدم رنجہ فرمایا ہے، یہ خاکِ پاک میری پیدائش گاہ ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے اس خاک سے سر اٹھا کر قدم مبارک کو بوسہ دیا ہے اور چاہتا یہ ہوں کہ لکھنؤ کی طرف رو آوری سے پہلے نوازش فرمائی کا ساز زمزمۂ خامہ کی جنبش کے ساتھ ایک بار پھر نواپرداز ہو۔

اس شہر خجستہ بنیاد میں پہنچ کر جب آپ بارگاہ قدسیت پناہ کی طرف رُخ فرمائیں تو پہلے خود کو میرے اندر محو کر لیں اور خواجۂ عالی مقام کے سر اقدس کے گرد پھریں اور اس گوشہ نشین فقیر کا پیام سلطان العلماء کی خدمت میں پہنچائیں کہ "یہ قطرۂ خونِ خام" جسے دل کہا جاتا ہے اندوہ آگیں پرسشوں کی اور وہ بھی تواتر کے ساتھ، تاب نہیں لا سکتا،

لاجرم ایک قطعہ کی تحریر کی صورت میں جس کا مصرع چہارم یہ ہے۔

آمدہ سال رحلتش داغ جگر گداز یا (۱۲۶۱ھ)

صفحہ کے رُخ سادہ کو اپنے خون جگر سے آلودہ کیا۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرت سلطان العلما کو جس حال وخیال میں بھی دیکھیں اور جو کچھ ان کی زبان گوہر فشاں سے سنیں وہ قلم کی زبانی مجھے بھی سنوادیں میں نواب محمد علی خاں بہادر کی فرزانگی و یگانگی کی تعریف کرتا ہوں اس نگارشِ سلام کے مشاہدہ سے کہ جو مخدوم کے صحیفۂ مودت کے بائیں جانب ہے اور دل خود بھی چونکہ سینہ میں اسی سمت میں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سلام دل کا پیام ہے میں اس کے باعث بھی اس پروین فشاں نامۂ عنایت پر اپنی جان نچھاور کرتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ عرب کے پہلوانوں میں ظاہر نام کا ایک پہلوان تھا کہ وہ میدان کارزار میں دونوں ہاتھوں سے یکساں مہارت کے ساتھ تلوار چلاتا تھا اسی لیے اسے ذوالمنین کہتے تھے بہر نوع وہ تلوار کا ذوالمنین تھا اور نواب کہ دونوں ہاتھوں سے خامہ فرسائی کرتے ہیں اور ہر نوع خط پر قادر ہیں تو انھیں ذوالمنینِ خامہ کہنا چاہیے۔

مشفقی مرزا حاتم علی مہر کے دل میں کیا آیا کہ انھوں نے نامہ و پیام کا دروازہ بند کردیا اور آپ کے مکتوب گرامی کے پایان ورق کو اپنے دستخط سے مزین فرمایا اسے حسن اخلاق کہنا چاہیے اور یہ ایک حُسن اتفاق ہے کہ وہ اس انجمن میں موجود تھے جب انھوں نے یہ سنا کہ یہ خط کسے لکھا جارہا ہے تو یہ کہا کہ اس سے بہتر اور کیا بات ہے کہ ہم بھی سلام لکھیں۔ مجھ بے چارہ کا دل کہ گلہ مندیوں سے لبریز ہے، وہ اس سے بہرحال ابا نہیں کرتا کہ سلام مہر کو میں بھی مہر کے ساتھ لوٹا دوں تاکہ میں السلام علیکم وعلیکم السلام کی رسم بجالا سکوں۔

بنام مولوی سید محمد صاحب

[۱۲۳]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت، یہ نیاز مند خداوند کی بارگاہ میں کہ داد گستر و فریاد رس ہے عرض گزار ہے خاک قدم سے جبیں نیاز کو آراستہ کرتا ہے زمین خدمت کو بوسہ دینے اور سر والا پر قربان ہونے کی تمنا کو بطور نذر پیش کرتا ہے۔

تعزیت نامہ کو روانہ کرنے کے بعد یہ حالت ہوئی جیسے میں نے پارہ ہائے دل کو بریاں کر کے اپنے پاس رکھ لیا ہو۔ سہ شنبہ کے دن ماہ صفر کی گیارہ تاریخ کو منشور والا کے فرمان اور بعد ازاں تیرہ تاریخ کو عطیہ سلطانی نے شرف ورود سے نوازا۔

ندامت کے پسینہ کی روانی کے باعث بہرین مو نے لب جو کی شکل اختیار کرلی اب ظاہر ہے کہ جو شخص شرمندگی کے اس سیلاب میں ڈوبا ہوا ہو اور وہ صورت قریب تر ہو کہ پانی سر سے گزر جائے سپاس گزاری کا دم کیسے بھر سکتا ہے میں نے مانا کہ سخن سرائی خود نمائی ہے لیکن آخر تو میرے پاس بھی دیدہ و دل ہیں۔

اس افسردگی کے زمانہ میں کہ میری آنکھیں نور دیدہ کے ماتم میں سیہ پوش ہیں اور شہر دل کفر و اسلام کے نزاع میں پرشورش؛ بندہ پروری اور وہ بھی اس خوبی کے ساتھ کہ دست امکان میں اس کی گنجایش مشکل ہے۔

کارکشائی کا کریمانہ انداز اگر معجزۂ امامت اور کرشمۂ ولایت نہیں تو اور کیا ہے سبحان اللہ غم زدگی میں غم زدائی کا یہ طریقہ اور مشکل میں مشکل کشائی کا یہ سلیقہ ثنا و ستائش سے بالاتر ہے

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

قطعۂ تاریخ جو نمونۂ کربلا کی تعمیر کے سلسلہ میں ہے اس عریضہ کے ساتھ روانہ کیا جا رہا ہے۔

ایضاً

[۱۲۴]

یہ اسد اللہ نامہ سیاہ حضرت مجتہد العصر سلطان العلما خداوندِ خرد پژردہ والا شکوہ دیں پرور، داد گستر فرزانۂ یگانہ ہماسایہ گردوں پایہ، کی گزرگاہ ارم اشتباہ کے سرِ وشیوں کی نظرگاہ میں عرش پرواز ہے۔ جو منظر علم و آگہی کے عرش فرش اور کشور معنی کے شہریار، دانش آموز و بینش افروز مرتضوی گہر اور مصطفوی اثر ہیں۔ سلطان العالم ہیں اور اپنے سلسلۂ نسب کے رشتہ سے قبلہ داستاں اور کعبۂ مخلصاں ہیں اور اپنے اعزاز و شرف میں آسمان آستاں۔

ابیات

سید محمد آنکہ جنبش ز نورِ حق
چوں مرز باب مہر منوّر لبابست
گر کو لبست مہر ضمیرش بود سپہر
ور دیں بود سپہر دل خواجہ کو کبست

(حضرت ملک رفعت سید محمد کہ جن کی جبین مبارک نور ایمانی سے اس طرح درخشاں و تابناک ہے جیسا کہ چاند آفتاب عالم تاب کے پرتوے چمکتا ہے۔ اگر علم کوئی ستارۂ درخشاں ہے تو ان کا ضمیر روشن اس کے لیے منزل آسمان ہے اور اگر دین عرش بریں کا حکم رکھتا ہے تو حضرت والا کا دل اس کا ستارۂ روشن ہے۔)

گلدستۂ سلام کہ مکرمی مولوی عبد الصمد صاحب سلم اللہ تعالیٰ کے مکتوب کے ساتھ ملفوف تھا جب اس پردہ سے نمودار ہوا تو سب سے پیشتر اس سے جوہر نگاہ کی تابانیوں میں اضافہ کیا اور جب از روئے تسلیم اُسے سر پر رکھا گیا تو سر و روشِ سرخوشی قابل چشم نمائی ہو گیا

فرد۔ آیدز چشم روشنی ذرہ آفتاب بر ہر زمیں کہ طرح کنی نقش پائے را

جس سرزمین پران کے نقشِ پا کی روشنی ہوگی ہر ذرہ مانند آفتاب کے روشن و تابناک ہوگا۔)

میں اس سلام کی آمد پر اپنے احساس شادمانی کے اعتبار سے اس دریوزہ گر سے مشابہ ہوں کہ جسے خسرو پرویز کے سات خزانوں کی طرف بلانے کے لیے صلائے عام دی جائے (اور وہ دریائے حیرت میں ڈوب جائے) اور رحمت خداوندی اس کی چارہ سازی میں مشغول کہ اورنگ سلیمانی بھی اس سے دریوزہ گری میں اس فقیرِ راہ کے ہم پلہ ہو جائے۔

جلد ہی بغیر کسی تاخیر کے اس قدسی صحیفہ میں نواب فرخ القاب مظفر الدولہ سید سیف الدین حیدر خاں بہادر کا نام بھی سرِ صفحہ لکھا دیکھا (ایزد دانا انھیں سدا خوش بخت و فرہ مند رکھے) یہ کلک معجز نگار کا تحریر فرمودہ ہے اسے توقیع سرفرازی کا میسر آنا لیجے کہ اس ننگ آفرینش کے بارہ میں ہوش افزا پرسشن عمل میں آئی ہے۔ میں نے خواجۂ والا گہر کے نزدیکوں میں ان کا نام دیکھ کر اتنا دور ہوتے ہوئے بھی زمین خدمت کو بوسہ دیا اور اس خجستگی سے بھری سرنوشت پر از راہ نیاز خود اپنے سر عجز کا طواف کیا۔

اب اگر مرگ ناگہاں امان دے تو میں ہوں اور زمزمۂ تہنیت کی سماعت نوازی (جو میں مہر و ماہ سے سنوں گا) اور روشنان سپہر کی ہم زبانی اور آفرین گوئی میں جانتا ہوں کہ میرا حوصلہ کہاں اور یہ ہجوم نشاط کجا، میرا دل سودا زدہ اس پیمانہ پر گرمیٔ نشاط کی تاب نہیں لا سکتا۔ اگر میں خوشی سے مر نہ جاؤں تب بھی زندگی میں چشم زخم اور لذت غم تو ناگزیر ہیں اور ان سے تو کوئی چارہ نہیں۔

لاجرم اس گوشہ بے توشہ میں لب اس یگانہ خوانی دمادم سے فگار ہیں اور ہاتھ پے در پے سپند سوزی سے مبتلائے آزار۔ انصاف یہ ہے کہ اگر یہ پرسش باز پرس کے طور پر ہوتی تو بھی مجھ پر راہ سخن بند ہو جاتی اور لرزہ میرے وجود کو بے طرح خستہ و شکستہ کر دیتا۔ اب چونکہ یہ از راہ مہر و محبت ہے تو میں یہ کیوں نہ کہوں اور اگر نہ کہوں تو یہ میری طرف سے خود اپنے اوپر ظلم ہوگا۔ اور ہر انجمن میں یہ بات کہی جائیگی

کہ فلاں شخص گناہ کے معاملہ میں دلیر ہے اور معذرت خواہی میں بے پروا۔
زبان سخن سرا گہر سنجی کا آلہ ہے ناسزا و ناروا باتیں کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں میں نہیں کہتا کہ "بدگفتاری" گناہ کے زمرہ میں شامل نہیں ہاں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا وہ بادشاہ کے فرمان کے بموجب تھا اب میں دیکھوں گا کہ ناخوشی کے اس انجام اور ناروا صورت حال کے اس ہنگامہ کے باب میں کیا فرمایا جاتا ہے۔

بیت

راست می گویم و یزداں نہ پسندد جز راست
حرف ناراست سرودن روش اہرمن است

(میں سچ کہتا ہوں اور یزدان پاک بجز راستی اور کوئی پسند نہیں کرتا اور غلط بات کرنا اور کہنا تو اہرمن کا کام ہے)
نگارش مثنوی میں مضمون بادشاہ کا تھا اور الفاظ میرے جیسا کہ نغمہ سرائی مِعَی زخمہ مضراب ہے اور صدا لرزش تار کے سوا کچھ نہیں پھر میں یہ ضرور کہونگا کہ وہ سب کچھ میری زبان میں نہ تھا دوسروں نے کچھ مصرعے بڑھا دیے ہوں گے۔
اب وہ وقت ہے کہ میں "بساط نشر" کو طے کروں اور انداز غزل سرائی کے ساتھ نوا سنج ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ کنج نامرادی کا خاک نشیں کلاہ نمد کے نیچے اپنے دماغ میں کیا کیا شورشیں چھپائے ہوئے اور لبادہ کی گراں باری کے باوجود دیہیم سخن کس حد تک پرورش لوح و قلم کرتا رہتا ہے۔
یارب یہ ذات ملایک صفات آفتاب روز قیامت کے طلوع کے وقت تک جہاں فروزی میں مصروف رہے اور سرچشمۂ نور و آگہی کا ذرا سا پرتو غالب سیہ روز کے حصہ میں بھی آئے۔

بنام عابد علی خاں

[۱۲۵]

خان آگاہ دل ہمہ داں، نام آور بلند نشاں، فرزانگی شیوہ، خجستہ روش، روشن

رواں (عابد علی خاں) کہ ان کی تعریف کرنا خود کو دیدہ وری و داد گستری کا مستحق قرار دینا ہے۔

اس خداداد فرخی کی روئیداد از روئے انصاف یہ ہے کہ مجھے اس پر یقین نہیں آتا تھا اور میں اسے ایک امر دشوار خیال کرتا تھا کہ اس کے بعد قلم کسی کے ہاتھ میں اس روش خاص کے ساتھ جنبش میں آئے گا۔

اب کہ میں نے دلکشا نامہ کو پردہ ملفوف سے باہر نکالا اور اس کے سواد روش کو دیکھا تو خامہ خوش مست کے اندازِ خرام نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا اور طرز نگارش نے ہم خیالی و ہم زبانی کا مژدہ سنایا۔ خوش اندیشی کے ساتھ یہ میلانِ طبع خاص طور پر اس حالت میں کہ آشکارا ہونے کی کسی کوشش کا شائبہ اور ادا نمائی کی کسی خواہش کا اس میں کوئی نشان نہیں (سبحان اللہ)

ہاں یہ نشان ضرور ہے کہ دو روحیں جو آزاد روی کے ساتھ روئے گیتی پر رہ نورد ہیں۔ ایک دوسرے کے ہمدم و ہمقدم ہیں اور اس طرح ہیں کہ گویا دونوں دوری کے باوصف، ہم سایہ ہیں اگر اس دنیا میں دو الگ پیکروں کا ایک ہونا ممکن نہیں تو نہ ہو لیکن ہم دل ہونا تو ممکن ہے اور بظاہر روشناسی کی کوئی صورت نہیں تو بھی کیا۔

آپ نے اپنے عطوفت نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ ایک زمانہ سے مجھے جانتے اور پہچانتے ہیں اس سے مجھے ایک نئی قوت ملی اور اس "وانمود" نے کہ سراپا منفعت و مسرت ہے مجھے اپنے ساتھ گستاخ اور آداب گفتگو میں دلیر کردیا تو میں شکوہ سنجی کے انداز میں یہ کہوں گا کہ جناب والا نے مجھے بہت دیر سے یاد کیا اور یہ تاخیر گویا مجھ پر ایک "ستم" تھا۔

دوسرا ستم یہ کہ اپنی نگارشات کو میرے پاس بھیجنے کے لیے آپ نے اجازت طلب فرمائی ہے کیا آپ نہیں جانتے کہ مجھ ایسے کسی نیازمند کے واسطے جو دل ناصبور اور طبع ناشکیبا رکھتا ہے خطوط کی آمد و رفت میں جو تاخیر ہوتی ہے وہی ناقابل برداشت ہے۔ آئینہ گفتاری روشن گری اور اس سے زنگار طبع کو دور کرنے کی خواہش سے، اپنی

سستِ طبعی کے باعث میں خوش نہ ہوں گا لیکن ہر آئنہ خود کو آپ کا کہ خوش گو ہر ہیں اور اپنا کہ میں آپ کا کارگزار ہوں ۔۔ سپاس گزار تصور کروں گا۔

ہر روز آپ کو روزِ نوروز کی طرح زیادہ سے زیادہ خوشیاں میسر آئیں اور جامِ بادہ مرغ وست آموز کی چہکار کی طرح آپ کے ہاتھوں میں چھلکتا رہے۔

اسداللہ

نگاشتہ روزِ پنجشنبہ ہفتم اپریل ۱۸۵۲ء

بنام مرزا اسفندیار بیگ خاں

[۱۲۶]

دیوان مہاراجہ الور

فرد

توحش اللہ گہر افشانی نالِ قلمم

یارب آبشخورِ ایں ابر کدامی دریاست

(میری اس نالِ قلم کی گہر افشانیاں اے خدا کی پناہ —— خدارا کوئی یہ تو بتائے کہ اس ابر کے پانی پینے کی جگہ آخر کونسا دریا ہے)

قلمِ ہمایونی کہ خود بال ہما ہے اور اس نگارش نامہ کے سوادِ عرض میں، اُسے فرقِ سخن پر سایہ گستر اقبال کہنا چاہیئے یا پھر کسی تاجدار کا وہ عطیۂ ایثار و احسان کہ اس کے باعث سخن گزار کا گوشۂ کلاہ آسمان کی بلندیوں سے ہم سری کا دعویٰ کرے۔ یہ وہ بادل ہے کہ جس کا سایۂ رحمت قطراتِ آب کے بجائے موتی برساتا ہے۔

اس نے ہوا خواہوں کی کشتِ اُمید کے ساتھ وہ سلوک کیا ہے کہ اگر ہر خوشہ کو موتیوں سے بھرا ہوا ہاتھ کہا جائے تو اس پر کوئی گرفت نہیں ہوسکتی۔ جنابِ والا جیسے یگانہ فرزانہ، حق شناس و حق گزار کا وجودِ ہمایوں اس سے کہیں زیادہ خجستگیٔ بخت و افزونیٔ سعادت کا باعث ہے کہ کوئی حق شناس عرضِ سخن کی صورت میں اس کا حقِ ستائش ادا کرسکے۔

اگر میں وفورِ مسرت سے بے خود نہ ہو جاؤں اور سرور و انبساط کے اس عالم میں

حدودِ سخن کی باندازۂ بایست پاسداری کروں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تہنیت صرف خواجۂ عالی قدر کے تئیں نہیں ہے نہاراجہ صاحب بہادر کے لیے اس سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ قدرافزائی، روزافزوں جاہ مندی کی نویدِ دولت کے واسطے فراوانی کا مژدہ تونگروں کے تئیں امن وامان کی بشارت، تہی دستوں کے حق میں بخشش وعطا کی صلائے عام اور دادگستری کے لیے روزِ بازار، خردمندوں کے واسطے یہ گرمیٔ ہنگامہ کی دعوت ہے اور ویرانوں کے لیے چمن بندیوں کی خوش خبری ہیں کہ گوشہ نشین اور چشمِ بد کی طرح اس انجمن سے دور ہوں کشور داہلِ کشور سے مجھے کیا کام اور آبادیٔ ملک و بہبودیٔ خلق سے کیا غرض۔

میں زمانہ سے اپنے مقصد کی بات کیوں نہ کروں اور خود کو مستحق مبارکباد کیوں نہ سمجھوں کیا میں اس بارگاہ کے دیرینہ وابستگان میں سے نہیں ہوں اور اس آستانِ والا کے خاک نشینوں میں میرا نام نہیں ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی کہ جب کاموں کی اساس دیرینہ خدمت و خلوص پر استوار کی جائے تو میرا دیرینہ گوشہ و توشہ مجھے واپس دیا جائے۔

سخن کوتاہ خواجۂ عالی مقام کو دولت واقبال اور جاہ و جلال مبارک ہو اور یہ چرخ گرداں سوائے اس روش کے جوان کے حسبِ دل خواہ ہو اور کوئی چال نہ چلے۔

سلام بر الوف احترام من جانب درویشِ بے دستگاہ اسداللہ نگاشتہ جمادی الاول سنہ ۱۲۶۶ھ روز شنبہ (۱۸۵۰ء)

بنام امین الدولہ آغا علی خاں

[۱۲۷]

نواب عالی جناب معلی القاب تازہ تماشہ کی خوش خبری ہو کہ رگِ قلم سے تراوش پائے ہوئے جگر پاروں کو میں فراہم کر رہا ہوں اور اس حسین انجمن میں ارمغانِ

لالہ وگل کے طور پر بھیج رہا ہوں۔ اگر اس بوالعجبی کے مشاہدہ سے ظریف الطبع لوگوں کے لبوں پر اس طرح ہنسی آئے کہ ہنستے ہنستے آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔

ہاں ایسا کوئی گلدستۂ بے رنگ وبو اس بزم کے لائق کہاں ہو سکتا ہے بجان اللہ خریدار ایسا صاحبِ بصیرت کہ دیدہ وری اُس کے اندازِ نظر کی قسم کھائے اور بھیجنے والے کے کالائے بد کا یہ عالم کہ اگر اسے "ہیچ" کے ہم پلہ قرار دیا جائے تو یہ خود "ہیچ" کے رکھنے کے مترادف ہو۔

اس پر بھی مجھے "سنگسار ملامت" نہیں کیا جا سکتا اور سرزنش کے شکنجے میں "سزا" کے طور پر نہیں کسا جا سکتا اس لیے کہ یہ گستاخی فرمانِ محبت کے زیرِ اثر ہے اور یہ بے ادبی بہ تقاضائے روزگار۔ ہاں اہلِ روزگار کے واسطے اس طرح کا استعجاب بھی بہت ہے اور محبت کی اس نوع کی خود نمائی بھی۔

میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی کمزور چیونٹی ٹڈی کی ٹانگ سلیمان کے پاس بطور ارمغاں لے جائے اور کوئی صحرانشین نمکین پانی کا آبخورہ امیر بغداد کو پیش کرے ذرّہ اگر اپنی بے حقیقتی کو پہچانتا تو خود کو روکشِ مہر نہ بناتا اور پروانہ اگر اپنے پر و بال کو شعلۂ شمع سے ہم بازو کرنے کی رسوائی کو جان لیتا تو انجمن سے باہر نکل جاتا۔ بلبل پھول کی طرف اڑ کر آتا ہے اگر محبت اس کی عذر خواہ نہ ہوتی تو مرغِ نالہ سنج کو بہار سے کیا نسبت کاہ کہربا کی طرف کھینچتا ہے۔ اگر جذبۂ مہر درمیاں میں نہیں ہے تو خس کو گہر سے کیا تعلق۔

لوگ کہتے ہیں کہ آنکھوں کی مدد کے بغیر دل نہیں دیا جا سکتا اَن دیکھی صورت کا روشناس کون ہو سکتا ہے میں کہتا ہوں کہ سخن ور، آوازہ ہمزبانی اور تعلق ہم نفسی کے پرستار ہوتے ہیں وہ صورت پرستوں کی طرح اپنے دل کو آنکھوں کے دروازہ پر گدائی کے لیے نہیں بھیجتے لاجرم ایک زمانہ سے میرا خیال مجھے اس بات پر آمادہ کرتا تھا اور گاہ گاہ دل میں چھپی ہوئی یہ خواہش سر اٹھائی تھی کہ جاہ مندی کی

بے نیازی مسکین نوازی کی راہ میں حائل ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ پہلے میں دلیری کروں اور بصورت نامہ خود کو خاطرِ عاطر کی جناب میں پیش کروں۔

اس زمانہ میں خاں صاحب مہربان خوش وقت علی خاں کو کانپور پہنچنے کا اتفاق ہوا چونکہ وہ اس محفل کے بار یافتگاں میں ہیں اور میرے مخلص احباب میں ہیں میں نے خط ان کو پیش کر دیا تاکہ جب وہ وہاں پہنچیں تو اپنے پردۂ گفتار کے ساتھ میں بھی سراپردۂ قربت میں جگہ پاجاؤں اور حجاب بیگانگی کا درمیاں سے اٹھ جائے غبار راہ کارواں یا خاکِ غمناک یعنی منتخب دیوان ریختہ کہ چند ورق سے زیادہ نہیں، خاکسار کی جانب سے اس بارگاہ میں بطور پیش کش روانۂ خدمت ہے اور زبان نیاز اس طور پر عذر خواہ ہے کہ جب ہر دو طرف سے دل مہر و محبت پر مایل ہیں تو نامہ و پیام کا سلسلہ اُسے ظاہری آرایش عطا کرے گا۔

دیوان فارسی بھی نظرگاہِ التفات میں گزرا نا جائے گا۔ الحال ایک غزل ان اوراق سے یہاں نقل قرطاس کی جاتی ہے تاکہ وہ نامہ نگار کی اندرونی کیفیات کو پیش کر سکے۔

بنام نواب علی بہادر مسند نشین باندا

[۱۲۸]

نواب صاحب، جمیل المناقب، ہمایوں القاب، قلزم فیض و محیط احسان دام اقبالہ، حضور موفور السرور، ہر آئینہ جناب والا کی ذات ہم ایسے گوشہ نشینوں کی امید گاہ ہے۔ خامۂ بے برگ و نوائی نے کو میں نقش آہنگ دے رہا ہوں لیکن بے زبانوں کا یہ رازداں اس نوا سنجی کی راہ طے کرنے میں اپنے ریشہ تنے کی طرح پیچ و تاب میں ہے اور میں کہ اس کا کار فرما ہوں وہ مجھ سے بھی زیادہ سرگشتہ نظر آتا ہے۔ گویا آہنگ کی فراوانی اور انبوہ در انبوہ بھیدوں کا سلسلہ بے پردہ دری کا خیال پیدا کرتا ہے۔ ورنہ سازکی تو فطرت ہے کہ وہ زخم کے ہر لمس کے ساتھ نوا پرداز ہو جائے۔ پھر اس خاص لمحہ میں اُسے نوا سنجی و نغمہ سرائی سے گریز کیوں ہے؟

میں خیال کرتا ہوں کہ جب نواب معلی القاب نے مسندِ دولت کی اپنے مبارک وجود سے رونق بڑھائی ہے چونکہ میں اس خاندان کا روشناس ہوں اور اگر فروتنی اختیار نہ کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ میں یگانوں میں سے ہوں اور مجھے چاہیے تھا کہ میں آیینِ وفاداری کو نگاہ میں رکھتا اور نامۂ تہنیت لکھتا۔ مجھ سے وہ نہیں ہوا۔ خدا جانتا ہے کہ یہ ناموافقت ولاپرواہی کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ میں نے اپنے آپ کو ناچیز تصور کیا اور بزمِ اُنس کے ندیموں کے لیے بارِ خاطر ہونا روا نہیں رکھا۔ اب کہ بحرِ عطوفت موج زن ہوا اور اتنے بہت سے بیش بہا موتی میری گود میں ڈال دیے حیرت میں ہوں کہ میں اپنی کم ہمتی کے عذر میں درِ سخن وا کروں یا پھر اس خداوندِ مہر و محبت کے ان ہاتھوں کی سپاس گزاری کروں جو دوردستوں کو اپنی بخشش و عطا کی ثمر فشانیوں سے نوازتے ہیں۔ انھوں نے دل سے غبارِ الم کو بھی دور کیا۔ میرا دل مجھ سے چھین لیا، غم و اندوہ کو گھٹا دیا اور امیدوں کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ بارے اس جانفزا نامہ اور دلکشا صحیفہ کا جواب، کہ موتیوں کے سمندر کا جوشِ ارزش اس کا ورود ہے۔ ساز عشرت کا تار جنبش میں ہے گویا قلم کے لیے اس کی صورت میں ــــ منشور راحت رونما ہوا ہے اور ہمدمی دمِ تسلیم کی نشان دہی کر رہا ہے۔

اوراق اشعار جنھیں گنجینۂ معنی کی فردِ فہرست کہنا چاہیے، نامۂ عنایت شمامہ کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے۔ انھیں کھولا ہر دو مخمس و مسدس میں غزلیات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ زہے لطفِ طبع و جدت ذہن، سلامتی فکر و حسنِ بیان۔ جب آغاز کار میں یہ انداز رکھتے ہیں تو دوامِ فکر اور مدامِ مشق کے بعد کیا صورت ہوگی۔ سچ یہ ہے کہ تھوڑی سی مدت میں علم یکتائی بلند کریں گے۔

میں فرمان بجا لایا اور ان شاہدانِ معنی کو ترمیم و اصلاح سے آراستہ کیا۔ اگر اس فن سے وابستگی اور اس پردۂ ساز کی محرمی کی آرزو رکھتے ہیں تو ریختہ گویوں میں میر و مرزا کے شیوۂ گفتار اور فارسی کے سخن سنجوں میں صائب و عرفی

و نظیری و حزیں کے کلام کو نظر میں رکھیں "نظر داشتن" کے یہ معنی نہیں کہ سوادِ ورق آنکھوں سے دل میں نہ اترے۔ بلکہ تمام کوشش اس امر کی ہونا چاہیے کہ جوہرِ لفظ کو پہچانیں اور فروغِ معنی کو دیکھیں اور خوب کو ناخوب سے جدا کریں۔

نسخۂ پنج آہنگ کہ اگر وہ میری تصنیف نہ ہوتی تو میں یہ کہتا کہ وہ نگارشِ فارسی کے لیے ایک خود پسند قانون ہے۔ اس میں بہت سے فکر آفریں نکتے کام میں لائے گئے ہیں۔ فراواں نادر ترکیبیں زیبِ تحریر کی گئی ہیں اور معنی خیز لفظ جزوِ عبارات بنائے گئے ہیں۔

ع راست می گویم و امید کہ باور دارند

میں سچ کہتا ہوں اور یہ امید رکھتا ہوں کہ میری بات پر یقین کیا جائے گا۔ دیوانِ فارسی و دیوانِ ریختہ اور اس کے ماسوا نظم و نثر میں سے جو کچھ میرے خامۂ لاابالی خرام کی یادگار ہے میں کافر ہوں اگر اس کا کوئی ورق میرے پاس ہو یا کوئی نسخہ میری ملکیت میں رہا ہو۔

میرے احباب ان اوراق کو میرے پاس سے لے گئے اور مجموعوں کی صورت میں جمع کر لیا۔ شدہ شدہ یہ مجموعہ ہائے اوراق انھیں کی سعی و توجہ سے قالبِ طبع میں لائے گئے۔ وہاں سے سوداگروں نے ان نسخوں کو اٹھایا اور دور دراز کے شہروں میں لے جا کر فروخت کر دیا۔ آپ کے فرمان کی پذیرائی میں بہت سے لوگوں کو سو بہ سو مقرر کیا وہ ادھر اُدھر گئے۔ جستجو کی، دیوانِ فارسی اور دیوانِ ریختہ نہیں ہاتھ نہ آیا۔ ہاں "پنج آہنگ" کا ایک نسخہ مل گیا۔ چنانچہ میں نے اس کو شرمسارانہ روانۂ خدمت کر دیا۔ آئندہ بھی جو ملتا رہے گا نظر گاہِ والا میں پیش کیا جاتا رہے گا۔

ہر چند ایک مدت سے طبیعت ریختہ گوئی کی طرف مائل نہیں ہوتی اور فارسی زبان میں سخن سرائی پہ آمادہ نظر آتی ہے لیکن حضرتِ ظلِ الٰہی کی رضائے خاطر اس میں ہے کہ ریختے کے اشعار اس بارگاہِ فلک اشتباہ میں بطورِ ارمغاں پیش کیے

جاتے رہیں ناچار گاہ گاہ ریختہ کہتا ہوں۔ چند غزلوں کے مسودے جو ہنوز میرے ہاتھ ہی میں ہیں اس نیایش نامہ کے ساتھ ملفوف کرکے بھیج رہا ہوں۔ ان کو ملاحظہ فرمائیں اور اس پر توجہ دیں کہ قلم کی رفتار کا یہ اسلوب اور شاعرانہ زمزمہ سنجیوں کا یہ انداز سامنے آئے اور خامہ کے لیے عیارِ جوہرِ اخلاص بن جائے۔

یا باں کا یہ خط دعا پر ختم کرتا ہوں۔ نواب عالی جناب کو جو روشنانِ سپہر کے لیے نظر گاہ ہیں خدا کرے کہ چشم روزگار سے کوئی گزند نہ پہنچے اور اس دولتِ خداداد کا چراغ تا صبحِ قیامت روشن رہے۔

بنام روح اللہ خاں

[۱۲۹]

بنام ایزد اس ورق میں جب آپ اس سوادِ صفحہ پر نظر ڈالیں اور کاغذ کی تہ کو کھولیں تو یہ معلوم کریں کہ وہ سلام جو میں اس مخدوم خادم نواز کو بھیجتا ہوں مردمکِ چشم تھا اور جگر گوشۂ آرزو ہے اور جسے دوسرے لفظوں میں گلگونۂ پیام کہنا چاہیے۔

رباعی

آں پیکر اتحاد را تاب و تواں
واں کالبدِ داد را روح و رواں
نے نے بہ نفس زندہ کن ہمنفساں
آں ہم نفسِ مسیح روح اللہ خاں

(وہ کہ پیکر اتحاد کے لیے تاب و تواں ہے اور عدل و داد کے کالبد کے تئیں روح و رواں ہے ــــ وہ اپنے نفس سے ہم نفسوں کو زندہ کرنے والا اور ہم نفس مسیح ہے جس کا نام روح اللہ خاں ہے۔)

اس کے بعد میں مخدوم زادہ کے خط کا جواب لکھتا ہوں جو فرزانگی شیوہ، روشن نفس، فرخندہ خو اور فرشتہ سرشت ہیں ــ اپنے شکوہِ دانشِ عالی گوہری اور ستارۂ بخت کی بلندی کے باعث آٹھواں ستارہ اور دودمان عالی کی ارزش و اعتبار کو بڑھانے والے ہیں یعنی مولوی حافظ غیاث الدین خاں، اللہ پاک ان کی عمر کو بڑھائے اور

اُن کی خوبیوں میں اضافہ فرمائے خدایا یہ کیسا ستودہ مزاج اور لایق صد تحسین شخص ہے کہ مجھ ایسے کسی آدمی کا نام جو مناجاتیوں کے لیے وجہ گراں باری خاطر اور خرابات دل کے واسطے باعث ننگ ہے اُن کے قلمِ دل آویز کی زبان پر آیا۔ انھوں نے غالب گمنام کو جو اپنی ہرزہ کاریوں کے اعتبار سے ایک نشان امتیاز رکھتا ہے نیکیوں سے یاد کیا اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو یہ خزانۂ یگانہ میر قاسم خاں کی غلط نمائیوں کی وجہ سے ہوگا۔

انھوں نے ذرہ کی وہ تعریف کی ہے جو خورشید کے لایق ہے اور قطرہ کو دجلہ کر کے دکھلایا ہے۔ میں دوستوں کے واسطے ایک یار وفا پیشہ ہوں، بہت دنوں سے اس سوچ میں ہوں کہ میرے مخدومِ راست روش خواجۂ عالی مقام کہاں ہیں اس خط کے پہنچنے کے بعد بھی جو وحید الدولہ نامی ایک شفیق مکرم کے خط کے ساتھ آیا ہے میں یہ نہ جان سکا کہ سید صاحب (کہ مجھ ناکارہ کی تعریف کرنے والوں میں ہیں) اس وقت کانپور میں ہیں یا پھر زیر نظر خط بھی جو آپ کی طرف سے آیا ہے نگارستان لکھنؤ سے روانہ ہوا ہے۔

دل سودا زدہ نے کشاکش سے رہائی نہیں پائی اور پریشانی اپنی جگہ پر رہی جب زبان خامہ نے خط و کتابت کی راہ وا کی ہے تو پھر ایسا کیوں نہیں کیا جاتا کہ عنوان نامہ (پتہ) میرے نام سے لکھیں، اور بہ سبیل ڈاک روانہ کریں اور وہ روشن نشانات کہ مجھے پتہ میں لکھنا چاہیے ان سے مطلع فرمادیں۔

اس ایک کرشمہ سے جو محبت نے میرے معاملہ میں کیا اور اس خط کے باعث کہ ہر یر خامہ کے وسیلہ سے مجھ تک پہنچا ادھر میری آنکھیں دیدار جو اور اُدھر میری زباں ستایش گر ہے آفریں نگار ہے۔

شادی و شادمانی کی قلمرو میں حکمراں رہیے والسلام

ایضاً

[۱۴۰]

بہ نام اللہ اس ورق میں کہ جب تم اس کے سواد تحریر پر نظر ڈالو گے تو سوچو گے کہ ارض کنعان کے شاہد گم گشتہ (حضرت یوسفؑ) کا لباس اس پھول کی پتیوں سے کہ شل ریشم و حریر ہیں۔ تیار نہ کیا جاتا تو یعقوب کو ملبوس آنکھوں سے لگانے میں اپنے لخت جگر کی خوشبو نہ آتی۔

مثنوی

خوشا کادی و بوے جاں پرورش
زخود بہر پرواز بو شہپرش

نسیم رواں پرورش دادہ اند
دگر صورت شہپرش دادہ اند

ازاں دوست کیں گل، بہ نشتر شمیم
نہ زیباست منت پرست نسیم

تو گوئی بہاران فرخندہ خو
کہ رستام رنگست و قتام بو

پیئے تازہ گلہاے کروی بہشت
برات روان بخشیٔ بو نوشت

شمیمے کزاں تازہ گردد دماغ
فزوں آمد از طرف گلہاے باغ

نگہداشت آں مایۂ دلفروز
بکاوی بہ بخشیدۂ اندر تموز

تموز از دمش نو بہاراں شدہ
شرف نامۂ روزگاراں شدہ

اگر در خور رخت شادی بود
زرا کسوں گلہاے کادی بود

شمال و صبا پیش کارش بباغ
گل از شبنم آئینہ دارش بباغ

ازیں ارمغانے کہ فرخ دم است
چنیں تازہ برگے دریں عالم است

بدا ساں کہ جاں راست از تن لباس
فرستندہ را باد از من سپاس

بود تا کہ زیب بساط سپہر
ز نسرین و ماہ و گل سرخ مہر

براں گل کہ آرد ز گلزار باد
مہاراج را وقف دستار باد

بنام امیر حسن خاں

[۱۳۱]

فرد

داغم ز سوز غم کہ خجل داردم ز خلق

بوئے کہ تن ز سوختن استخواں دہد

[میں اپنے سوزِ غم سے داغ ہوں کہ وہ مجھے اس بو کی وجہ سے جو ہڈیوں کے جلنے کے باعث میرے تن بدن سے آتی ہے خلقت کے درمیان شرمندہ رکھتا ہے.]

میں وہ گدائے راہ نشین ہوں کہ ایک گونہ خود آرائی اور ایک سعی بے خود نمائی میری طبیعت کا خاصہ بن گئی ہے. اس فقیر سے صرفِ نظر کیجئے کہ وہ اپنی پرانی گدڑی پر ٹاٹ کے فرسودہ ٹکڑوں سے پیوند پر پیوند لگاتا رہے اور اپنے نامبارک چہرے کو منہ لٹکائے ہوئے رہنے کے انداز میں اپنے بکھرے ہوئے بالوں کے حلقوں سے رسی کی طرح آویزاں کرے.

یہ کہنا چاہئے کہ تخمِ گہر پاشی کے خیال میں اس شخص کی بزمِ رشکِ ارم کی ہوائے شوق میں ہے جس کا ضمیر بینش بہا موتیوں کا خزینہ ہے۔ لاجرم میرا فائدہ تو عذرِ گناہ کی پیش کش میں ہے۔ بساطِ دعویٰ کی آراستگی میں نہیں، تاکہ نواب صاحب جو فرزانہ روش رکھتے ہیں سپہر جناب و مبارک القاب ہیں اور جن کی بارگاہ عالی برجیس پایہ اور روح الامین سرکار ہے جو سخن سرا، سروش نوا ہیں اس سخن سنج بے نوا کو بخشایش کا مستحق تصور فرمائیں اور بازپرسی کی راہ پر قدم رنجہ فرمانہ ہوں کہ جب آرائش گفتار کی دستگاہ اور سخن کی متاعِ گہر بار دستِ تصرف میں نہ تھی تو یہ جرأت کہاں سے آئی اور یہ تاب و تواں کیسے میسر ہوئی کہ دوستوں کے ساتھ سلسلۂ گفتگو میں رہ سے متعلق گستاخانہ باتیں کرے۔

زمرّدیں نہ بود خاتمِ گدا دریاب
کہ خود چہ زہر بُوَد کاں تہِ نگیں دارم

فقیر کی انگوٹھی زمرّدیں نہیں ہوا کرتی۔ اس پر نظر کرو کہ اس انگشتری میں تہہ نگیں کہیں زہر تو نہیں ہے۔

اگر دوست کی آرزو کرنے والا دل مبتلائے شورش ہے اور اس کی تعریف کرنے والی زبان آمادۂ خروش یہ میرا آئینِ گزارش ہستی ہے دستورِ نمایش مستی نہیں جس کی نظر فریبیاں اور نیرنگیاں کچھ اور ہی ہیں بندِ غم اور افسردہ خاطری نے مجھ پر راز کھولا اور مجھے اپنی نمودِ بے بود کی حقیقت سے آشنا کیا۔ "پندارِ پیدائی" باقی نہ رہا اور ہستی بے بود کا خیال کہ وہم و گمان سے زیادہ نہ تھا درمیان سے اٹھ گیا اور جو "بندِ غم" کہ میرے وہم کے سوا اور کچھ نہ تھا موم کی طرح پگھل کر رہ گیا۔

لاجرم روح کی خستگی اور شکستہ خاطری کا وہ احساس دور ہو گیا۔ اب میری خاکِ دل بے غبار ہے اور میرا شعلۂ شوق بے دود نہ میری زبان کو نکتہ ہائے جگر تاب سے کوئی واسطہ اور نہ اندیشہ ہائے خوں ناب سے کوئی تعلق صحیفۂ بہار آگیں کو دیکھ کر جو چکوروں کو انداز خرام سکھانے والے اس قلم معجز رقم کا

تحریر فرمودہ ہے جس کے لحن نے میرے عندلیبانِ چمن نغمہ سنجی کے آداب سیکھتے ہیں۔
ہر نقش کہ اس کے سوادِ ورق سے صفحۂ نمود پر جلوہ گر ہوا ہے اعتقاد الدولہ کے لیے منشورِ فیروزی ہے اور ہر وہ اہتزاز جو اس کی ہر تہہ کی کشود سے عرصۂ شہود میں لطف پیرا ہو غالب کے لیے اپنے اندازِ دلربائی و حسن ورود کے ساتھ، نسیم صبحِ نوروز بن گیا۔ وہ دل جسے مجھ سے قیمین کر اعتقاد الدولہ اپنے لیے پر ناز کرتا اور مجھ بے دل پر وہ زبانِ طعن دراز کرتا رہا ہے میں نہیں جانتا کہ وہ میرے سینۂ بے کینہ سے کیسے اڑا کر لے گیا۔
اب ظاہر ہے کہ جو پیاسا ہے وہ اس زلالِ مصفّٰی کے جرعوں کو پی کر ہی آسودہ ہو گا جسے پانی کہتے اور تشنگی کے وقت پیتے ہیں۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں اور میری پیاس کتنی مبارک ہے کہ زلالِ خضر یعنی آبِ حیات کے جرعہ سے میرے جگر میں بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھایا گیا اب میں ہوں کہ میں نے سرو زانو کی ہم آمیزی کے رشتے کو کاٹ دیا سرخوشی کے ساتھ ہوس کو خیرباد کہا اور خود اپنے لیے دستِ مریزاد (تیرا ہاتھ نہ ہلے) کہتا ہوا خط لکھنے بیٹھ گیا۔
قدسیوں کی ایک جماعت میرے دائیں بائیں "چشم ما روشن" کہتی ہوئی ایستادہ ہے اور حوریانِ جنت کا ایک طائفہ میرے درو بام پر رقص کناں۔ خدا کرے دشمنوں کی آنکھیں بے نور ہو جائیں جو کچھ نہیں جانتے اور اس پر بھی خوردہ گیری کرتے ہیں اور میری چشم بدبیں کی طرح میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ ساغر مے برابر گردش میں ہے اور جرعہ ریزیاں کر رہا ہے۔
دوستوں کے روئے روشن کی تمنائے دید کے ساتھ کہ سازِ آشنائی کے لیے نوا اور دردِ بیگانگی کے واسطے دوا اُن سے ملتی ہے اور خط جام اپنی تابانیوں کے ساتھ نگاہوں میں مسلسل چکا چوند پیدا کرتا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ میں خود اسی کی بارگاہ قدس میں یہ دعا کرتا تھا کہ یہ گنبد گرداں کبھی دشمن کی خواہش کے علی الرغم حرکت کرے تا کہ دوست کے ساتھ میرا معاملہ اس عجیب و غریب آویزش میں نہ پڑے جہاں

و ہست و نیست "یعنی ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ امید کہ اس کے بعد اس نیاز مند کو محبت کی قید کے اعتبار سے بندۂ وفادار اور فنِ سخن کے نقطۂ نظر سے مخلص ہوا دار تصور فرمائیں گے اور یہ خیال کریں گے کہ فلاں شخص کا دل اور زبان ایک ہیں اور دونوں ہمارے ساتھ ہیں۔

میں بھی خدا سے اپنی زندگی کی آرزو اس لیے رکھتا ہوں کہ شاید کبھی تو وہ وقت آئے کہ میں معذرت پیش کرکے خاطر مبارک کو جو تکلیف مجھ سے پہنچتی ہے اس کی تلافی کرسکوں۔ نیز یہ بندۂ حقیر دوست کی خاطر عاطر سے بھی اسی خواہش کی توقع رکھتا ہے کہ میرے خط کو اغیار کے خطوط کے ساتھ ہم توردہ (لپیٹ) کرکے نہ رکھیں کہ یہ اس کے واسطے شکنجہ میں کسنا ہے اور میری روح کے لیے ایک ایسی قید میں گرفتار کرنا جس کے بند کبھی مشکل ہی سے کھولے جاتے ہیں۔

میں اعتقاد الدولہ نہیں ہوں کہ اس زبوں حالت پر بھی صبر کیے بیٹھا رہوں۔ منزل و مسکن کو نہ جاننے کا عذر ہرگز قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس گمنامی و ناکسی کے باوجود میں محکمۂ ڈاک کے ہرکاروں کے لیے کوئی مجہول الاحوال شخص نہیں ہوں میرے نام کے خط پر شہر کا اور میرا نام لکھ دینا بھی کافی ہے۔

افقِ غزل اور صفحۂ مشرق پر طلوع ہونے والے نیرِ آرزو کی درخشانی کی بابت اتنا جان لو کہ گزارشِ آداب اور تقریب زمیں بوسی کے موقع پر اس نگارش کو حضرت بندہ نواز خواجۂ والا قدر و مخدوم عالی تبار مولوی مسیح الدین خاں کی نظر گاہ میں پہنچا دیا جائے کہ افق زار مشرق کا نمونہ ہے اور قبلہ گاہوں کی طرف رخ کرکے نماز گزاری کو میرے مشرب کی رُو سے بدعاتِ حسنہ میں سے تعبیر کریں بجنت۔ خوبی آثار کی فرخی ازل سے ہے اور ابد سے اُس کا ازلی پیوند ہو۔

ایضاً

[۱۴۳]

صاحبا و مطاعا کہ خاقانی مرتبت و خسروی دولت ہیں (میرے خداوند جن کا میں

فرماں بردار بندہ ہوں) نامۂ نامی کہ نشان آوری ہے نعمت غیر مترقبہ کی طرح یہ اچانک بھی ملا اور حسبِ دل خواہ بھی۔ آپ نے سچ یہ ہے کہ صبر و شکیب کی اندازہ شناسی کی داد دی اور مزدِ انتظار گویا انتظار سے پہلے مرحمت فرمادی۔ سبحان اللہ یہ بہار نامہ جسے صحیفۂ مشکبار کہنا چاہیئے۔

فرد   از روئے نگار دل کشا تر

وز بادِ بہار جاں فزا تر

(جو روئے نگار سے زیادہ دل کشا اور بادِ بہار سے زیادہ جاں فزا ہے۔)

اس قدر افزائی پر اگر میں ناز کروں تو بجا ہے اور اس مسرت پر اپنی قسمت کو سراہوں تو میں خود کو اور اپنی خوش بختی کو اس ستایش کے لایق گردانتا ہوں۔

آپ نے اس خط میں جس طرح اپنے انداز سخن کی تحسین کی ہے اس کے باب میں کہا جاسکتا ہے کہ از راہِ مہر و محبت میری ہم زبانی کی ہے۔ مجھے اپنے ایمان کی سوگند -- کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے اور کہتے ہیں اس سے بلند تر ہیں اور اس ستایش کے ہر طرح سزاوار جس سے بڑھ کر کوئی بات اندیشۂ خیال میں نہیں آتی۔ آپ کی نگارشات پیکرِ نثر کے لیے بہ منزلِ روح اور زمینِ نظم کے واسطے ہم سرِ آسمان ہیں۔ اگر آپ میدانِ سخن کے شہ سوار ہیں تو میں آپ کا فرماں پذیر اور حاشیہ بردار ہوں اور اگر آپ کو دیارِ ہنر کی خداوندی حاصل ہے تو میں آپ کا بندۂ حلقہ بگوش۔

یہ کیا بات ہے کہ اس خط کی تحریر میں اس کے باوصف کہ آپ نے بڑی مہربانی فرمائی ہے۔ غالب تشنہ جگر کے واسطے جرعۂ التفات کا جام اس ادا کے ساتھ گردش میں نہیں آیا کہ جب فکرِ مغزِ سخن کو تلاش کرے تو وہ الفاظ مہر و محبت کی صورت میں دل نواز ہوں۔

نگاہِ ناز بدل سر نداده چشمہ نوش

ہنوز عیش باندازۂ شکر خداست

[نگاہِ ناز کا نشتر تو رگِ جاں میں کھٹک رہا ہے لیکن لطف و عنایت کا:

سرچشمہ ابھی نہیں اُبلا ابھی تو عیش باندازۂ شکر خند ہے اور بس۔

امید کہ اس راہ میں بے پروایانہ سفر نہ کریں گے اور اس معرض میں کہ میں ابھی تک آپ کی محبت کا دم بھرتا ہوں مجھ سے بھی خلوص اور اپنائیت کے ساتھ پیش آئیں گے۔

میں اپنے دستِ نگارش سے اس معاملہ میں شکوہ سنج ہوں کہ مجھے یہ خوف ہے کہ میرے حق میں بد آموزی کرنے والی باتیں دل میں گھر کر گئی ہیں اور ابھی تک مجھ سے دل رنجش کا وہی عالم ہے خدارا یہ تو نہ کیجئے میری طرف سے میرے دوست کے دل میں مہر و محبت کے جذبات کے سوا کچھ نہ ہونا چاہئے۔

قطعہ

متوام زندہ و نادیدہ سراپائے ترا
بگمانم ز سراپائے تو کاں جانِ من است
شرطِ اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب
اے تو غایب ز نظر مہر تو ایمانِ من است

(میں نے تیرے سراپا کو نہیں دیکھا اور پھر تیری یاد کے سہارے زندہ ہوں اور تیرے سراپا کے بارے میں میرا گمان یہ ہے کہ وہ سر تا سر میری جان ہے۔ اسلام کی شرط اوّل ایمان بالغیب ہے۔ اے کہ تو میری نظر سے غائب ہے۔ تیری محبت میرا ایمان ہے۔ زبانیں باہم غزل سرا اور دل باہم مایل بہ محبت ہوں۔)

اسد اللہ نامہ سیاہ نگاشتہ بست و دوم جولائی ۱۸۴۴ء

بنام مولوی خلیل الدین خاں بہادر
[۱۳۳]

فرخ گہرو فرخندہ نگاہ اور کم قسمت افراد کے لیے خوش نصیبی کی امیدگاہ، ہر چند بہت سے تابناک دن رات کی تاریکی میں بدل گئے اور بہت سی سیاہ راتیں روشن صبح ہو گئیں۔ سخن مختصر یہ کہ ایک طویل عرصہ بیت گیا کہ جب اجزائے زمانی کو حلقہ در حلقہ ایک سلسلہ میں پرو دیا جائے گا تو شمار سنین اکائیوں سے گزر جائے گا کہ نہ اس طرف سے ترانۂ نیازمندی چھیڑا گیا نہ اس طرف سے دلنوازی کا ساز بلند آواز ہوا۔

یہ نفس ہم نفس کہ میں اپنی کم خدمتی کی خجالت سے کبھی دل گداختہ رہا اور بے پرواہیٔ دوست کی تاب نے کبھی جگر سوختہ بنائے رکھا؛ میں اس درجہ شرمندہ تھا کہ جب کبھی میرا دلِ پُر اندیشہ یہ چاہتا تھا کہ میں آشکارا طور پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کروں تو شرمندگی کے باعث جو پسینہ ٹپکتا تھا وہ سوادِ تحریر کو سطر سطر صفحۂ قرطاس سے دھو ڈالتا تھا۔

اور دوست کی ناخدمتی کا خیال اس طرح مجھ پر سہمنا کی طاری رکھتا تھا کہ جوابِ خط کی نگارش کے وقت میں لرزہ براندام ہو جاتا تھا اور قلم میرے ہاتھ میں اور ہاتھ ریزش کے باب میں بیکار ہو جاتا تھا لیکن بایں ہمہ میرا دل کہ آرزمجو تھا اور ہے، میں اس پر بھی خوش ہوں کہ جب اس لمبے عرصہ میں کہ وقت نے یہ راہِ دراز طے کی ارادت کی حبلِ متین کا سرا میرے ہاتھوں میں رہا۔ یہ دور گزر گیا اور اس سے یہ بات بھی ایک طور پر سامنے آئی کہ مہر ورزی کا دعویٰ کرنا اپنی جگہ پر صحیح ہو گا۔

افسوس کہ آپ نے کبھی یہ بھی نہ پوچھا کہ مجھ پر گردشِ آسمانی کی بدولت کیا بیت گئی اور میری قسمت کے ستارہ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ میں زندہ ہوں لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ میں نے کس حیلہ سے موت سے امان پائی ہے اور کس آرزو سے میں نے اپنے دل کو لگائے رکھا ہے۔

لارڈ ولیم بنٹنگ سے میری کوئی توقع پوری نہ ہوئی اور اس نے راستی کی راہ

چھوڑ کر میرے دشمن کو فرخی و فیروزی بخش دی. اب لارڈ آکلینڈ لندن سے آئے ایوان گورنری کو اپنے وجود سے زینت بخشی زمانہ کا ورق الٹا اور عدل و داد کا جو انداز تھا وہ بدلا والی فیروز پور کا قدم درمیان میں نہ رہا اور فیروز پور نے قلمرو سرکاری کا حکم پایا۔ داد خواہ کو دیرینہ روش کے مطابق پنشن دہلی کی کلکٹری سے ملنے لگی اور ہم چشموں کے در دولت پر عذر یوزہ گری سے نجات ملی۔

اب میں نے گورنمنٹ کو مدعا علیہ ٹھیرا کر کورٹ آف ڈائریکٹرز کی بارگاہ میں یہ درخواست بھیجی ہے۔ اور اپنی اپیل کو خود گورنمنٹ کی معرفت ولایت روانہ کیا لارڈ آکلینڈ کا زمانہ ختم ہوا اور کسی نے اس عدالت عالیہ سے مجھے خبر نہ دی کہ کیا ہوا۔

جب لارڈ ایلن برا بہادر نے عہدۂ گورنری کی آبرو بڑھائی تو زمانے کے ہاتھوں مجھ پر کیا ظلم ہو تا رہا ہے میں نے پھر اس کی داستان سنائی اب نہ جانے یہ بیوقوفی تھی یا کار آگہی کہ میں نے بزبان انگریزی ایک عرض داشت صاحبۂ بلقیس زماں فرخندہ گہر، عالی نشان، ملکۂ انگلستان کی سرکار دولت مدار میں روانہ کی جنھیں عہد موجود میں اقتدار سلیمانی حاصل ہے اور یہ خواہش کی کہ اسے ملکۂ عالیہ کے حضور میں پیش کیا جائے میری نیایش کو عز قبول بخشا گیا اور امیر الامرا چیف سکرتر بہادر کا والا نامہ جو پنجم ماہ اگست سنہ (؟) کا لکھا ہوا ہے مجھے ملا اور اس میں مجھے یہ ہدایت کی گئی کہ اس عرض داشت کو کاغذات ملکی میں شامل کر کے جو آخر ماہ میں سفینۂ ڈاک میں بھیجے جائیں گے ولایت روانہ کیا جائے یہاں تک مری سرگزشت تھی۔ اب میری سرنوشت میں کیا ہے اور اس کے بعد سر سودا زدہ پر کیا گزرے گی یہ کون جانے؟

اس گوشہ نشینی میں کہ میری جاں گدازی کا زاویۂ خلوت ہے اور جو میرے دل کے دھوئیں سے ایک کافر کی قبر کی طرح تاریک نظر آتا ہے میں نے اپنی آنکھوں کو اس دھوئیں سے اس امید میں سیاہ کر رکھا ہے کہ میں شاہ اودھ کی ثنا و ستایش

کروں اور اس کے دستر خوان سے اپنے لیے صلہ و انعام کی توقع رکھوں۔ لیکن یہ کام نہیں ہو گا اور اس آرزو کا نقشِ سویدا اس وقت تک درست ہونا دشوار ہے جب تک کہ کوئی ایسا شخص جو زمانے کا اداشناس ہو اور بات کو بہتر انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ درمیان میں نہ ہو۔

نہیں نہیں میں نے غلط کہہ دیا وہ تو کوئی ایسا شخص ہونا چاہیے جو شاعر پر مہربان ہو اور اس بیچارے کے دردِ دل سے آگاہی رکھتا ہو اور اس کے فن کی قدر و قیمت کو جانتا ہو۔ تاکہ وہ صحیح طور پر اس بات میں گزارش کر سکے سخن ور کو سخن کے ذریعے متعارف کرا سکے اور "باندازہ بایست" اس کی تحسین کر سکے۔ اسی کے ساتھ شاہ اودھ کی زبان اور دستِ گوہر فشاں سے جو کچھ ادا ہو وہ اسے سنے اور اس فقیر ستائش گزار تک اُسے پہنچائے اسی کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس میں کسی طرح کی بیگانگی اور خود نگہداری نہ ہو اور سخن گزار کو اس گراں مایہ گوہر کی طرف سے سپاس قبول کرنے میں کوئی تکلف نہ ہو۔

جوہر اندیشہ کہ ہر کام کے سراپا کے لیے مشلِ پرکار ہے، اور پرکار کی طرح ہر ایک دائرۂ کار کو اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے کہتا ہے کہ ایسا یگانۂ روزگار شخص اور جوہر ستائش کے راز سے آشنا اور پھر اس قدر استواری کے ساتھ پیوند یک دلی رکھنے والا جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا سوائے اس نشانِ مہر و مروّت کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ ہر آئینہ میری دلی خواہش یہ ہے کہ اگر دل نوازی اختیار کریں اور اجازت مرحمت فرمائیں تو اس ورق کو جو میری قسمت کی طرح نمونۂ روزِ سیاہ اور میرے عز و جاہ کی دسترس میں ایک کاسۂ گدائی کا سا حکم رکھتا ہے، میں نظر گاہِ التفات میں بھیج دوں۔ تاکہ جس طرح مناسب خیال فرمائیں اس کو بادشاہ اودھ کی عرض گاہِ والا میں پیش فرما دیں۔

والسلام بہ الوف الاحترام۔

بنام نواب حشمت جنگ بہادر

[۱۳۴]

یزداں کہ فرخی و فیروزی کو پیدا کرنے اور اپنے بندوں کو جاہ مندی و سعادت سے نوازنے والا ہے نواب والا القاب، امیر جم جاہ، انجم سپاہ، سلطان شوکت، سلیمان حشمت، عالی دودمان و مظفر نشان کو فرخی فرہنگ، فیروزی بخت اور اقامت علو جاہ سے نوازے اور ہمیشہ معاون و مددگار رہے۔

ایک زمانہ سے حضرت والا کی عالی حوصلگی، خجستہ خاطری، حسن فرزانگی، فراوانی دانش، افزونی ہوش، فرخندگی گفتگو، ضیا باری خرد اور فروغ مندی رائے کے بارہ میں راست گفتار اشخاص اور انسانی کردار کو سچائی کے آئینے میں پیش کرنے والوں کی زبانی سنتا رہا ہوں اور یہ اس سے کہیں زیادہ ہے کہ پیمانۂ ہوش میں سما سکے اور وہ اس کی صحیح طور پر قدر شناسی کر سکے۔

اگر بخت یاوری کرے تو اس دل کشا انجمن میں باریابی کی راہ باز ہو اور دل کو روشن کرنے والی باتیں آپ کی زبان گوہر فشاں سے سنی جا سکیں نواب والا جناب کی بارگاہ کے قرب یافتہ لوگوں کی خاطر عاطر اور روانِ شادماں پر یہ بات مخفی نہ رہے کہ یہ لوگ بارگاہِ آفتاب کارگاہ کے گوشۂ بساط پر ناصیہ سائی کرنے کے باعث میرے محسود ہیں (میں ان کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔)

اس دولتِ سپہر منزل کی رونمائی سعادت سے پہلی بار میں اس وقت گوش آشنا ہوا جب میرے دیرینہ دوست فرخ آبادِ خجستہ بنیاد سے یہاں آئے اور جیسا کہ میں نے آغاز میں لکھا ہے مجھ سے اس کے بارے میں بیان کیا۔ کیا عرض کروں کہ یہ سن کر دل میں کیسا ولولہ پیدا ہوا اور دوبارہ سننے کے واسطے میں کس درجہ جگر تشنۂ گفتار رہا۔

زمانے کو میری آرزومندیوں پر رحم آیا اور مکرمی میر علی بخش صاحب میرے کلبۂ احزاں میں رونق افروز ہوئے۔ دو تین بار اسی طرح مل بیٹھنا اور گفتگو

کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس محبت کے معنی سرتاسر میری طرف سے پرستش تھی سید صاحب کی طرف سے تحسین اور میری جانب سے آفرین۔

اس کے بعد سے آپ کی ذات والا پر تصدق ہونے اور سرا قدس کا طواف کرنے کی خواہش روزافزوں ہے اور زمیں بوسی کی تمنا میرے دلِ مستمند پر غالب آتی جارہی ہے۔ اس بار جب مشفقی امداد علی خاں کا دہلی میں گزر ہوا تو نہیں کہہ سکتا یہ میرے جذبۂ روحانی کی تیز قوتِ کشش تھی یا پھر یہ انکے "قدوم میمنت لزوم کی خوبی اور فرمانِ بزرگی کے زیر اثر تھا کہ انھوں نے اس فقیر کے کاشانۂ غربت کو اپنے "نقشِ پائے راہ پیما" سے "رشکِ گلزار ارم" بنایا۔

بہت سی گراں مایہ باتیں درمیان میں آئیں اور نہفتہ راز نہاں خانۂ دل سے زبان پر آئے۔ اسی سلسلے بیانِ گفتگوئے راز میں خانِ رازداں کی زبان پر یہ بات بھی آئی کہ نواب صاحب معلی القاب کے لبوں پر اکثر غالب کا نام آتا ہے اور اس آشفتہ نوا کے اشعار اُس محفل میں پڑھے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ میں کبھی اپنی نام آوری پر رشک کرتا ہوں کہ میرا نام آپ کی زبان معجز بیان پر آیا اور کبھی اپنی شاعری سے مجھے حسد ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے پہلے ہی اس انجمن کی روشناس ہوگئی۔

ایک زمانے سے "یہ آرزو گاہ گاہ" میرے دل میں سر اٹھاتی تھی کہ میں خدمت والا میں عریضہ ارسال کروں اور اپنی چالیس سال کی جگر کاوی کا "رہ آورد" یعنی اپنا مجموعۂ فارسی نظر گاہ عالی میں پیش کروں لیکن شکوہ سروری کے پیش نظر دورباش کا کانٹا میرے دل میں کھٹکتا تھا اور اس نوع کی جرأت و گستاخی کی رخصت نہ دیتا تھا۔

اب کہ میں نے یہ سن لیا کہ یہ فقیر بادشاہ کا روشناس ہے اور یہ کہ امرائے دولت پناہ فقرا کے غوغا سے ناخوش نہیں ہوتے یہ عرض داشت جسے میں خطِ بندگی خیال کرتا ہوں، اس سفینہ کے ساتھ جسے داغہائے سینہ کی فہرست کہنا

چاہیے میں خاں صاحب جمیل المناقب کو پیش کروں۔ اب وہ وہاں پہنچیں گے تو ایک درویش کا تحفہ بادشاہ کی خدمت میں نذر گزرانیں گے کہ دریوزہ گروں پر سلطانی نوازش کی صورت سامنے آئے اور ارمغان مرحبا کے عطیہ سے تلافی کی شکل نکل سکے۔

نیّرِ اقبال کو فروغِ جاودانی نصیب ہو۔

بنام الف بیگ

[۱۳۵]

(در باب تسمیۂ پسرش)

مہربان رُو و مہربانی خو! نہال امید کا غیر موسم میں پھل لانا یعنی پیرانہ سالی میں فرزند ارجمند کی پیدائش مبارک ہو خدا کرے کہ یہ ہر طرح فرخی و فرح مندی کا باعث بنے۔

تم نے اس نومولود چاند سے بیٹے کے لیے نام رکھنے کی فرمائش کی ہے اور مجھے اس شائستہ کام کے واسطے موزوں ترین شخص تصور کیا ہے۔

بغیر کسی خاص زحمتِ فکر کے صفحۂ خاطر پر ایک نام' پرتو فگن ہوا ہے اور اس خاص معاملہ میں ایک قطعہ دل سے زبان تک آیا ہے۔ یہاں اُسے زبان قلم کے سپرد کیا جا رہا ہے۔

چوں الف بیگ در کہن سالی
پسرے یافت سر بسر غمزہ
نام او ہمزہ بیگ کرد بلے
الف منحنی بود ہمزہ

(الف بیگ نے پیرانہ سالی میں ایک بیٹا پایا جو سر تا سر غمزہ ہے اس کا نام ہمزہ بیگ رکھا گیا ہاں الف منحنی ہی کو تو ہمزہ کہا جاتا ہے۔) تمہارے یارانِ انجمن تمہیں بہت یاد کرتے ہیں' کبھی اس ویرانہ کی طرف بھی توجہ فرمائی جا سکتی ہے۔

بنام ذوالفقار الدین حیدر خاں

[۱۳۶]

(عرف حسین مرزا)

عنایت فرمائے من! تمہارے ہم عمر و ہم سبق دوست نے ایک مختصر سا رقعہ تمہارے نام بھیجا ہے اور جو خط انھوں نے مجھے لکھا ہے اس میں بھی اس کی بابت یعنی طلب کتاب کے معاملہ میں ابرام روا رکھا ہے۔ میں تمہارے دوست کے اس رقعہ کو تمہیں ارسال کر رہا ہوں، بہتر یہی ہے کہ تم کتاب بھیجدو اور اگر اس میں کوئی عذر ہو تو انھیں جواب ارسال کرو جو تم مجھے لکھو گے وہ انھیں بھیج دیا جائے گا لیکن آج کی ڈاک کا وقت نکل چکا اب یہ کل روانہ ہوگا۔

پرسوں بلکہ اترسوں تمہاری آمد کی خوش خبری مل گئی تھی اس مژدہ نکوئی نے مجھے تپ سے رہائی بخشی آج کا دن بھی گزر گیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ اب بخار ٹوٹ گیا اور اس سے آئندہ کے لیے نجات مل گئی۔ والسلام

بنام گل محمد خاں ناطق مکرانی

[۱۳۷]

ناطق رنگیں نوا کو غالب ہرزہ سرا کا سلام پہنچے، جو، خمار کی جانب سے نشہ کو، سراب کی جانب سے دجلہ کو، "ہیچ" کی طرف سے "ہمہ" کو اور "نیست" کی طرف سے "ہست" کو تسلیم عرض کرنے کے مترادف ہے مہر انگیز نامہ میرے واسطے فرخی کا پیغام لیکر آیا اس "فرخی" کا اندازہ گزارش ناپید و ناپدید ہے میرے پاس خط بھیجنا مردہ کو پھول پیش کرنے کے برابر ہے لاجرم نامۂ عنایت کے ورود کی مسرت کو وہ تازگی کہاں سے میسر آئے گی کہ جو روحیں تن سے نکل چکی ہیں ان کو دوبارہ مُردہ اجسام کی طرف واپس لا سکے اور یہ عمل جہان انسانی کو روحانی تحائف سے شاد کام کر سکے۔

اب میں وہ غالب نہیں ہوں جو متواتر سخن سرائی میں مشغول اور آرایش گفتار کے پیچ و تاب میں مصروف رہتا تھا۔ اب میں وہ غالب بھی نہیں کہ اگر جرعہ نوشی کے لیے مجھے پانی سے بڑھ کر شراب نہیں ملتی تھی تو احساس غم کے باعث خون کے آنسو نکلتے تھے اور غصہ کے باعث لہو کے گھونٹ پیتا تھا بلکہ غالب سوا جسم کا

دل زمانہ کے غموں سے شکستہ اور جس کا جگر محبوبوں کی تیر باری سے چھلنی ہے جس کا حوصلہ احساسِ نامرادی سے بے طرح کمزور و ناتواں ہے اور جس کی آنکھیں آشوبِ چشم سے سرخ ہو جانے کی وجہ سے خون روتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

داغوں کی کثرت سے جس کا تنِ ناتواں سروِ چراغاں سے مشابہ ہے درد کا جسم کے جوڑ جوڑ سے الگ الگ ایک رشتہ ہے۔ ہر پارۂ جگر میں خون جوش مار رہا ہے غرض کہ اب سرِ آغاز بلائے انجام تک آپہنچا ہے برگ ریز کا موسم اور ہنگامۂ خزاں کا ہنگام مدتِ نو ماہ کہ بدن کے واسطے اجزائے عنصری کے باہم پیوستگی کے عمل کے ساتھ پیکرِ جسمانی کی نمود کا وقت ہے، درد مجبوری و اضطراب رنجوری میں گزر گئی اور اس زمانہ میں تن بستر سے اس طرح پیوست رہا کہ جیسے ریشمی کپڑے سے اس پر بنی ہوئی تصویر کبھی جدا نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ شاید میرے دن کی شام ہو گئی اور میرا وقت تمام ہو گیا۔

ناگاہ مجھے اس قلزم خوں سے، جس کا میں شناور تھا ساحل پر لے آئے اور اس حالت میں چھوڑ دیا کہ میں نہ زندہ تھا نہ مردہ، مردار بود، ہر آنکہ او نگشند (جس کو شکار کر کے ذبح نہیں کرتے وہ مردار ہو جاتا ہے)۔ یہاں میرے ہمدموں نے میری ناخواست کے ساتھ میرا نقش تیار کیا ہے اور میرے مجموعۂ گفتار کو جس میں قصیدہ غزل قطعات اور مثنوی بھی شامل ہیں، انطباع کی صورت بخشنے کا ارادہ کیا ہے جیسے طباعت کا یہ سلسلہ پورا ہو گا اس کا ایک نسخہ آپ کو بھیجوں گا۔

اس میں نقدِ سخن کے نقاد نے جس انداز فکر کو راہ دی ہے وہ ان کا حق ہے۔ سب سے پہلے میں ان کی عبارت قدسی افادت کو نقل کرتا ہوں بعد ازاں اس کا جواب تحریر کروں گا مخدوم نے لکھا ہے مثنوی کے ایک شعر میں جو وداع سے متعلق ہے کاتب حروف نے ایک لفظ کو بصورت پنجہ سبز رقم کیا ہے۵ یہ کیا لفظ ہے اگر

خوک شد و پنجہ زدن ساز کرد

واقعتاً یہ "پنجہ" ہے تو خنزیر کے سُم ہوتے ہیں پنجے نہیں ۔ اور اگر سُم اور پنجہ کا اطلاق ایک ہی معنی میں کیا گیا ہے اور شعرا کے نزدیک یہ جائز الاستعمال ہے تو پہلے سے اس کے بارہ میں بتلا دینا چاہیئے تھا تاکہ مجھے بھی اس حقیقت کا علم ہو جاتا غالب خوبیں نفس نے کہا ہے ۔

راست می گویم و یزداں نہ پسند جز راست
حرف نا راست سرودن روش اہرمن ست

(میں سچ کہتا ہوں اور یزدان پاک کو بجز سچائی کچھ اور پسند نہیں حرف باطل زبان پر لانا تو دراصل اہرمن کی روش ہے ۔)

دم ذوالفقار کی تیزی اور گوہر حیدر کرار کے خروغ کی قسم کھاتا ہوں کہ ہرگز خنزیر کے پیروں پر میں نے نظر ہی نہیں کی اگرچہ اس نوع حیوانات کو میں نے ویرانوں اور خرابوں میں دیکھا ضرور ہے لیکن کبھی ژرف نگہی سے کام نہیں لیا میرا خیال یہ تھا خنزیر بھی کتوں اور بلیوں کی طرح کے پیر رکھتا ہے اب آپ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ اس بدجانور کے سُم ہوتے ہیں پنجے نہیں ۔ کاش آپ کا خط کلیات کے چھپنے سے پہلے میری نظر سے گزر جاتا ۔ تاکہ اس مصرع میں کہ ؎ "خوک شد و پنجہ زدن ساز کرد" کی جگہ "خوک شد و بدنفسی ساز کرد" لکھتا ۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے اس معاملہ میں غم زدہ نہ ہونا چاہیئے غلطی ہوئی بھی ہے تو خنزیر کے پاؤں سے متعلق ہوئی ہے انداز سخن سرائی میں نہیں ایک سخنور کے لیے اس سے واقفیت کہ خنزیر کے پیر کیسے ہوتے ہیں، کوئی نقص کی بات نہیں ۔

ہر چند ذوق ہم زبانی مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ قلم و ورق کو میں ہاتھ سے رکھ دوں اور خط کو ختم کر دوں لیکن ضروری بات ختم ہو گئی تو ورق تہہ کر دیا ۔

والسلام

بنام نوروز علی خاں بہادر

[مشتمل بر رو انگیٔ پنج آہنگ] [۱۳۸]

امیدگاہِ نیاز مندان و پناہ گاہ مخلصان

کاشانۂ دل کے لیے کہ خزینۂ اسرار ہے چشم و گوش سے ایک دوسرے کے مقابل دروازے برابر کھلے رہتے ہیں۔ لاجرم آثار حسن میں سے جو شئے نمود پاتی ہے وہ آنکھوں کے راستے دل میں آجاتی ہے لیکن جب اس مہمان قدسی کو جلد از جلد محلۂ دل میں لانا چاہتے ہیں تو گوشِ سماعت کے راستے سے نہاں خانۂ قلب میں پہنچاتے ہیں غرض کہ جہاں بھی کوئی روئے جمیل اور خوئے بے عدیل ہے، اپنے لیے دل اس میں بے پناہ کشش محسوس کرتا ہے اور اس کی پرستاری کے جذبہ سے بے قرار رہتا ہے۔

صورت پرست جب تک اپنی چشم بین سے اُسے نہیں دیکھتے اس سے محبت نہیں کرتے لیکن معنی شناس محض آواز سن کر مبتلائے عشق ہو جاتے ہیں اگر کہیں دیکھ کر دل محبت میں دیا جاتا ہے تو ایسے بھی مقام آتے ہیں جب محض سن کر دل کو پابند وفا کیا جا سکتا ہے میں اپنی اس گرمیٔ اخلاص پر آفریں کہتا ہوں کہ میں سن کر جگر تشنۂ دیدار ہوا ہوں اور اندازِ رسائی پر اپنی قسمت کا سپاس گزار ہوں کہ اس تمام دوری کے باوصف میں دوست کو یاد آتا ہوں۔

میری اس سخن سرائی پر جس کا قابل توجہ ہونا اور بچشم حسن سے میری تعریف کرنا میری گفتار کی کسی خوبی کے باعث نہیں ہے نہ میری قدر و قیمت کے زیر فرمان انھوں نے چاہا کہ شہرۂ کرم درمیان میں نہ ہو تاکہ یاد آوری کے احسان کا بھاری بوجھ سر پر رہے۔ یہ توجہ جو اس طرف فرمائی گئی ہے میں افزوں طلبی کی وجہ سے دل سے یہ کہتا رہا ہوں کہ جب ذوق گفتار کی یہ صورت تھی تو نامہ نگار کو خط کے وسیلے سے یاد کیوں نہ کیا تاکہ میں اپنے جان و دل پر اس کا احسان رکھتا اور اپنے نگارش ناموں کو جلد سے جلد روانہ کرتا۔

اس کے باوجود کہ میں جانتا تھا کہ مجھے درخورِ خطاب نہیں سمجھا گیا اور مجھ ایسے کسی آدمی کی پرسش کا ننگ گوارا نہ تھا پھر بھی میرا دل فرطِ محبت سے جوش میں آگیا اور ذوقِ گفتگو نے اسے خروش پر آمادہ کردیا۔ دوست کی رضاجوئی کی شرط اور اپنی غم خواری کا حق بجالایا اور مجموعۂ نثر نیاز نامہ کے ساتھ کہ اسے میرے بجائے سمجھا جانا چاہیے میں نے مکرمی محمد حسن خاں کو سپرد کیا چونکہ تیز روی کے ساتھ بھی یہ سفر دو ہفتہ میں طے ہوگا لہٰذا سفینۂ نثر کا دو ہفتہ بلکہ بیشتر وہاں پہنچنا مشکل ہے۔

میرا ذوقِ روشناسی ایک مدت سے مجھے اس پر اکسا رہا تھا اس لیے میرے دلِ آزادہ رو نے مجھے اس پر آمادہ کیا کہ ایک دوسرے خط کو انگریزی ڈاک کے سررشتہ سے روانہ کردوں اور کاغذ باد کی طرح پر پرواز بخش دوں تاکہ دوست کو میری مہر و وفا کے بارہ میں کچھ اندازہ ہوجائے کہ وہ اس راز سے ہنوز ناآشنا ہیں کہ جب انھیں وہ بیاض سفینہ اور اس کے ساتھ میرا خط ملے تو بغیر کسی تاخیر ان کا جواب مجھے مل جائے بلکہ اگر مجھ خستہ دل کی رنجوری کو وہ کام فرمائیں تو اس پرزہ کاغذ کا جواب لکھ دینا بھی ان کے لطف و عنایت سے بعید نہیں۔

ہر چند میں نام وروں میں سے نہیں ہوں لیکن پیام لانے والوں سے چھپا ہوا بھی نہیں ہوں۔ ہر بریدِ رسان چونکہ ہر شہر و دیار سے آنے والی میری ڈاک لاتے ہیں اس لیے میرے گھر کا پتہ اور راستہ جانتے ہیں۔ اگر خط بھیجیں اور پتہ میں یہ لکھ دیں کہ یہ مکتوب اسداللہ خاں کو ملے تو یہ کوئی دشوار بات نہ ہوگی کہ یہ خط مجھ نامہ سیاہ تک پہنچ جائے۔ والسلام خیر انجام

ایضاً

[۱۳۹]

فرد

اے بدل نزدیک و دور از دیدہ گفتارم بہ تست
از تو ام بادل بود گفتار، و پندارم بہ تست

(اے کہ تو میرے دل سے نزدیک اور میری آنکھوں سے دور ہے میری گفتگو تجھ سے

ہے. تیرے بارے میں میں اپنے دل سے باتیں کرتا رہتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ میں تجھی سے باتیں کر رہا ہوں۔)

راز آفرینش کے نکتہ شناس اس خیال کے موید ہیں کہ آنکھوں کا کردار دیکھنا ہے اور دل کا وظیفہ محبت کرنا۔ زبان کا عرضِ شوق میں دل کا معاون ہونا بھی دستور فطرت ہے اور خامہ کی طرف سے سفارش راز وہ شیوہ ہے کہ تقویت زبان کا وسیلہ ہے. جب آنکھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں تو وہ دل کو کیا بتائیں اور جب دل اپنا کام نہ کر سکا تو وہ زبان کو کیسے مدد دے کہ وہ گفتار میں آئے اور خامہ زبان کی طرف سے کیا گہر سنجی کرے۔

یہاں تو آنکھوں نے دوست کا دیدار کیا اور دل اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ زبان نے دوست کے ساتھ کبھی باتیں کرنے کی مسرت حاصل نہ کی. لیکن قلم کو وہ اپنا ترجمان اور بیان نگار بنا رہی ہے آنکھوں کو دل پر رشک آتا ہے اور زبان کو خامہ پر کاش میرا دامن زیر سنگ نہ ہوتا اور میرے پاؤں میں بیڑیاں نہ پڑی ہوتیں تو میں اپنے خط سے پہلے ہی دوست تک پہنچ جاتا تاکہ اپنی نارسائی پر غصہ کرنے اور اپنے خط پر حسد کرنے کی صورت پیش ہی نہ آتی. بلکہ یہ کش مکش اور ستیز و آویز جو آنکھوں کو دل اور زبان کو قلم کے ساتھ پیش آرہی ہے اور میان ہی میں سر آئی

اس سے پہلے نواب سیف الدین خاں لکھنؤ سے پہنچے اس مجموعۂ اخلاق کے اشتیاق کی خوشبوئیں مجھ تک پہنچ گئی تھیں اور میرے دل پر ایک افسون ناز پھونک دیا تھا۔ اب کہ مخدومی منشی محمد حسن خاں کے خدام کانپور سے واپس آگئے اور اپنے نفس عنبر شمیم کی ہوائے لطیف کے وسیلے سے اس راز کے پردہ کشا ہوئے کہ خاں صاحب عظیم المناقب نوروز علی خاں بہادر نے اسے اس مقصد کے لیے روانہ کیا ہے کہ جب میں دوبارہ دہلی آؤں تو میں غالب ہرزہ سرا کی پراگندہ تحریروں کو جمع کروں اور اسے بہترین" رہ آورد" سمجھ لوں۔

لاجرم اس یک آوازہ و شہرت کے باعث کہ دو بار ان کی زبان مبارک پر میرا ذکر آیا میں دہر میں بھی نام آور ہوا اور اپنی نگاہ میں بھی میری قدر بڑھ گئی میں مظفر الدولہ

بخانۂ عشق کا وہ تنک جام ہوں کہ صہبائے التفات کے ایک جرعہ سے بھی میری سرشاری اندازے سے کہیں بڑھ جاتی ہے اور میں صنم کدۂ شوق کا وہ پرستار ہوں کہ نگاہِ نیم باز کا ایک اشارہ بھی مجھے اپنے اوپر ناز کرنا سکھا دیتا ہے۔

افسوس! مجھ جیسا ایک انسان جس نے اندوہ بیکسی کو اپنا لیا ہو اور خود کو ناکس و نامراد سمجھ لیا ہو جو دلوں کے دروازے سے نکال دیا گیا ہو اور گمنامی کے گوشہ میں بیٹھا ہو وہ کیہ کیا سکتا ہے۔ اتنی دور بیٹھ کر وہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ کیا لکھے جو نگاہ والا سے گزرنے کے لائق ہو جو کچھ کہ میرے قلم سے نکلتا ہے اور صفحۂ قرطاس پر بکھرتا ہے اس سے تکلفاً ہی کوئی نسخہ تیار ہو سکتا ہے۔

اگر پانی کی پاکیزگی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان تحریروں کا پانی میں پھینکنا جائز نہ ہو تو بے تکلف وہ اس لایق ہیں کہ انھیں آگ میں پھینک دیا جائے۔ خدا جانتا ہے کہ آزادگی کی وجہ سے کہ میں کبھی اس فکر میں مبتلا نہیں ہوا کہ قلم اور روشنائی کی زحمت کشی کو دوبارہ پسند کیا جائے اور میں نے جو کچھ لکھا ہے میں اسے مکرر لکھوں۔ لیکن میرے بھائیوں میں ایک نے میری فرمایش پر نہیں اپنی خواہش پر میری نثری تحریروں کو جمع کرنے میں عمر صرف کی ہے اور چند اوراق میرے اعمال نامے کی طرح سیاہ کیے ہیں۔

ان اوراق کو میں نے اس برادر گرامی قدر سے مانگا اور ایک اچھے کاتب کو اس پر مقرر کیا ہے کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو اس کام کو پورا کر دے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کتاب کا کاغذ رنگین ہوتا اور ان اوراق کے نقش و نگار سنہرے۔ لیکن چونکہ میرے مخدوم پا بہ رکاب اور رو براہ تھے اتنا وقت نہیں تھا کہ رنگ آمیزی اور نقش آرائی کے لیے وفا کر سکے۔ قصّہ مختصر یہ کہ اُسے آپ کی خدمت میں اس طرح بھیج رہا ہوں جیسے کوئی مشتِ خس سنبلستاں میں اور کاغذ کے پھول گلستاں میں ہدیۃً روانہ کرے۔

یہ چوالیس برس تک چراغِ نفس جلانے کا صلہ اور اپنے سرمایۂ عمر کو مفت بیچ ڈالنا ہے جو میں اس دیدہ ور و صاحب دل کے قدموں پر نچھاور کر رہا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ محبت کا تقاضہ کیا ہے اور یہ ہر دو طرف بلکہ تین طرف سے برابر خط و کتابت

کس حد تک مہر افزا ہوتی ہے۔ خدا کرے آپ کا نام نامی آثار نوروزی کی نمود اسرار فروزی کی کشایش۔ شکوۂ نو بہار کے ظہور کا باعث اور روز افزونی دولت کا سبب ہو۔

والسلام مع الاکرام

بنام شیخ بخش الدین مارہروی

[۱۴۰]

خدا کہ ذرہ ذرہ کے رازِ دل سے آگاہ ہے میں براستی گفتار کہتا ہوں کہ میں ایک ذرہ ناچیز سے بھی کمتر ہوں۔ جب سے میں نے آپ کی دل نشیں زبان سے یہ سُنا ہے کہ حضرت العلام مخدوم الانام، برجیس رفعت جناب معلی القاب صاحب عالم مارہروی ایزدِ دانا حضرت والا کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے جن کے وجود مسعود کی فرخی سے مارہرہ کو وہ شرف حاصل ہے کہ اگر بہ مثل شہر بغداد اپنی صورت نوعیہ کو بدل دے اور پیکر انسانی اختیار کرے تو وہ ان کے سر مبارک کے گرد اس طرح تصدق ہو جیسے حاجی کعبۃ اللہ کے گرد طواف کرتے ہیں تو میں اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتا ہوں اور اپنی گفتار کے تئیں خود سپاس گزار ہوتا ہوں کہ اس ذریعہ سے میں ایک اقبال مند انسان کا روشناس ہوں اور ایک صاحب دل کے لیے میرا نام ایک نشان خلوص بنتا ہے۔

اگرچہ میں چند غزلوں کے اشعار اور ایک رباعی پر مشتمل دو ورق اس سے پیشتر روانۂ خدمت کر چکا ہوں لیکن طبیعت اس ہدیہ حقیر پر مطمئن نہ ہوئی۔ میرے مجموعۂ دواوین میں ایک دیوان بڑی کوششوں سے ہاتھ لگ گیا تھا یہ تھا کہ اسے بذریعہ ڈاک روانہ کروں لیکن کارپردازان ڈاک نے اس کا بھیجنا قبول نہ کیا ناچار اسے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں کہ آپ جیسے بھی ممکن ہو اور جس وسیلے سے بھی اس کی رسائی ہو سکے حضرت والا کی خدمت میں روانہ کر دیں اس کرم فرمائی کے بدلے مجھے اپنا شکر گزار تصور فرمائیں۔

والسلام مع الاکرام

بنام میر واحد علی بلگرامی

[۱۴۱]

مصطفوی گوہر، میں کہ یہ سلام بھیج رہا ہوں یہ سمجھیے کہ اس کے پردہ میں خود اس انجمن میں پہنچ رہا ہوں اور عرض کر رہا ہوں کہ اگر تکرارِ تجلی میں روا ہے تو میرا خیال یہ کہتا ہے کہ دوسرا خط بھی ضرور دیدہ افروز ہو گا بارے اُس حرزِ جاں اور رواں افزائے تاب و تواں نے اپنے خجستہ ورود سے نوازا۔ اور رونگٹے رونگٹے میں ایک جان تازہ پیدا کر دی، مبالغہ نہ تصور فرمائیں اگر اس بار بھی یہی دشوار پسندی راہ میں آتی تو پھر مجھ میں رو برا ہی کی خواہش ہی نہ باقی رہتی اور میں اس پر بے حد شرمندہ ہوتا۔ آپ نے سرگزشت بیان فرما کر کارگذاروں کی طرح اپنے اوپر کام آسان کر لیا۔ میں نے اس پر آفریں بھی اور سپاس پزیر ہوا۔

نظر گاہ خداوندی میں کہ صاحب افسر و کلاہ ہیں نظم کا گزرنا اور پیش کش کے وقت رسم تعارف کی خوب صورتی سے ادائیگی اور کہنے سننے کے دوران علاقۂ شناسائی کی خوبیاں زبانِ معجز بیان پر آئیں۔ اس سے بشارتِ ارمغاں کی دستاویز ہاتھ آگئی خدمت فروشی میں اُبرزہ خروشی آزادوں کا دستور نہیں ہے۔

یزدان پاک کو انصاف کے ماسوا کچھ بھی پسند نہیں اور انصاف یہ ہے کہ غالب نے اس باب میں تنہا سعی نہیں کی احترام الدولہ بہادر بھی اس میں شریک غالب ہیں، نہیں نہیں انھوں نے مری طرف سے وہ دستورِ فرزانہ کو پہنچایا اور دستور یگانہ کی جانب سے پھر اس کا بادشاہ فلک بارگاہ کی خدمت میں پیش ہونا۔ (یہ سب مرحلے بھی تو ہیں)

مری خواہش بجز نیکوئی اور کچھ نہیں اور کون ہے جو نیکوئی کو پسند نہیں کرتا اور سچ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ مولانا ظہیر الدین جو دانا دل و دیدہ ور ہیں ہمہ دان و ہمہ بیں ہیں اس ستودہ صفات کو نامۂ نامی تحریر فرمائیں اور کچھ اس طرح لکھیں جو فرزانوں کے انداز نگارش و سلیقۂ گزارش کے مطابق ہو۔ اور اس خط کے ساتھ

اسے میرے پاس روانہ فرمائیں، جو آپ اس نامہ کے جواب میں لکھیں گے۔ اس نظم کا سواد تام۔ جوان دو ورقوں کے ساتھ ہے کہ زنگاہوں کو سیاہ کرتے ہیں بھیجا جا رہا ہے اگر اس لائق نہ ہو کہ مولانا کے خدام کی نظر سے گزرے تو کس نے کہا کہ حکایت کو چھوڑ دیں اور رد کیا گیا ہے اسے خدمت والا میں پیش کریں یہ کسی طرح نامناسب نہ ہو گا۔

بنام مولانا محمد عباس بھوپالی

[۱۴۲]

خدائے بزرگ و برتر کی بیکراں سپاس کہ وہ آفرینندہ جان و جہان ہے۔ جس نے روشن روان پاک کو رہنموئی کے لیے بھیجا اور عالم و اہل عالم کے لیے دستور اتارا۔ جو اس کی الوہی سنت ہے۔ صد در صد درود اس فرستادۂ خداوندی پر جو اس کا آخری فرمان لے کر آیا۔ ان بارہ مردان پر بھی کہ افزوں نمائندہ یزدان پاک کے ہدایت کرنے والے نام کے ساتھ ہمباز ہے جو ہمہ وقت بہم حال ہر ایک کے ساتھ ہے اور بے اندازہ ستایش کا مستوجب ہے، یہ انھیں کے انداز ستایش کی قوت بخشی اور اسی خوئے عجز کا یمن توانائی ہے کہ افسردہ خاطری اور مردہ دلی کے اس زمانہ میں بھی میری طبیعت قلم و قرطاس کی طرف میلان رکھتی ہے۔

غالب سخن گزار کے بہت دوست، کہ وہ ان کا روشناس بھی نہیں، اس کے ویدلے دل کے سیاہ خیمے کے مہمان ہیں۔ اس کی آنکھیں زمانہ کی دو رنگی کا تماشا دیکھتی رہتی ہیں اور انتہائے خوشی میں جس طرح آنسو نکل پڑتے ہیں ایسے ہی وہ مسکراتا اور روتا دکھائی دیتا ہے۔

ایسا کم قدر اور ایسا بلند نام رکھنے والا کہ وہ خود کو فرد ماندگی کے باعث ایک شہر نامرادی کا خاک نشین قرار دیتا ہے دوسرے نامہ و خامہ کی میاں جی گری کے سہارے وہ بہت سے بڑے لوگوں کا (غائبانہ) روشناس ہے۔ میرے سوا اب اس کا دنیا میں اور کون ہو گا۔

ایک مدت ہوئی کہ فارسی زبان میں نثر لکھنا میرے آئین نگارش سے خارج

ہو گیا ہے. تمام تر خط اردو میں لکھے جاتے ہیں خواجۂ روشن گہر فرخ اثر حق پرست حق شناس مولانا محمد عباس ہیں کہ انھوں نے بھی مجھے غائبانہ بزبانِ قلم راہِ سخن واکی ہے اور ازراہِ خلوص بھوپال فرخندہ فال سے یہ فرمان بھیجا ہے کہ غالب فرسودہ رواں انھیں فارسی زبان میں خط لکھے۔

خدایا میں یہ فرمان کیسے بجالاؤں اور کیا خط لکھوں بارے جنبش خامہ نے چند لفظ اپنی کج مج روش کے ساتھ کہ وہ پڑھنے کے لایق ہیں تو ستایش کے لایق ہرگز نہیں ایک ورق پر لکھ دیے تا کہ اس ورق کو تہہ کرکے ملفوف کے سپرد کیا جائے اور کارفرما کو روانہ کر دیا جائے. چشم داشت یہ ہے کہ اس درویش کی طرف سے. برگِ سبز کا تحفہ دستۂ گل کی جگہ پر قبول کر لیا جائے۔ والسلام

بنام نواب عبداللہ خاں بہادر

[۱۴۳]

(صدر الصدور میرٹھ)

بوالاخدمت فلک رفعت نواب ہمایوں خطاب فرخندہ القاب کہ خیر اندیشوں کے قبلۂ حاجات اور درویشانِ راہ کے کعبۂ امید ہیں۔

اسد اللہ نامہ سیاہ کو سرِ مبارک کے طواف اور درِ دولت کی خاک بوسی کی رخصت ارزانی ہو کر پیش گاہ قرب میں باریابی اور عرضہ گاہ قبول میں بندگی کی پیش کش کے دعوے کو شرف پزیرائی میسر آجائے۔

یاد آوری و بندہ پروری کی سپاس گزاریوں کے بعد عرض پرداز ہوں کہ منشور رافت کے ورود نے (کہ فروغ و فرخی کا نشان ہے) آسمان کے روشن سوادوں کو میرے لیے تہنیت گزار اور مجھے شمعِ فروزاں کی طرح چراغِ انجمن بنا دیا۔

اس پرتو التفات کے ساتھ جو میری گزرگاہ حیات کو روشن کیے ہوئے ہے اور زمانہ میں میرے نقدِ سخن کی اس پزیرائی کے بعد اگر میں خود کو ان ذرّوں کا ہم نفس قرار دوں جو مہرِ تاباں کے روشناس ہیں اور ان قطراتِ آب کا ہم چشم خیال کروں

جو "محیط آشنا" ہیں تو یہ کوئی بے محل بات نہ ہوگی۔

خدام والا مقام نے نام آوری کے قصد کے ساتھ غالب بے نوا سے سرانجام قصیدہ کی توقع فرمائی ہے شاید اس فرسودہ دل اور افسردہ خاطر کو جو ہنوز مرا نہیں زندہ تصور فرمایا ہے۔

فرد

گمانِ زیست بود بر منت ز بے دردی
بدستِ مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

(میرے بارہ میں یہ گمان کہ میں ابھی زندہ ہوں میرے ساتھ بڑی بے دردی کا سلوک ہے میں موت کے ہاتھ میں ہوں لیکن یہ صورت حال تیرے گمان سے زیادہ بدتر نہیں ہے۔)

کاش کہ اس کام کی انجام دہی محض دست و بازو کی کوشش سے ممکن ہوتی (جو دوسری طرح کی نقش آرائیوں اور گلکاریوں کے ساتھ ممکن ہے)۔ تو میں خستگی دل وجاں سے چشم پوشی اختیار کرتا اور فرماں پزیری کے انداز سے اس کام کی صورت پزیری میں سعی کرتا۔ کیا کروں اس کا سررشتہ تو دل کے ہاتھ میں ہے جب تک دل اپنے قابو میں نہیں زبان سے سخن سرائی ممکن نہیں۔

دیدہ وران صاحب دل اس بات کو جانتے ہیں کہ دل و دماغ کی کس حد تک ہم آہنگی اور یک جائی ضروری ہے کہ ایسا کوئی نقش صورت پزیر ہو سکے جسے بالغ نظر پسند فرمائیں۔ اس دل کے ساتھ کہ شکستہ اور میرے پہلو میں اس طرح ہے جیسے میرا کوئی دیرینہ دشمن ہو۔ ہرگز ہرگز سخن وری و معنی آفرینی ممکن نہیں۔

ابیات

در پیکرم ز دردِ دریغ ست جان و دل
در بسترم ز خارہ و خارست پود و تار
کاشانۂ مرا در و دیوار شعلہ خیز
ہمسایۂ مرا سر و دستار پُر شرار
چشمم کشودہ اند بکردار ہائے من

زائندہ نا امیدم وازکردہ شرمسار

(میرے پیکر میں درد و داغ کے باعث دل و جان کے ہونے پر دریغ آتا ہے اور میرے بستر میں خار خارِ اندوہ و خلش تار و پود کی جگہ کام آئے ہیں۔)

میرے کاشانہ کے در و دیوار شعلہ خیز ہیں اور میرے ہمسایے کے سر و دستار میں شرارے بھر گئے ہیں۔

میرے دل کی آنکھیں میرے کردار زشت کی طرف کھول دی گئی ہیں میں آیندہ کی طرف سے نا امید ہوں اور جو گزر گیا ہے اس کی طرف سے شرمندہ۔

اگر آپ یہ خیال فرماتے ہیں کہ ان پریشانیوں کے عالم میں بھی میں شعر کہہ سکتا ہوں اور میں یہ خیال کرتا ہوں کہ ایسا ممکن ہے تو پھر میں بندگان سپہر آستاں امیر المسلمین قبلۂ دنیا و دین، سردارِ سلطان نشان نواب محمد سعید خاں بہادر بالقابہ کی مدح و ستائش میں سخن سرائی کیوں نہ کروں تاکہ اس دنیا میں لعل و گہر کا فائدہ مجھے نہ پہنچے تو اس دنیا میں تو دین و ایمان کا کوئی نقصان نہ ہو۔

امید کہ اس بارۂ خاص میں یعنی بہ اعتبار ستایش گری وہ نظم میں ہو یا نثر میں اس مکتوب نگار کو اموات میں شمار کریں اور سلامتی ایمان کی دعا میں کہ وہی انجام کی خوبی و خجستگی ہے یاد فرماتے رہیں دولت و اقبال روز افزوں ہو۔

بنام منشی جواہر سنگھ

[۱۴۴]

آج میں محبت کی رگوں میں دوڑنے پھرنے والے خون کی گرمی کے ساتھ (جو دل سے چل کر انامل تک پہنچتی ہے) قلم اٹھا رہا ہوں تاکہ انگلیوں کی جنبش خامہ کو رفتار عطا کرے اور قلم کی روش و رفتار سے میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے دلی احوال کو روئے ورق پر ثبت کردوں اور تم اس کے ذریعہ حقیقت حال سے باخبر ہو جاؤ اور یہ معلوم کرلو کہ یکے بعد دیگرے تمہارے خطوط پہنچے اور ان کے جوابات بھی تمہارے والد بزرگوار کو پیہم بھیجے جاتے رہے۔

یہ نامہ کہ میں اس وقت لکھ رہا ہوں اور بوسیدہ ڈاک تمہیں بھیجنا چاہتا ہوں تمہارے دو آخری صحیفوں کا جواب ہے۔ ان میں سے ایک ۱۲ر نومبر اور دوسرا ۲۶ر نومبر کا تحریر کردہ ہے یہ دونوں اپنے اپنے وقت پر مجھے مل گئے تھے۔ پہلا خط شوقیہ تھا اس میں کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔ دوسرے مکتوب کا جواب یہ ہے کہ خوش نہاد و اقبال نشان مرزا عباس کا رقعہ پہنچا (خدا انھیں لمبی عمر عطا فرمائے) اور باعث شادمانی ہو۔ ان کا حال احوال ان کے بزرگوں سے بھی کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اس خوشی میں شریک ہو سکیں اگر مرزا عباس ہنوز وزیر آباد نہ پہنچے ہوں تو میری دعا اور ان کے بزرگوں کی بہت ساری دعائیں ان تک پہنچا دیں اور یہ خط انھیں دکھلا دیں۔ تاکہ وہ اپنے خط کا جواب اس کی صورت میں پا جائیں۔

دوسرا خط جو تمہارے والد شفیق بزرگوار رائے چھجمل سلمہٗ کے نام تھا تمہارے خط کے ورود کے دن ہی ان کے نام بھیج دیا گیا تھا۔

شام کے وقت وہ میرے پاس آئے اور ہیرا سنگھ طول عمرہٗ کو اپنے ساتھ لائے۔ تم نے جو خط میرے نام لکھا تھا وہ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی میں نے چاک کر دیا تھا۔ جب انھوں نے اُسے دیکھنا چاہا تو جو کچھ اس میں میں نے دیکھا تھا اور میرے ذہن میں تھا وہ میں نے ان کو بتلا دیا۔

دوسرے روز انھوں نے ایک ورق تمہارے خط کے جواب میں لکھ کر مجھے بھیج دیا اب میں اسے اس خط کے ساتھ لپیٹ کر بسیل ڈاک تمہیں بھیج رہا ہوں۔ اس میں اس وقت جو ہنگامے بپا ہیں ان کے شیوع کے باعث میں تمہاری اور مرزا عباس کی طرف سے پریشان ہوں یزدان پاک تمہیں اور انھیں اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔

تمہیں یاد ہوگا کہ میرے پاس بھیڑ کی پوستین سے بنی ہوئی ایک کلاہ تھی۔ اُسے کیڑوں نے کھا لیا اور میرا سر بے کلاہ رہ گیا۔ اگرچہ میں کلاہ کا جویا ہوں اور اس کے ساتھ میں ابریشمی لنگی کی فکر میں ہوں جو پشاور و ملتان میں بنتی ہے اور وہاں

کے بڑے لوگ اسے اپنے سر سے باندھتے ہیں لیکن وہ لنگی ایسے شوخ رنگ نہ رکھتی ہو جو نوجوانوں ہی کو بھجتے ہیں اس کا حاشیہ سرخ رنگ کا نہ ہوا سی کے ساتھ اس کی پرداز اور انداز زیبائی بھی عمدہ ہو تار ہائے زر وسیم کو اس میں استعمال نہ کیا گیا ہو اور سیاہ، سبز، زرد اور نیلا ریشم اس کی بناوٹ میں صرف کیا گیا ہو گمان غالب ہے کہ اس دیار میں یہ متاع بہ آسانی دستیاب ہو جاتی ہو گی۔ تم اسے تلاش کرو اور خرید کر بذریعہ ڈاک مجھے بھیج دو اور اس کی قیمت لکھ دو جب تک تم اس کی قیمت نہ لو گے میں اُسے قبول نہ کروں گا ارمغاں تو وہ ہوتا ہے جو بغیر طلب کے بھیجا جائے اور جو منگایا جاتا ہے وہ ہدیہ نہیں ہوتا۔

میری اس گفتگو کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں تمہاری طرف سے کوئی تحفہ قبول نہ کروں گا نہیں نہیں بات صرف یہ ہے کہ لنگی کا تو میں خواستگار ہوں جو میری طلب وخواہش کے بغیر ہو گا اُسے ضرور قبول کروں گا بہر حال لنگی کی روانگی اور قیمت کی تحریر میں کسی تکلیف وتکلف کو راہ نہ دیں اور میرا سلام میرے شوقِ تمام کے ساتھ میرے مشفق و مولا مولوی رجب علی خاں بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پہنچا دیں والدعا

نگاشتہ صبح جمعہ یکم دسمبر سنہ ۱۸۴۸ء (مطابق) چہارم محرم سنہ ۱۲۶۳ھ

ایضاً
[۱۴۵]

دودمان مردمی کے چشم وچراغ اور مردمک دیدۂ غالب۔ منشی جواہر سنگھ جوہر ایزد پاک تمہیں افزونیٔ دولت ارزانی فرمائے۔ ایک زمانہ بیت گیا کہ تم نے ہمیں یاد نہیں کیا۔ اور ہم ہیں کہ خود کو اس خبر فرحت اثر کے زلال ہی سے تسکین دے لیتے ہیں جو تم سے متعلق رائے چھجمل کے گرامی نامے کے ایک گوشہ میں ہوتی ہے۔

امید کہ تم نے اس وقت تک مولوی اکبر علی کا وہ کام کر دیا ہو گا۔ جس کے بارہ میں کئی بار تمہیں لکھا جا چکا ہے اور اب لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہم نے تمہیں یہ لکھ دیا

کہ انھیں ہماری جگہ سمجھو اور ہم بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ تم نے ایسا ہی سمجھا بھی ہوگا اس قلمرو میں تمہیں مالک و مختار بنا دیا گیا ہے۔

ایک اور بزرگ ہیں جنھیں بہر حال گرامی قدر سمجھنا چاہیے اور ان کے ساتھ جس حد تک وقت و حالات کے مطابق نیکی کرنا ممکن ہو وہ ضرور کی جائے ان بزرگ کا نام مفتی غلام حیدر ہے یہ ایک یتیم مرزبان زادہ کے استاد ہیں باقی ان کے حالات و کمالات کے باب میں میر اکبر علی صاحب سے پوچھا جا سکتا ہے۔

سلاطین چغتائیہ کے سلسلہ میں روزنامہ روداد کا مسودہ ہیرا سنگھ کے بدست روانہ کیا جا چکا ہے لیکن اس کے پہنچنے سے متعلق ہنوز کوئی پتہ نشان نہیں اگر وہ مل گیا ہو تو لکھو نہیں تو ہیرا سنگھ سے پوچھو کہ آخر کیا ہوا۔

والدعا جمعہ یازدھم ماہ جون ۱۸۵۲ء

ایضاً

[۱۴۹]

جان من تمہارے خط کو آئے ہوئے کافی دن ہو گئے کوئی بات جواب طلب نہ تھی ورنہ ان سیاہ دلتوں میں مکتوب نگاری سے میں دریغ نہ کرتا۔

روز عید بلکہ شب عید سے بادشاہ کی طبیعت ماندی ہے آج کے دن تک کہ یک شنبہ بست و سوم ماہ شوال ہے وہی بخار کی شدت، ہچکیوں کا عارضہ اور اسہال کی تکلیف چل رہی ہے دیکھیے کیا ہوتا ہے اور میں جو اس بادشاہ بیمار کے سایہ عاطفت میں بیٹھا ہوں مجھ پر کیا گزرتی ہے قصیدہ تہنیت عید بھی نہیں پڑھا جا سکتا چھپنے کی نوبت کہاں آئے۔

ہیرا سنگھ تمہارا فرمان بجالاتے ہوئے زین و دستام بنانے کی فکر میں ہے اس کی بچکانہ باتیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ کہتا ہے کہ میرا سرمایہ کہ وہ بھی بڑے بھائی کا عطیہ ہے دس اور دو بارہ روپے سے زیادہ نہیں اور زین بنانے کے اخراجات اس سے زیادہ ہوں گے میں قرض لے لوں گا لیکن جب ماہ شوال ختم ہوگا تو آموزگارگی اجرت میں

کہاں سے دوں گا۔

میں نے کہا جب زین بن جائیگی تو فرد حساب بھیجدینا تمہارا زر مندرجہ اور اس کے ماسوا جو معاوضہ مقرر ہے وہ تمہیں مل جائے گا۔

از اسد اللہ

بنام نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر تخلص شفق

[۱۴۷]

میں یزدانِ پاک کی بے نیازیوں کا کہ وجودِ مطلق ہے، ثنا خواں ہوں جس نے "ارنی۔ گوئے طور" کو "لن ترانی" کے ترانے نوازا" ق۔ نے اس آرزو مند تمنائے دید" کے زمزمہ کو اس پر بھی فراموش نہ کیا اور آوازہ "دور باش" سے کوئی تنبیہ قبول نہ کی۔ تو "خر موسیٰ صاعقا" کے بخیۂ تشدید سے لب گفتار کو سی دیا اور طوافِ شعلہ کی غرض سے بالِ تپش کو جنبش دینے والے پروانہ کو اسی آگ میں جلا دیا گیا۔

ذرہ ناچیز کہ پیراہن ہستی قبول کرنے والوں میں سب سے کم قدر ہے اور میں کہ ذرۂ ناچیز سے بھی کم تر ہوں۔ اب جس طرح طلوعِ سحر کے وقت آفتابِ درخشاں کی تابناک کرنیں ذرۂ ناچیز کو اپنے حلقۂ نور میں سمیٹ لیتی ہیں اسی طرح نوابِ قدسی خطاب اردونق افزائے سپہر انور الدولہ شفق (غرض کہ بہر صورت عینِ مہر) کے عطوفت نامہ نے (جسے صبح بہار ہنگامہ کہنا چاہیے) اپنے ورودِ مسعود کی صورت میں ناگاہ مجھے اپنے حصارِ نور میں لے لیا۔

اگر اس دیدہ افروزی و فروغ اندوزی کے باعث" داغ ہمچشمی ذرہ کا دعوے زار ہوں کہ وہ بھی وجہ جگر گدازی ہے تو خانم بدہان ید بیضا کے خداوند سے زیادہ بلند نام ہو جاؤں کہ میں اس "ارزش" میں خود کو اس سرچشمۂ نور سے قریب تر محسوس کرتا ہوں اور بے ارادہ میرے لبوں پر یہ شعر نوا سنجی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

آیدہ چشم، روشنیٔ ذرہ آفتاب

بمژہ بر زمیں کر طرح کنی نقش پائے را

مری نگاہوں میں ذرہ کی روشنی بھی آفتاب کی درخشانی سے کم نہیں ہوتی جہاں میں زمین پر تیرے نقشِ قدم کو روشنیاں بکھراتا ہے دیکھتا ہوں۔

یہ ذرہ و آفتاب کی گفتگو پیش کش کا ایک انداز ہے کہ گوہر بیں تماشے کی ورق کشائی اس کے طرفِ عنوان پرستاروں کے گچھے کے گچھے نچھاور کرتی نظر آئی یہ ایک ایسا نگارستان معنی ہے کہ میں اس کے تماشے کے واسطے جگنوؤں کو اس لیے دعوت دیتا ہوں کہ رشک سے ان کا دل خون ہو جائے۔

خدا اسے چشم بد سے دور رکھے اور حسد کرنے والوں کی آنکھیں بے نور ہوں ان زرد مخمسوں میں مجھے یہ کہنے دیجئے کہ موتی پروئے گئے ہیں اور اس غزل میں جو فکر فرمائی ہے — وہ نقش آرائی کی نمی ہے کہ اس کی نظر فریبی کے مقابلہ میں مانی کا نقشِ ارژنگ ایک برگِ ذرم اور کارنامۂ بہزاد ایک تقویم پارینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان اوراقِ مصور کا جہاں بانِ دارا دربان کی نظر گاہ ہمایوں سے گزرنا اور اس ضمن میں مزید کچھ باتیں۔ میرے امید گاہ ارسطو جاہ نواب معظم الالقاب احترام الدولہ مشفقی حافظ نظام کے مرقع نگار قلم کی زبانی معلوم ہونگی۔ سخنور معنی پیوند ادیب فرہ مند ہمزبان شفق مولوی سید امجد علی قلق کے خامۂ صورت نگار کی بلند آہنگی کے باب میں کیا کہوں کہ وہ لفظ بے جان کو ارواح تازہ بخشنے والی آئنہ خیال کو جلا دینے والی اور نفسِ باد سحر کی طرح فرخی و فیروزی کا مژدہ سنانے والی ہے جس سے پژمردہ بلکہ مردہ دلوں کو نئی زندگی اور تازگی و توانائی کی نوید ملتی ہے۔

انصاف بالائے طاعت ہے لفظی صنائعی میں یہ اپنے پیش رووں سے گوئے سبقت لے گئے ہیں اور معنی نگاری کو انھوں نے ایک نیا عالم رنگ و بو عطا کیا ہے جاوداں رہیں کہ وہ ہندوستاں کے لیے سرمایہ ناز ہیں۔

ستایش گری و سپاس نگاری کی صورت میں نغمہ سرائی کے بعد میں اپنی گفتار کی خوں فشانیوں کی طرف آتا ہوں جو میری رگ کلک سے اشک لالہ گوں کی

مانندِ صفحۂ قرطاس پر ٹپک رہی ہے تاکہ دیدہ ور نزد و دور سے یہ جان لیں کہ میرے دیدہ و مژگاں خوں فشاں ہیں اور میرا دل دردمند فریاد کناں۔

ایک زمانہ ہو گیا کہ میں داستاں سرائی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا یہ شہریارِ سلیمان پیش کار (شاہِ دہلی) کی رضاجوئی کے باعث ہے کہ میں گاہ گاہ ریختہ گوئی کی طرف مایل ہوتا ہوں خاص طور پر یہ ملکۂ عالیہ (کہ ملکہ سبا بلقیس جس کی کنیزوں میں ہے) کی فرمایش کی تعمیل کے سبب (صورت پذیر) ہوتا ہے۔ اس ردیف ناروا کے ساتھ ورنہ مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

مگر مقطعِ غزل میں میں نے ایک نعرۂ مستانہ کے طور پر "ہو" کی ہوگی کہ اس شخص نے اپنے اس کمال کے زعم میں جو دراصل اسے حاصل ہی نہ تھا، یہ خیال کیا کہ میرا روئے سخن اس کی طرف ہے ایک غزل کے مقطع میں ستیزہ کاری و تقاضۂ کج کے انداز میں گام فرسائی کی اور اس لہجہ میں بات کی گویا وہ مجھے اس کا جواب دے رہا ہے، تو میں نے سیہ مستی کے عالم میں یہ بو تجربے کہ میرے خامۂ بے پروا خرام کے رشحات ہیں محفلِ سخن میں پیش کیے۔

یہ مصرع، "انچہ در گفتار فخر تست آں ننگِ من ست" اسی سے تعلق رکھتا ہے میں نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا اور اس طرح قطعِ سخن کو دلیلِ قطعِ اغیار سمجھا۔

مجھ پر افسوس ہے کہ مجھے زیاں زدہ و سوختہ ساماں بنا کر پیدا کیا گیا نہ مجھے اپنے پیش روانِ خاندان کی طرح مثلِ سلطان سنجر کلاہ و کمر سے نوازا گیا اور نہ صاحبانِ دانش و فرہنگ کی طرح مانندِ بوعلی سینا دولتِ علم و ہنر عطا کی گئی۔

جیسا کہ میں نے کہا میں تو فقیر ہوں اور آزادانہ رہ زیست طے کر رہا ہوں۔ ذوقِ سخن نے کہ ازل سے میرے کردار کا حصہ تھا میری رہزنی کی اور مجھے اس پر فریفتہ کیا کہ آئینۂ بیان کو جلا بخشنا اور اس میں صورتِ معنی کو جلوہ گر کر کے دکھانا بھی ایک بڑا کام ہے۔ لشکر آرائی و دانش وری تو خیر مجھ میں ہے ہی نہیں صوفی گری چھوڑ اور سخن آرائی اختیار کر — ناچار میں نے یہی کیا اور بحرِ سخن میں کہ وہ بھی سرتاسر سراب ہے سفینہ رانی

کی میرا قلم میرا علم بن گیا اور آباواجداد کے تیرِ شکستہ نے میں نے اپنا خامۂ سخن ہنگامہ تراش لیا۔

دنیا میں میرا کوئی کاروروزگار نہیں ہیں نے اس سے کبھی کوئی واسطہ بھی نہیں رکھا۔ اپنی زندگی میں تیرہ روزی کے سبب جو میں نے کارہائے عجیب کیے کسی نے اُن کی قدرومعیار کو نہیں پہچانا۔ اب اختتامِ سفر کی منزل ہے۔ دانت گر رہے ہیں کان بہرے ہوتے جا رہے ہیں تمام سر سفید ہو گیا ہے اور چہرے پر جھریاں بکھر گئی ہیں ہاتھوں میں کپکپی پیدا ہو گئی ہے اور پیر گویا رکاب میں ہیں۔

میرے سر میں جو سودا سمایا تھا اس میں اب "جان کندنی" اور "نان خوردنی" کا شغل باقی ہے اور بس، میں نے یہاں جو بویا اب وہاں اُس کے کاٹنے کا وقت آ رہا ہے۔

فرد

دوش برمن عرض کردند آنچہ در کونین بود
زاں ہمہ کالائے رنگا رنگ دل برداشتم

(کل وہ سب کچھ میرے سامنے پیش کیا گیا جو دونوں جہانوں میں ہے میں نے اس رنگا رنگ سامان میں سے صرف دل اٹھا لیا اور باقی سب چھوڑ دیا۔)

دل سودا زدۂ اندوہ و ملال سے گھرا ہوا ہے اور سازِ رباعی نے اس سے باہر نکلنے کی غرض سے آہنگ شعر کی یہ راہ نکالی ہے۔ اس آہنگ کی تیز دستی تارِ رگِ جاں پر اس طرح زخمہ زنی کرتی ہے اور میری روح مایل بفغاں ہو جاتی ہے

اے کردہ بہ آرایشِ گفتار بسیج
در زلفِ سخن کشودہ راہِ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش می دانی
ذاتیست "بسیط و منبسط" دیگر ہیچ

(اے کہ تو نے آرایشِ گفتار کی راہ کو اپنایا ہے اور سخن کی زلف در سا میں ہزار پیچ و خم پیدا کیے ہیں۔ عالم کہ جسے تو ایک "چیز دیگر" سمجھتا ہے وہ تمام تر ذاتِ واحد ہے کہ

بسیط بھی ہے اور مبسط بھی۔ اور اس کے ماسوا یہاں کچھ اور ہے ہی نہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ اس مسرت افزا صحیفہ میں کہ جبینِ قلم اس کے جواب میں سجدہ ریزیاں کرتی ہے خواجہ ظہیر الدین خاں کا نام نامی و ذکر گرامی کہیں نہیں آیا۔ اگرچہ میں شکوہ سنج نہیں ہوں لیکن یہ خیال نہ کیا جائے کہ مجھ پر ستم نہیں ہوا۔

جب سخن ہائے گفتنی کہہ دی گئیں اور گرد اندوہ سواد جاں سے دور ہو گئی آصف جم نشاں صاحب السیف والقلم حضرت وزیر اعظم کے دسارۂ جاہ وجلال کو اپنی نگاہ میں رکھ کر اور اس آستان عالی کا تصوّر کرکے میں زمین خدمت کو بوسہ دے رہا ہوں اور امید کہ میری زمیں بوسی کو حضرت فلک رفعت کی بارگاہ تک پہنچا دیا جائے گا۔

دوسرے اس ستودۂ نامور کو میرا سلام پہنچا دیجیے اور قبلۂ دیدہ و دل نواب سید محمد خاں بہادر کی پیش گاہ والا میں میری بندگی عرض کیجیے، اسی طرح مکرمی مولانا سید امجد علی کے لیے ارمغانِ نیاز مندی، اور مشفقی حافظ نظام الدین صاحب کے لیے نذرانۂ سلام عرض کہ میرے اس نیاز نامہ۔ اس متاع رہ آورد کو رسائیاں ارزانی فرمائی جائیں۔

والسلام بالوف احترام

ایضاً

[۱۴۸]

سبحان اللہ ہر پردہ ساز کو جو نوائے راز اور ہر گوشۂ دل کو جو ادائے اہتزاز بخشی گئی ہے وہی ہے جو قلم کو نازِ رفتار اور زبان کو اندازِ گفتار کے آداب سکھاتی ہے وہ یہی "سخن" تو ہے جس میں کوئی گنجایشِ سخن نہیں۔

اس وجہ سے دیدہ وری اصلِ دادگری ہے جو گوہر سخن کی گراں مائیگی کو سمجھتا ہے وہ اسے امیر عالی پایہ یگانہ فرزانہ نگاہ کی بارگاہ والا میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ سخن کو کسبِ شرف اور افزونی ارزش کے واسطے یہ روش خاص اپنانا ضروری ہے کہ وہ خود کو اس کے دامن دولت کے وابستگان میں شمار کرے۔

قضا و قدر کے دفتر سے سخن کی دولتِ شایستہ کا سکّہ "رواج" اپنے طرازِ دوام کے ساتھ نواب ہمایوں القاب کے نام نامی سے مزیّن ہے جسے نقشِ فرماں روائی کہنا چاہیے کہ وہ جاہ مندانِ روزگار کے امید گاہ اور دودمانِ اہلِ سعادت کے چشم و چراغ ہیں انھیں بختِ خوش کی پیش نشینی حاصل ہے جسے ازلی بخشائشوں میں شمار کرنا چاہیے۔ توانائی خرد کہ بہترین ودیعتِ خداوندی ہے اُن کی قلمروِ اندیشہ کے زیرِ نگیں ہے۔ اور گوہرِ معنی کا خزینہ، اُن کے زیبِ آستیں۔

سچ یہ ہے کہ وہ کشورِ سخن کے داد پیشہ فرماں روا ہیں اور اس کریمانہ انداز کے ساتھ سوچتے ہیں کہ اپنی لطف فرمائیوں میں انھوں نے غالبِ راہ نشیں کو بھی فراموش نہیں کیا اور اس خرابہ میں بھی اسے تشنہ کام نہ رکھا جہاں اس کا نشیمن ہے اور ایک ایسا سفینۂ نظم و نثر اس کی طرف بصورت ارمغاں روانہ فرمایا کہ جس کے حروف و الفاظ کے دائروں کو تسنیم و کوثر کے "اعیانِ ثابتہ" کہا جا سکتا ہے۔

اس عجوبہ کارِ نظم و نثر کی ستایش میں وہی کچھ کہہ سکتا ہے جو کلیم سے خراجِ نطق وصول کر سکتا ہو اور مسیح کے لیے باعثِ رشک ہو، اس معرض میں لب کشائی اُسی کو سزاوار ہے جو سخن کے انداز و ادا کا رمز شناس ہو جو اپنی تمام چشم داشت کے ساتھ بلند نامی و کام جوئی کا تصوّر ستایش گری و آداب گزاری کی دستور شناسی سے وابستہ رکھتا ہو۔ یعنی استواریِ پیوند رسائی انداز دل آویزی آہنگ، شیوہ شیوائی زبان و خوش رنگی، اسلوب کو کیسے سراہا جائے اور کس زبان میں سراہا جائے۔

خاص طور پر آپ نے اس آشفتہ نوا کی غزل پر جو مخمس کہا ہے میں اس سے ڈرتا ہوں کہ لوگ اس سحرِ نو آئین کے باب میں میری اس بات کو خوشامد پر محمول کریں گے ورنہ میں جانتا ہوں اور میرا دل کہ کیا کچھ کہا جا سکتا ہے اور بات کہاں سے کہاں پہنچ سکتی ہے۔

فرد

عاجزم من چوں در تمنائے دوست، بار تکلّم چہ کار،
میر دم از جائے، تا گیر د عطارد جائے من

دیں اگر دوست کی ثنا خوانی میں عاجز بیان ہوں تو مجھے رشک سے کیا کام. میں اپنی کرسی چھوڑ رہا ہوں تاکہ عطارد میری جگہ لیلے۔)

نواب خدایگاں و قبلۂ دوجہاں کے منشورِ عنایت کے ورود نے دل کو جلا اور نظر کو صفا بخشی۔ تا تا چشم روشن نے دیدہ و دل کو ایک دوسرے سے الگ نہ رکھا۔ نظارہ گواہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ قطرے محیط آسا ہیں اور ذرے آفتاب انداز اس کارنامہ کی عجوبگی نے، سچ یہ ہے کہ میرے دیدہ و دل کو بے طرح شورش میں مبتلا کر دیا۔ افزونی انبساط کے باعث میرا وجود پیرہن میں اور میری جان تن میں نہیں سما سکتی۔ مخفی نہ رہے کہ اس نامہ نگار کے اجداد ترک تھے اور افراسیاب و پشنگ کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جب میرے دادا نے ترکستان سے ہند کی طرف رخ کیا تو نواب معین الملک کے دور میں لاہور کو اپنا مرکز اور آرامش گاہ قرار دیا اور اس اعتبار سے کہ یہ دودمانِ والا اور وہ خاندان ایک ہی ہے —— میں خود کو اس دولتِ ابد پیوند کا ازلی ناز پروردہ تصور کرتا ہوں۔

چونکہ میری عادت ہے اور اس نگارستانِ سحر آئین، یعنی آپ کے مجموعہ کی سیر کرنے والے کے لب خوں چکاں پر یہ بات آرہی ہے کہ میں اپنے احباب و اخوان کو کہ میرے ہم سر و ہم چشم ہیں آفرین کہوں۔

اگر میں نے اپنے آقائے ولی نعمت کی مدح میں چند شعر کہے ہیں تو وہ روشناسی و عرضِ اخلاص کا ذریعہ بھی تو بن سکتے ہیں دریوزہ گری و مدد خواہی کے واسطے کاسۂ گدائی نہیں۔

فرد

در فنِ سخن معتقدِ حسنِ قبولم

بر چشم نویسند براتِ صلہ ما

[میں سخن گوئی کے فن میں حسنِ قبول کا قائل ہوں. ہمارے لیے صلہ دجزا کی نگارش تو اوراقِ چشم و نگاہ پر مرتسم کی گئی ہے۔]

ایزد تعالیٰ بختِ ازل آورد کو نعمتِ ابد پیوند بنائے۔

ایضاً

[۱۴۹]

فرد

اگر نہ بہر من از بہر خود عزیزم دار
کہ بندہ خوبی او خوبی خداوند است

(میرے لیے نہ سہی تو اپنے واسطے مجھے عزیز رکھ کہ بندہ میں جو بھی خوبی ہوتی ہے وہ دراصل اس کے آقا و خداوند ہی کی خوبی کا عکس ہوتا ہے۔)

اہلِ اسلام کے امید گاہ، فرزانوں کے واسطے جائے پناہ سے [کہ میرا سجدۂ نیاز اس سنگِ آستاں کے لیے باعث ننگ ہے] راہ سخن وا کرنا آسان نہیں، کاش کہ میں خورشید و ماہ ہوتا یا بختِ خوش و دولتِ جاوید، تاکہ وہ ناگزیر طور پر مجھے اپنی بندگی میں قبول فرمالیتے یا پھر مجھے خواجۂ عالی وقار کی طرف سے غائبانہ توجہ فرمائی کا خیال ہوتا کہ میں یہ کہہ سکتا کہ پرسشِ زبانی اگر نہیں ہے نہ ہو، جب وہ پوچھتے ہی نہیں تو میں کیا کہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ چون و چرا کے ساتھ لب کشائی کرنا آئینِ بندگی نہیں۔

ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ اگر مجھے اجازت ہو تو میں پوچھوں کہ اس دل کو، جو شکستگی کے آثار اور خستگی کے آزار سے بھرا ہے اور یہ زبان، جو گناہِ ناکردہ کے اعتذار سے بھرپور ہے آخر میں کہاں لے جاؤں۔ افسوس عالمِ بیخودی میں یہ کیا بات مری زبان نے نکل گئی جس نے میری جبینِ نیاز کو گھِسنے کے عمل کے بغیر داغ سے آراستہ کر دیا کوئی گناہ تو ضرور ہے یہ الگ بات ہے کہ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے اور میں اسے اپنی سادہ لوحی سے، (شوخ چشمی سے نہیں) اپنی بے گناہی سے تعبیر کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس بندۂ بے خرد و بے خود کو بخشش فرمائیں گے جو یہ چاہتا ہے کہ خوش سخنی سے کام نکال لے اور زور آزمائی کے بغیر خواجۂ عالی وقار کے دل میں جگہ پیدا کرے۔ اگر کوئی گناہ ہے تو اس پر ورنہ جیسا کہ میں اپنی بے گناہی کا معترف ہوں، مجھے معاف فرمادیں۔

نواب قدسی خطاب سید محمد خاں کی بارگاہ میں بندگی خواجہ ظہیرالدین خاں بہادر کی نظرگاہ میں دیدار طلبیوں کی طرح تمنائے دیدار میر امجد علی صاحب کی جناب میں نذرانۂ نیاز و عقیدت۔ میر نادر حسین خاں ہاشمی کی خدمت والا میں مشتاقانہ سلام اور حافظ نظام الدین صاحب کے حضور میں ناامیدوں کی طرح شکوۂ فراموشی۔

اب دیکھنا ہے کہ اس طرف سے کیا عنایت اور اس طرف سے کیا مہربانی ہوتی ہے۔ بخت ہوا خواہ دولت پرستار اور غالب بے نوا پرسش کا سزاوار ہو۔ نگاشتہ ورواں داشتہ سہ شنبہ ہفتم محرم ۔ ۷ ۱۲ ھ و یازدہم اکتوبر ۱۸۵۰ء

ایضاً

[۱۵۰]

فرد

ازاں مجموعۂ خوبی بوصلم کام دل جستن

بداں ماند کہ مورے خرمنے را در کمیں باشد

(اس سرمایۂ خوبی سے وصل میں، میرا کام دل کی جستجو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کمزور چیونٹی کا طلب گار خرمن ہونا اور اس کے لیے گھات لگانا)

نواب خجستہ اختر و فرزانہ روش کے نام نامی پر خط لکھنا قرطاس و قلم پر احسان کرنے اور خود اپنے لیے افزونی دولت کی مژدہ یابی کے مترادف ہے۔ نامۂ ہمایوں پہنچا جس کے سواد تحریر اور روشن نقطوں کو ہمائے اوجِ سعادت کے واسطے دانۂ دوام کہنا چاہیے۔ میں کہ اس خوش بختی اور جاہ مندی کا ازروئے آرزش سزاوار نہیں، اپنی اس خوبی تقدیر پر ناز نہ کروں تو لاجرم میں اہرمن پرست و کافر ماجرا قرار پاؤں۔

جناب والا کہ روشنیوں کو پھیلاتے والے سورج کی مثال ہیں اور مہر درخشاں کی طرح دور و نزدیک کے واسطے بخشش و نوازش کا سرچشمہ ہیں ورنہ اس فقیر کا غربت کدہ کہ تنگی و تاریکی میں دل مغموم کے نقطۂ سویدا سے مشابہت رکھتا ہے اس لایق اور اس عنایت و بخشش کا سزاوار کہاں کہ آفتاب عالم تاب اس گوشۂ تاریک میں اپنی ضیاباریوں اور نور افشانیوں کا بے محابا مظاہرہ و نمایش کرے۔

آپ اس غالب خستہ کو سراہتے ہیں، جو روزی جس کا مقدر ہے اور رسوائیوں کے باعث کوئی اس کا نام لینا تک پسند نہیں کرتا، ستایش خود سپاس گزار کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ کسی نکوہیدہ کردار کو سراہنا اپنی ستودہ منشی اور خوش کرداری کی نشان دہی کرنا ہے۔

ایضاً

[۱۵]

باخیل موریسی از رہ خوش است فال

قاصد بگو کز آں لبِ نوشیں پیام چیست

[چیونٹیوں کے کارواں کے ساتھ تم اس راہ سے گزر کر آرہے ہو یہ مبارک فال ہے، لیکن اے قاصد یہ بتلا کہ اس لبِ شیریں کی طرف سے کیا پیام ہے؟]

سورج چمکتا ہے تو ذرے اس سے فروغ پذیر ہوتے ہیں، بادل برستا ہے تو برگ وکاہ کو اس سے بالیدگی میسر آتی ہے۔ تو آپ والا القاب کی شادمانی و کامرانی کو دوام دولت کی نشانیاں سمجھنا چاہیے جو پرتو افگنی میں مہرِ تمثال اور رایگاں بخشی میں ابرِ گہربار کی مثال ہیں ان کی مجھ پر نگاہِ التفات اسی لطف و عنایت کا نمونہ ہے۔

ذرہ مہرِ زرفشاں کی تعریف کرنے تو کس طرح اور پرکاہ ابرِ دُربار کے لیے حرفِ تحسین و آفرین کہے بھی تو کیسے، میں کہ بے مقداری میں ذرہ سے بھی کم ہوں اور بے وقعتی میں پرکاہ سے بھی کچھ زیادہ بخشنے والے کی اس بے پایاں بخشش کی ثنا خوانی کیسے کر سکتا ہوں حاشا کہ اس طرح کا کوئی پندار میرے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ میں ڈاک کے محکمے کے ہر کارروں اور حضور والا کی پے در پے مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی نہیں کر سکتا۔

ایک روز ڈاک کا ہرکارہ حضورِ والا کا گرامی نامہ لے کر آیا اور پھر ایک دن دو قصیدے اور دو مخمس اور ایک غلط نامۂ تیز کل کے دن جو گزر گیا، ایک نسخۂ مثنوی اور ایک رسالۂ "ولائے ہمایوں" اور انھیں کے ساتھ چالیس اور پانچ پینتالیس تنگۂ شکر

اس تنگریا تبرزد کا کیا کہنا اگر اس کی حلاوت کو میں جانِ شیریں کے مقابل رکھ کر ترازو میں وزن کروں تو مجھے یقین ہے کہ جانِ شیریں والا پلّہ، میزان کے ہلکے پن کی وجہ سے آسمان سے باتیں کرنے لگے گا اور اس تبرزد والا طشتِ ترازو گراں مایگی کے سبب زمین سے لگ جائیگا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس تبرزد کو وہ شیرینی و حلاوت بخشی گئی ہے کہ اب شیرینی و شکر میں نام ہی کو مٹھاس باقی رہ گیا ہے۔ اگر شاہد آرمینیہ کہ اسے فرہاد کا محبوب دل نواز کہا جاتا ہے اس کی لطیف شیرینی کا مشاہدہ کر لیتا تو اس کے منہ میں کچھ اس طرح پانی بھر آتا کہ کوہ کن کی جنبش تیشہ کے بغیر اس کی آنکھوں سے جوئے شیر رواں ہو جاتی۔

اگر وہ حباب کہ بہشت کی جوئے انگبیں پر تیرتے ہیں اور ان کو تبر کے بغیر نہیں توڑا جا سکتا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ دریا کو کوزہ میں بند نہیں کیا جا سکتا وہ انھیں دیکھیں گے تو یہ سوچیں گے کہ ان کوزہ ہائے نبات میں کس طرح نہر بہشت کی شیرینی سمٹ آئی ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ انھیں دیکھ کر، میری شیریں سخنی کے حلقے ٹوٹ گئے (اور دعوے باطل ہوتے) "ان کوزہ ہائے نبات" کی تعریف میں خود میرا شیوہ گفتار ہی، گویا فراموش ہو گیا ہے۔

اس بات کا سرانجام ہنوز باقی ہے کہ ان میں شیرینی زیادہ ہے یا گفتارِ شکر ریز میں۔ خدایا مجھے چشم روشن عطا کر کہ میں خانوادۂ مردمی کے چشم و چراغ اور دودمان عالی کے اختر فروزندہ و گوہر رخشندہ خواجہ میر الدین خاں بہادر کی شادی کتخدائی کی خجستہ رسوم کو حسن دستگاہ کے ساتھ پیش کروں۔

کہ میں نہ جمشید ہوں نہ پرویز نہ مہر ہوں نہ ماہ۔ وہ خود ایک ایسی رشکِ سپہر انجمن ہے کہ جہاں دارا دربان ہے اور سکندر پیش کار (ستارہ) کیوان نگراں ہے اور ناہید نغمہ سرا، مجھ ایسے کو وہاں بار تماشا کہاں، اور بہ تقریب تہنیت تابِ گفتار کجا میں کیا سوچوں اور اس کے سوا کیا کہوں کہ یہ شادی و شادمانی مبارک فالی و فرخ فال ہو اور یہ فرخی و خوش طالعی بروز افزوں

نامۂ نامی اس کار نامۂ جادو کلامی یعنی مثنوی کے ساتھ وزارت پناہ مخلصوں کے امیدگاہ احترام الدولہ بہادر کی خدمت عالی میں پہنچا دی گئی اور جب اس کا ایک حصہ انجمن میں پڑھا گیا تو ہر طرف سے صدائے آفرین بلند ہوئی۔ حضور والا بادشاہ جم جاہ اگرچہ صحت و تندرستی اور تخبتگی و فرہ مندی کے ساتھ ہیں لیکن سراپردہ خلوت سے باہر کم ہی آتے ہیں اور بیشتر مشکوے شاہی کی تکیہ گاہ عز و ناز میں آرام فرما رہتے ہیں۔

بندگان بارگاہ کو اب دستورِ سابق کی طرح شرفِ باریابی عطا نہیں فرماتے اور اسی طرح ذوقِ سماعت کے ساتھ دوسروں کے سخن و گفتار کی طرف توجہ فرما نہیں ہوتے۔ روزانہ صبح کے وقت ناصیہ سائی کے لیے درِ دولت پر حاضری دینا میرے معمولات میں سے ہے مثنوی و قصاید اور ہر دو مخمس میرے جیب و آستین کی زینت بنے رہتے ہیں کہ نہ جانے کب ان کی پیش کش کا موقع میسّر آجائے اور کب وہ وقت ہو کہ انھیں پڑھ کر سنایا جا سکے۔ اس معاملہ میں تو میری باتیں بار سماعت ہو چکیں اب وہ وقت ہے کہ اپنے شیوہ گستاخی اور جرأت گفتار کو کام میں لاؤں اور خواجہ عالی مقام کی خوے صبر و تحمل کو آزماؤں۔

آہ آہ کہ یہ نامۂ عالی نہ قبلہ و کعبہ نواب سید محمد خاں بہادر کی طرف سے کوئی نشانی لیکر آیا اور نہ خواجہ ظہیر الدین کی جانب سے اس میں کوئی بات مذکور ہوئی اور نہ ہی مولانا امجد علی صاحب کی طرف سے کوئی حکایت مہر و محبت گوش زد سماعت ہوئی۔

پتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محلات شہر کی فرد فہرست ہے اور ہمسایوں کے گھروں کے جمع و خرچ کا گوشوارہ کہ اس کی نگارش و کار افزائی کو حافظ محمد بخش صاحب کی تائید تہدید حاصل ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو گرامی نامے اس سے پیشتر روانہ کیے گئے اور بجز میرے اور شہر کے نام کے اس میں کچھ اور نہیں لکھا گیا ان میں سے کون سا خط گم ہوا کہ اس مرتبہ یہ تمام اندراجات معرض تحریر میں آگئے۔

بہت سے مسکنوں کی نشان دہی اسی وقت جائز ہو سکتی ہے کہ مکتوب الیہ بہت ہی کمتر درجہ کے لوگوں میں سے ہو اور ہمسایوں کے ناموں کے ذیل میں اس کا نام آتے

مجھے ڈاک کے ہر کاروں سے لے کر پوسٹ ماسٹر تک سبھی جانتے ہیں۔ تیس سال ہو گئے کہ میں کاشانہ و کارخانہ فروخت کر کے کو بکو پھر رہا ہوں اور میرا کوئی مقام معین نہیں ہے جب میں کہیں جاتا ہوں اور دو تین سال یا اس سے کم مدت گزارتا ہوں ڈاک کا ہرکارہ وہیں پہنچ جاتا ہے میں اپنے نام و ننگ کے باب میں کوئی جھگڑا نہیں کرتا جناب والا خواہ مخواہ خامہ فرسائی کریں اور عنوان نگار و گہر افشاں انگلیوں کو تکلیف دیں یہ اچھا نہیں لگتا اس سے آگے میں حضرت والا کے تئیں ثنا و دعا کے ماسوا اور کیا لکھوں کردہ حرز جان ہے اور یہ وردِ زبان۔ میں مشفقی و شفیقی منشی نادر حسین خاں صاحب کا سپاس گزار ہوں اور عذرانہ سلام پیش کرتا ہوں۔ کہ غالب کی دید کے طالب ہیں حاشا کہ یہ داعیہ صرف اس طرف سے ہو صحیح نہیں اگر میں بہت فروتنی اختیار کروں تو عرض کر سکتا ہوں کہ شریک غالب ہیں۔

بنام نواب شمس الامرا نائب السلطنت حیدرآباد

[۱۵۲]

رباعی

والا نظرا، گرامی گہرا (کذا)

کز فیضِ تو یافت رونق ایں کہنہ سرا

یارب چہ کسی کہ لفظِ شمس الامرا

جزویست زا جزائے رقمِ نامِ ترا

(اے کہ تو والا نظر اور گرامی گوہر ہے اور تیرے فیض سے اس عالم کہنہ نے نئی رونق پائی ہے اللہ اللہ تیرا مرتبہ کتنا بلند ہے کہ شمس الامرا تیرے نام کا جزو لازم ہے۔)

نواب معلّٰی القاب سپہر جناب عرش بارگاہ ارم کارگاہ قبلۂ عالم و اہل عالم نائب وزیر اعظم حیدرآباد خجستہ بنیاد دام اقبالہٗ و زاد افضالہٗ کی عرض گاہ میں التماس ہے۔ اور یزدان پاک کے لیے کہ فتح و فیروزی کا بخشنے والا ہے ہزاراں ہزار سپاس

کہ اس تمام دوری کے باوجود مجبوری کا احساس نہیں ہوتا اور میں اگر اس کی وجہ سے خود کو نزدیکان بارگاہ میں شمار کروں تو یہ بات حقیقت سے بعید نہ ہوگی دلیل اس دعوے کی یہ ہے کہ مسلمانانِ آفاق کے ممدوح واجب الاطاعت مولانا عبدالرزاق نے (کہ شریفِ مدینہ اور چہرہ صدق وصفا کے لیے آئینہ ہیں) حضرت والا کی بزم میں، جسے بہار جاوداں کہیے اس خاکسار کا ذکر آنے کی بات کی ہے۔

نواب معلی القاب کی ہمہ دانی وفیض رسانی حاضر وغائب اور نزدیک و دور کے لیے یکساں ہے۔ اس کے بعد آئینہ کو صفا کی خوش خبری اور گدا کو بخشایشوں کا نوید ملنی چاہیے اور آرزو مندی و امیدواری کو اپنے مقصد تک پہنچنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بخت خفتہ گہری نیند سے جاگ اٹھا ہے اور دولت بیدار دل جوئی پر آمادہ ہے۔

ضمیر منیر پر کہ راز ہائے نہاں کا آئینہ ہے پوشیدہ نہ رہے کہ شعر وسخن کا مجھ کمترین کی فطرت سے ایک روحانی رشتہ ہے اور میرا قلم بدوِ شعور سے گہر افشانیاں کرتا رہا ہے۔ شروع میں ریختہ کہتا اور اردو زبان میں غزل سرائی کرتا تھا تا آنکہ فارسی زبان میں سخن گوئی کا ذوق پیدا ہوا تو اس وادی سے عنانِ اندیشہ کو پھیر دیا اور ریختہ کا جو ایک مختصر سا دیوان مرتب کیا تھا اُسے گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دیا کم وبیش تیس سال سے فارسی زبان ہی میں فکرِ سخن کرتا ہوں۔

نوشیروانِ سپہر کے خوف سے ہزار دزدِ میرے گوہرِ سخن کے پاسبان ہیں اور زمانہ کی بغوئے برگشتگی سے کہ وہ لمحہ لمحہ تغیر پذیر ہے اس کی نگرانی کرتے رہتے ہیں دسیہ بے نوا ادائے رقصِ قلم کی "ذوق بخشی" پر شادماں ہے اور نوائے سخن کی شادابیوں پر مست ومسرور۔

آج کی صبح جب کہ میری غنودہ قسمت نے چشم نیم باز کے ساتھ مجھے دیکھا اور بلبلِ طبیعت نے زمزمہ سنجی کے تقاضہ کے ساتھ اپنے پروبال کو جنبش دی، خدا کی حمد وثنا اور خداوند کی ستایش کا زمزمہ چھیڑا اور نمود سحر نے میرے دل میں اجالوں کے دریچے کھول دیے۔ اور ان جانفزا لمحات میں شخصت وہفت (۶۷) ابیات کے ایک قصیدہ نے

پیرایہ نگارش اختیار کیا۔

قصیدہ کیا ہے ایک نوائے سینہ تاب ہے جسے زمانہ کی آگ نے بے طرح جلا ڈالا ہے یا پھر یہ کہیے کہ عرضِ مدعا کی وہ برق زدہ گھاس ہے جس نے دودِ سیاہ کا رنگ اختیار کیا یہ عریضہ نگار کی خوش بختی ہے کہ وہ قبولِ خاطر کی چشم داشت کے سہارے اپنے سودا زدہ دل کو مطمئن و شادماں رکھتا ہے۔ اور اس تنہائی میں اپنی ہمدمی کی داد دینے کے لائق ہوتا ہے۔

بالتفات نرزم، در آرزو، چہ نزاع
نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبی است

(اگر میں اپنی آرزومندیوں کے ساتھ لائق التفات نہیں تو کوئی نزاع کی بات نہیں مفلس کے دل کی خوشی تو کیمیا طلبی میں ہے۔)

جیسا کہ میری ہوس کا تقاضہ ہے اور میری خوئے حرص و آز جس طرف مجھے بلاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر بندہ پرور کا دل میری پرسش احوال کے لیے گرم تپش نہ ہو اور پلکیں نم آلود نہ ہو جائیں تو میں یہ سمجھونگا کہ میری " آہ نیم سوختہ " میں اب شعلہ کا کوئی اثر باقی نہیں اور میری طبیعت کی آتش زدہ گیاہ میں، مدح سرائی کے لیے اب کوئی نم موجود نہیں اور جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ہرزہ سرائی ہے، ما ہرانہ جنبش قلم نہیں۔

غرض اظہار بندگی ہے نہ ارزش کی لاف زنی، اور میرا کام نیرد بے بخت کی کار سازی سے متعلق ہے نہ آزمندی کی زبان درازی سے، سائل کا وسیلہ تو دعائے دوست ہے نہ دعوائے خدمت۔

(اشعار) قصیدہ۔

اے مظہر کُل، در ازل، آثارِ کرم را
منت بسر لوح، زاکم تو قلم را
شمس الامرا گز شرف جنّت نامش
خود قبلہ ، اورنگ نشیانِ عجم را

یارب صحیفۂ امارت (خداوندی) کا عنوان دفتر قضا سے بقائے جاودانی کی توقیع کے ساتھ رقم پذیر ہو۔

بنام منشی نول کشور صاحب

[۱۵۴]

مالک مطبع اودھ اخبار

بنام ایزد دانا۔ آج میں ایک ایسے شخص سے باتیں کر رہا ہوں کہ آنکھوں نے اس کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا لیکن دل اس کا گرویدہ محبت ہے۔ مردم دیدہ اس کے دیدار جو ہیں اور دل و جاں اس سے محو گفتگو۔ اس نامہ کے حسن سواد پر کہ اس نادیدہ دوست کی طرف سے مجھے ملا ہے میری آنکھوں کی پتلیوں اور دل سودا زدہ کی خواہشوں میں ایک جنگ سی چھڑ گئی ہے ایک یہ چاہتا ہے کہ سب کچھ اسے مل جائے اور دوسرے کی خوشی ہے کہ جو ہے وہ اس کے حصّہ میں آجائے۔

میں درمیان میں آگیا اور میں نے دیدہ و دل کو اس پرخاش سے باز رکھا تا انیکہ ہر ایک نے اپنا اپنا حصّہ لے لیا اور دونوں کے آشتی پیدا ہوگئی۔ چشم کو فروغ مبارک ہو اور دل کو فراغ۔ میں نے فارسی زبان میں ایک زمانے تک مشق سخن کی ہے اور نادر سحر نامے لکھے ہیں اب کہ دل ناتوانی کے سبب کاوش نہیں کر سکتا تو میں نے ایک سادہ وسہل راہ اختیار کر لی ہے اور جو کچھ مجھے لکھنا ہوتا ہے اردو میں لکھتا ہوں گویا میں اپنی روزمرہ کی بات چیت کو خط میں لکھ دیتا ہوں اور پرزہ کاغذ کو لپیٹ کر اپنے کسی دوست کو بھیج دیتا ہوں۔

حاشا کہ اردو زبان میں سخن آرائی وخود نمائی کا کوئی دستور نہیں جو بات نزدیک تر لوگوں سے کی جاسکتی ہے وہی بلا تکلف دور والوں سے بھی اسی لب ولہجہ میں ہو سکتی ہے مدعا عرض مدعا کے سوا کچھ اور نہیں۔

میں نے آپ کی بات مان لی اور یہ خط فارسی آمیختہ بہ عربی میں لکھا۔ فارسی میں میری نگارشات سے تین کتابیں ہیں۔ پنج آہنگ مہر نیم روز اور دستنبو لکھنؤ میں یہ

تینوں کتابیں جو اچھی خاصی مشہور کتابیں ہیں لوگوں کے پاس اگر فارسی نگارشات سیر کا شوق ہے تو یہ سواد نامے کیوں نہ فراہم کر لیے جائیں۔

میرا معاملہ یہ ہے کہ ۱:۳ کافور و کفن کی منزل میں ہوں پینسٹھ سال جیا اور پچاس برس سخن سرائی کی آخر ہر آغاز کا ایک انجام ہے۔

اودھ اخبار اُدھر سے ہر ماہ میں چار بار اور ہر سال میں اس طرف سے زر مبادلہ دو بار پہنچتا رہے اگر آپ منظور فرمالیں تو میری طرف سے بھی اس کی منظوری بھیجیے۔

اقبال نشان میاں داد خاں سیّاح کو میری طرف سے دعا کہیے میں نے ایک دوست سے کہا ہے تاکہ وہ چند فارسی غزلیں لکھ دے اب جیسے ہی وہ لے کر آئیگا میں آپ کی خدمت میں روانہ کردوں گا۔

تاریخ تحریر و روانگی روز چہار شنبہ

۱۸ر جولائی ۱۸۶۰ء

بنام دو تن از فرزانگان پنجاب

[۱۵۴]

(مرزا محمد خاں اور مرزا برکت اللہ)

ایک سپہر مردی کا سورج اور دوسرے اس کا چاند یعنی ہمایوں مرتبت مرزا محمد خاں اور ہما سایہ مولانا مفتی برکت اللہ کہ جو غالب آشفتہ نوا کے ستایش گروں میں سے ہیں۔ گویا اس درویش نوازی کے پردہ میں انھوں نے اپنی ہی صفات عالیہ کو سراہا ہے۔

دکان بے رونق کا خریدار بننا نیک سیرت افراد کا کام ہے ہر چند انسان کی صفات حسنہ کا کوئی اندازہ و شمار نہیں لیکن عدل و بخشایش کو ان سب میں سر آوردہ شمار کیا گیا ہے جیسا کہ فردوسی نے کہا ہے۔

تو داد و دہش کن فریدوں توئی

(داد و دہش کر کہ تو خود بھی فریدوں ہے۔)

حضرت والا نے قاطع برہان اور اس کے منکروں کے باب میں شیوۂ داد و دہش اختیار فرمایا ہے اور درستی و راستی کی روش اختیار کر کے مجھ فقیر پر بڑی عنایت کی ہے جب تک کہ میں دنیا میں رہونگا آپ کا ثنا خواں اور خیر اندیش رہونگا اور منشی جواہر سنگھ جوہر کے لیے دل سے دعا نکلتی رہے گی کہ وہ آپ ایسے عزیزوں سے روشناسی کا باعث ہوئے ہیں دوشنبہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۴ء ۱۸ ماہ ذی قعد سنہ ۱۲۸۱ھ

بنام اعلیٰ حضرت سلطان محمد بہادر میسور

[۱۵۵]

رباعی۔

سبحان اللہ، شانِ اعلیٰ حضرت
بادشاہِ فلک آستانِ اعلیٰ حضرت
خواہم کہ براں عتبہ نہم روے نیاز
در زمرۂ بندگانِ اعلیٰ حضرت

(سبحان اللہ اعلیٰ حضرت کی شانِ والا نشان، جو بادشاہِ فلک آستاں ہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ اُس آستانۂ عالی پر سجدہ کروں اور ملازمان حضرت کے زمرہ میں شامل ہو جاؤں۔)

آغاز نگارش ہر آئنہ اسم مقدس کی تسبیح سے ہوتا ہے اور نیاز نامہ کہ ہزار گونہ امیدواریوں کا نشان ہے اور ان بہت سی چشم داشتوں میں ایک یہ ہے کہ اس فلک زدہ پر ترحم فرمائیں اور اس بات پر اُسے مورد عتاب نہ ٹھہرائیں کہ "حد ادب" کا خیال کیوں نہیں رکھا جب ہم سے کوئی سابقہ رشتہ روشناسی کا نہیں تو یہ خط لکھنے کی جرأت کیسے کی۔

اس نیازمند نے دودِ دل کی روشنائی سے چند اوراق کی سواد نگاری کی تھی اور اس کے نظارہ کے لیے کسی والا نظر کی جستجو میں تھا۔ خرد نے اعلیٰ حضرت کی نظرگاہِ عالی کی نشان دہی کی کہ ہمہ داں ہیں اور کہا اگر تجھ میں نذر پیش کرنے کی قوت نہیں تو

بذریعہ محکمۂ مراسلات اس کا بھیجا جانا ممکن ہے. میرے شوق کی فراوانی عقل کی اس رہنمائی کے سہارے اور بڑھ گئی۔

اس ارمغاں کو بھیجنے والے نے، دور سے زمین خدمت کو بوسہ دیا اور آستان عالی کے سامنے جبین شوق کو خم کر دیا۔

شادم کہ توئی تا بتو ہنگامہ کنم گرم
ورنہ، زکجا یافتے قیصر و جم را

میں خوش ہوں کہ مجھے اس بارگاہ والا میں، مجھے ہنگامۂ آرزو پیش کرنے کا موقع ملا ورنہ مجھ فقیر کے لیے قیصر و جم کہاں سے آتے۔

طبع عالی پر روشن ہو، کہ دس سال کی عمر میں موزونی طبع کے آثار مجھ میں ظاہر ہوئے یہاں تک کہ شدہ شدہ "دید و دانست" کا سرمایہ فراہم ہو گیا زبان نے انداز گزارش اور قلم نے اسلوب نگارش کے آداب سیکھ لیے اب کہ عمر گذراں ستر (۷۰) کی منزل تک پہنچ گئی تو میری خاطر ناشاد میں یہ بات آئی کہ پچاس سالہ نگارشات کے مسودوں کو فراہم کیا جائے، عدم استطاعت کے ان کے مصارف طباعت کو برداشت کیا اور ان تحریروں نے مطبوع صورت پائی۔

جو نسخے چھپ گئے، ہیں ان میں سے ایک بذریعہ پارسل ارسال خدمت کر رہا ہوں. عرض داشت اور پارسل کی روانگی کا دن ایک ہی ہے پھر بھی میں جانتا ہوں کہ خط پہلے پہنچے گا اور پارسل اس کے بعد۔

اگر پارسل اور خط کے پہنچنے کے بعد بھی ان کے پہنچنے اور نہ پہنچنے کے بارہ میں کوئی اطلاع نہ ملے اور میں ان سے متعلق دو دل رہوں تو افسوس ہے مجھ پر اور میرے زمانہ پر. میرا مقصد آشکارا طور پر صرف جواب نامہ سے نہیں ہے. شہزادۂ والا تبار آزردہ ہیں. نہیں نہیں میرا نیایش نامہ تو دراصل حسن طلب ہے. خداوند عالی پایگاہ کے وجود باجود سے چتر پاش عز و ناز کو رتبۂ اورنگ سلیمانی حاصل ہو۔

(۱۸۶۷ / ۱۳۸۴)

بنام میر غلام بابا خاں صاحب بہادر

[۱۵۶]

عالی جاہ و والا پائیگاہ ! قدسی صحیفہ کے ورود نے دل کو تاب و تواں اور تن کو روح و رواں بخشی الله الله دکان بے رونق کے خریداروں کو ایسا ہی ہونا چاہئے کہ درویش دلریش اور ایک اندوہگین گوشہ نشین کو خط سے یاد کریں۔

ہاں ہاں آسمان کی بلندیوں پر چمکنے والا سورج اپنی ضیا باریوں میں ایک ذرۂ خاک کو بھی اپنی تابش سے محروم نہیں رکھتا۔ اور ابر بہار جو لالہ و گل اور ریحان و نافرمان کی پرورش کرتا ہے وہ شورزار میں اُگی ہوئی خاردار جھاڑیوں پر بھی اپنی عنایتوں کی بارش کرتا ہے۔ امید کہ مجھے اس کے بعد جناب والا اپنے مخلصین کی فہرست میں شامل رکھیں گے۔

حضرت نے سیاح جہاں گرد کے جہاں پیما قدموں کو بھاری زنجیریں پہنا دی ہیں اب کچھ ایسا بھی کریں کہ اس کے شانے اپنے اہل و عیال کی پرورش کے بار سے مجروح نہ ہوں اور وہ غم و اندوہ کی قید سے آزاد ہو جائے اور میں جانتا ہوں کہ میرے کرم فرما بھی یہی چاہتے ہیں اور انھیں فراوانی محبت نے اس پر آمادہ کیا ہے والسلام بہ الوف احترام آپ کی محبت کی روز افزونی کا طلب گار غالب ۱۲ روز شنبہ ہفتم مئی ۱۸۶۴ء فقط "اڑا جاؤں کیا دیوانہ ہوں لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں آپ کی عنایت سے اور بزرگوں کی دعا سے خوش و خرم ہوں اور اپنی عزت آبرو سے بسر کرتا ہوں خدا ایک وقت تم کو یہاں لادے تو سب حال کھل جاوے زیادہ کہنا زیادہ ہے"۔

بنام سلطان زادہ بشیر الدین میسوری

[۱۵۷]

رباعی

عشق است رمش افسر گل و نسریں را
وز تیرگی سیاہ مہ دیرین را"

وز من کہ گدائے کوچۂ میکدہ ام
جم مرتبہ شہزادہ بشیر الدین را،

گل و نسریں کی طرف سے اس کے رُخ گلنار کو سلام شوق، اور ثُریا کی تیرگی ذُنک تابی کی جانب سے چاند اور ستاروں کے حسین جھرمٹ کو عرضِ تمنا۔

اور میری طرف سے کہ کوچۂ میخانہ کا فقیر راہ نشیں ہو شہزادۂ جم جاہ بشیر الدین کو نذرانۂ خلوص۔

کفِ دستِ سلیمان کے مورِ ضعیف یعنی مجھ بندۂ اسداللہؔ کو کہ سلطانِ بلند آستاں کا نظر پروردہ ہوں، نویدِ وصول اور بشارتِ قبول کا منتظر ہوں۔ کہ وقت کو کس طرح آفریں کہا جاتا ہے اور قسمت کی کس طرح تحسین کی جاتی ہے سلطان سپہر آستاں کو جو زبانِ سپاس ارزانی فرمائی گئی ہے شرف نامہ کے ورود نے پیہر ہُما کے سایے کی طرح مجھے اس سے سرفراز کیا اور اس کی مثال ایسی ہی کچھ ہے جیسا کہ کسی زندانیٔ آلام کو مصرِ شادمانی کی فرمارواٸی سے نواز دیا جائے۔

گویا جس طرح، سایہ ہمایوں مرحلۂ آب و گل کے لیے نشان قہرمانی ہے یہ سوادِ تحریر جیسے سویدائے دل کی سیاہی و روشنائی سے آراستہ کیا گیا ہے قلمروِ دل وجاں کی دارائی کا طغرہ ہے۔ ورقِ اشعار کو ابر دریا بار اور دریائے دُربار کہا جا سکتا ہے اس نے کچھ گہرہائے شاہوار برسائے کہ خانہ چشم اور حلقۂ النظر نے گنجینۂ مروارید کی شکل اختیار کر لی۔

داد یہ ہے کہ اگر دانشور دادِ سخن دیں تو میدانِ سخن کی شہسواری کا حق سلطانِ والا نشان کو پہنچتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ غاشیہ برداری کی سعادت و دولت کس کے حصہ میں آتی ہے یہ نامہ نگار ایک زمانہ سے سرِ سخن سنجی نہیں رکھتا نہ اس کی میزانِ خیال میں موتی ہیں نہ اس کے بازوؤں میں قوت و تازگی۔ ساٹھ اور چھ مرحلے عمر سبک سیر کی راہ کے طے ہو چکے ہیں۔

پچاس سال تک نیک محضروں کے ساتھ مہر ورزی اور عشق بازی کے ہنگامے دل کو گرماتے رہے اب کوئی نہیں اُس زمانہ میں کتنے دوستانِ یک دل میرے دل

کی محفل میں جمع ہوئے اس کے چرخِ گرداں کی گردشوں نے اس طرح ان روحانی رشتوں کو منقطع کردیا کہ میری رگ جاں سے خون ٹپکنے لگا۔ کتنے عزیزان بے مرگ ہیں کہ میں ان کی نام شماری بھی نہیں کرسکتا جو اس ناسزا طوفانِ حوادث کی تیر باری میں فنا ہوگئے، مگر چند خستہ جان و ناتواں جن میں سے ایک میں بھی ہوں کہ ان کشتگان ستم کے داغ اندوہ سے۔ زار و نزار جی رہا ہوں اور ان خستہ جانوں کے حال احوال پُرخون کے آنسو بہانا میرا کام رہ گیا ہے میں خود خستۂ دہر اور ماتم دارِ اہلِ شہر ہوں۔

میرے نقوشِ تحریر میں سے نثر فارسی میں جو ارژنگ نامے میری نگارشات میں سے ہیں "پنج آہنگ" "مہر نیم روز" اور "دستنبو" ان میں سے نظر گاہ والا میں پہنچ چکے ہیں نگاہ روشن اساس کے روشناس ہو چکے ہیں۔ تیسرے کے بارہ میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ شہر میسور تک پہنچ چکا ہو اگر وہاں دستیاب نہیں تو یہاں جیسے ہی وہ مل جائیگا۔ میں حضرت والا کو اس سے مطلع کرونگا۔

حصۂ نظم دو سفینوں (بیاض و کتاب) سے زیادہ نہیں "کلیات اردو" وہ اس لایق نہیں کہ فارسی زبان کے شہسواروں کے سامنے اس کا نام بھی لیا جائے اب رہا کلیات فارسی، تو خاطر عاطر میں یہ بات نہ آئے کہ فارسی کلیات اپنی جگہ پر جامع اور مکمل ہے جو بھی ہے وہ یہی مطبوعہ دیوان ہے جو کلیات کا آدھا حصہ ہے سخن کوتاہ "دستنبو" ہے یا پھر مجموعہ نیرنگ یعنی یہی "کلیات فارسی"۔ اگر پیش نہاد خاطر دونوں مجموعوں کا ایک ساتھ روانہ کیا جانا ہے میں منتظر ہوں کہ جناب والا کی طرف سے کیا حکم صادر ہوتا ہے۔

ہے ہے آپ نے ان قلم و قرطاس کے نقوش روداد سے متعلق یہ کیا سوچا کہ ان کی قیمت کے بارہ میں حرف پرسش زبانِ قلم پر آیا نیاز مندان بے نوا کو نوازنے کا طریقہ یہ تو نہیں۔ میں بے سرمایہ ہوں فرومایہ نہیں میں سخن ور ہوں سوداگر پیشہ نہیں میں موئینہ پوش ہوں کتاب فروش نہیں۔ میں عطا و بخشش کو قبول کرنے والا ہوں

قیمت وصول کرنے والا نہیں۔ ہم ایسے آزاد منش شہزادگان والا تبار کو جو بھیجتے ہیں وہ نذر ہے اور سلطان زادہ ہائے بلند نشان جو ہم آزاد گوشہ نشینوں کو مرحمت فرماتے ہیں وہ عطیہ تبرک ہے یہ خرید و فروخت نہیں، چوں و چرا نہیں جو میں بھیج رہا ہوں ارمغاں ہے اور جو روانہ کروں گا وہ نذرانہ ہوگا۔

آپ کی راتیں شب عید ہوں اور آپ کے دن روز نوروز

بنام خواجہ ظہیر الدین خاں بہادر

[۱۵۸]

خدائے پاک کے لیے ہزار در ہزار سپاس کہ جناب والا "راہ پرور" ہیں اور اس لیے کہ اس بندۂ بارگاہ کو "خواجہ پرست" بنایا گیا ہے بنا بریں ایزدی عنایات کی سپاس گزاری میں خواجۂ عالی مقام کو میں اپنا ہم زبان بنانا چاہتا ہوں۔ اور یہی مناسب بھی ہے۔

اگرچہ آشنائی و مہر افزائی میں حکایت بے شکایت مزہ نہیں دیتی، لیکن چونکہ میں نے نگارش خامہ کے باب میں کوتاہی کی تو پھر دوست سے گلہ مند ہونے کا کیا موقع ہے میری گفتگو پہلے خط میں، عالی جاہ انور الدولہ بہادر سے یہ تھی کہ انھوں نے تخلص پناہی خواجہ ظہیر الدین خاں اور امید گاہی نواب سید محمد خاں بہادر کے بارہ میں کیوں نہیں لکھا، بارے مکرمی حافظ نظام الدین کے پہنچنے کے بعد یہ تمام گرد ملال پیش گاہِ دل سے دھل گئی اور نامۂ عنایت کی تہہ کشائی نے سوادِ جاں میں مسرتوں کی بساط بچھادی۔

نگرانی کا دور ختم ہوا اور دل جس دولت بیدار کا آرزو مند تھا اس نے درِ دل پر دستک دی۔ میں امید کرتا ہوں کہ نواب فرخ القاب کی نظر گاہ عطوفت میں، میری جانب سے زمین خدمت کو چوم کر، اس سلام کے جواب میں جو انھوں نے

مجھے لکھا ہے میری جانب سے بندگی عرض کریں اور کہیں کہ یہ بوا، ان کے پائے عرش پیما پر اپنی آنکھیں ملنا اور کلک گہر بار سے انشا کیے ہوئے شعر کو خود ان کی زبانِ پروین نثار سے سننے کی آرزو رکھتا ہے۔

میں عالی مرتبت والا شان خواجہ معین الدین خاں بہادر کی بلائیں لینا چاہتا ہوں، کہ انھوں نے اپنے بھائی کے اس بندۂ بے دام کو خود اپنا بندہ تصور فرمایا امید کہ یہ صورت محبت کی طرف انہوں کا باعث ہوگی اور ہر دو طرف دلوں میں محبت بڑھے گی۔

میں خود کو ان کا منت پذیر و احسان مند خیال کرتے ہوئے اپنا سلام بھیج رہا ہوں کہ وہ فروتنی اور عجز گذاری میں اظہار بندگی سے یک گونہ فزوں تر ہے۔ فرخ گہر و تابندہ آفریں خواجہ عبداللہ خاں بہادر کون ہیں از روئے نگارش اس کا حال معلوم نہ ہو۔

لیکن حافظ نظام الدین کی تحریر سے معلوم ہوا کہ وہ بوستانِ دولت کے سرو خراماں ہیں اور آسمان عزہ جاہ کے چمکنے والے چاند ہیں اس خط کے تحریر کرنے والے کو وہ اپنا دعاگو اور ثنا خواں تصور کریں۔ میں اس سلام کے جواب میں کہ انھوں نے لکھوایا ہے ان پر اپنی جان نچھاور کرتا ہوں اسے ہرگز ہرگز وہ میری بے بضاعتی اور کم خدمتی پر محمول نہ فرمائیں دولت و اقبال پائندہ رہیں اور خوش پیامی کا سلسلہ جاری رہے۔

نامہ نگار اسداللہ

تاریخ نامہ

غالبؔ کے فارسی خطوط مشمولہ " پنج آہنگ " کی تاریخی ترتیب، میری محدود نظر کے مطابق موجودہ معلومات کی روشنی میں ممکن نہیں لیکن اس ضمن میں، کچھ داخلی اور بعض خارجی شواہد کی مدد سے مختلف خطوط کا زمانی تعین اور از روئے تقویم نامکمل تاریخوں کی تکمیل کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

غالبؔ تاریخ کا خاصا ذوق رکھتے تھے لیکن انھوں نے بیشتر خطوط پر تاریخ نگارش کو یا تو درج ہی نہیں کی یا پھر اسے ادھورا چھوڑ دیا کہیں تاریخ سنین عیسوی میں درج کی ہے تو کہیں سنین ہجری

مرزا غالبؔ کی زندگی میں ان خطوط کے جو " پنج آہنگ " میں شامل ہیں دو ایڈیشن شائع ہوئے مطبع دارالسلام کے کار پردازوں نے تو سرورق کے اندرجات میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اشاعت " بہ تصحیح مصنف " پیش کی جا رہی ہے لیکن نظر ثانی کی نوبت اس اشاعت کے نقطہ نظر سے تو نہیں آئی۔

بہر نوع اس مجموعہ میں شامل بعض خطوط کے زمانۂ نگارش کا تعین ان قصائد و قطعات کی روشنی میں بھی کیا جا سکتا ہے، جو مکتوب الیہ کو بھیجے گئے لیکن یہ قطعات اب متن میں شامل نہیں، بعض قصیدوں اور غزلوں کے اشعار ضرور دیے گئے ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر اور پروفیسر وزیر الحسن عابدی نے ان کے قصائد قطعات وغزلیات کی نگارش اور مختلف قلمی نسخوں میں ان کی شمولیت سے بحث کی گئی ہے۔ ان سے بھی تاریخ کے تعین میں ایک گونہ مدد مل سکتی ہے۔

بنام مرزا علی بخش بہادر

خط ۱ ۔

نواب احمد بخش خاں کی خدمت میں میر امام علی کے بدست جو عرضداشت روانہ کی گئی ہے، یہ خط اسی کے ضمن میں ہے۔

" میر امام علی را با عرض داشت بخدمت نواب صاحب فرستادہ ام
زینہار با من زمانہ سازی واز نواب محابا مکنید چوں عرض داشت
خواندہ شود شما ہم در انجمن باشید تا نگارش را بہ گزارش نیرو دہند۔

یہ خط فیروز پور سے واپسی پر لکھا گیا ہے مگر دہلی سے نہیں۔ نامہ ہائے فارسی غالب مرتبہ سید اکبر علی ترمذی کے ضمیمہ ۲ ص ۱۱۶ پر نقل کی جانے والی عرض داشت سے پتہ چلتا ہے کہ غالب فیروز پور جھرکہ سے واپسی پر دہلی نہیں آئے عازم کانپور ہو گئے۔ [عرض داشت بنام فریزر معروضہ بست و ہشتم اپریل ۱۸۲۸ء] (یہ خط قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸۲۵ء میں شامل ہے)

ایضاً خط ۲ ۔

خط میں میر مداری نامی کسی شخص کو بھیج کر فیروز پور جھرکہ سے اپنا سامان منگایا ہے غالب ۱۸۲۵ء میں نواب احمد بخش کے ساتھ رہے قلعہ بھرت پور کے محاصرہ کے دوران وہ نواب صاحب ہی کے ساتھ تھے مرزا علی بخش بھی اس وقت ہم رکاب ہیں واپسی کے وقت طلب کیا جانے والا سامان فیروز پور رہ گیا غالب دہلی میں نواب صاحب کی آمد کے بھی منتظر ہیں بصورتِ دیگر خود فیروز پور پہنچنا چاہتے ہیں بگمانِ غالب سنہ ۱۸۲۶ کے اوائل میں لکھا جانے والا خط ہے۔

---

[1] جیسا کہ وزیر الحسن عابدی نے خیال کیا ہے

خط ۳

غالب نے کلکتہ پہنچنے کے بعد یہ خط لکھا ہے ورود کلکتہ کی تاریخ ۲۰ فروری ۱۸۲۸ء مطابق ۱۲۴۳ھ ہے۔

اس میں دیارِ مشرق کے اس شہر کی خوش حالی و فارغ البالی کے ذکر کے ساتھ علی بخش بہادر کو مسٹر اندرو اسٹرلنگ اور مسٹر سائمن فریزر بہادر سے اپنی ملاقات کا حال احوال بھی سنایا ہے۔ اسٹرلنگ سے غالب کی یہ ملاقات ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کو ہوئی تھی اور اسی موقعہ پر مرزا نے اپنے مرافعہ کے سلسلہ میں عرض داشت بھی پیش کی تھی۔

اس خط میں غالب نے نواب احمد بخش خاں کے واقعۂ وفات کا بھی ذکر کیا ہے جس کی اطلاع انھیں کلکتہ پہنچنے سے پیشتر ہی میر فضل مولیٰ خاں کے وسیلہ سے مرشد آباد میں مل گئی تھی۔ نواب صاحب کی وفات اکتوبر ۱۸۲۷ء کا واقعہ ہے۔

خط ۴

یہ دوسرا خط بھی کلکتہ ہی سے لکھا گیا ہے اور زمانۂ تحریر — غالب کا قیامِ کلکتہ ہے۔

خط ۵

بجواب شقہ صاحب عالم مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر

یہ خط اپنی داخلی شہادت کے اعتبار سے غالب کے اولین خطوط کے زمرہ میں آتا ہے غالب اس وقت عزمِ سفرِ کلکتہ کی پیدا کردہ پریشانیوں میں گرفتار اور پا بہ رکاب نظر آتے ہیں جس کا اندازہ خط کے ان جملوں سے بھی ہوتا ہے۔

"........ بعد نگارش این عرض داشت گام سنج بادیہ آوارگی می شوم و اتفاق چناں افتاد کہ مرجعے بلکہ مقامے معین ندارد و ہر روز بجائے و ہر شب بسرائے ہست۔ سید قاسم علی خاں باوصف منع خانہ زاد راہے دراز بریدند تا پانی پت رسیدہ حاکم را نیافتہ بازگردیدند

مخوائے عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آغاز سفر کے مراحل میں کسی وقت لکھا گیا ہے اور اس اعتبار سے غالب کے زمانۂ ورود لکھنو سے کچھ پہلے کی بات ہونی چاہئے یعنی ۱۸۲۶ء کے اواسط میں اسے تحریر کیا جانا چاہئے۔

خط ۶

مکتوب بنام سبحان علی خاں

اس خط کے شروع میں جو رباعی درج کی گئی ہے "اے آنکہ ہما اسیر دامت باشد" اس کے بارہ میں وزیرالحسن عابدی کا خیال ہے کہ سنہ ۱۸۲۶ مطابق سنہ ۱۲۴۱ھ کی نگارشات میں سے ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ سبحان علی خاں کے نام مکتوب غالب نے آمدِ لکھنو سے پیشتر ارسال کیا تھا۔ خط کے یہ جملے خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں

دریں آشفتگی جز باستاں سپہر نشانِ قہرماں اودھ سر فرود نیامدہ....
ودریں جستجو خاطر، جز بالتفاتِ خانِ رفیع الشان پیوند منت پزیری نگرفت ـــ خار خار ایں آرزو بدامنِ دل آویختہ .....کہ ایں عرض داشت
بہ فروغ نگاہ آصف ثانی   اودھ برسد وایں قصیدہ بہ بزم مینو مثالِ سلیمانی خواندہ شود

خط ۷

غالب نے اپنے تخلیقی شہ پارے نثری قصیدہ کی بات پھر دہرائی ہے اور اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ شاہِ اودھ اور اس کے وزیر آصف نظیر کی طرف سے اس پیش کش کو شرفِ قبول عطا ہوگا اور انھیں صلۂ شایاں سے نوازا جائے گا۔

"خانِ ارسطو تدبیر را برگ چارہ فراوان ست وشاہ و وزیر را دست بخشش دراز"

یہاں خانِ ارسطو تدبیر سے خود سبحان علی خاں مراد ہیں جنھیں یہ خط تحریر کیا گیا ہے۔
— زمانۂ تحریر غالب کے لکھنؤ میں قیام پزیری کا دور ہے۔ اکبر علی زیدی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق غالب ۵ اگست سنہ ۱۸۲۶ء تک لکھنؤ میں موجود تھے اس کے بعد انھوں نے باندے بندھیل کھنڈ کا سفر اختیار کیا۔

خط ۸

مولوی سبحان علی خاں کے نام یہ خط بھی قصیدہ کی پیش کش و پزیرائی سے متعلق ہے اور مذکور خط کے بعد کسی وقت تحریر کیا گیا ہے — "اجزائے عطائے وزیر و توقع مرحمت حصول خسرو شگرف نقشے بر مگزار بستم" —
یہ وہی وقت ہے جب وہ سفر کلکتہ کے لیے سامانِ سفر تازہ کرنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

خط ۹

بنام مولوی کرم حسین سفیر شاہِ اودھ

یہ خط غالباً خاصے وقفے کے بعد اسی سلسلے میں لکھا گیا۔ ممکن ہے اس اثنا میں [کہ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد نصیر الدین حیدر اور روشن الدولہ کا زمانہ آگیا تھا] مرزا غالب نے کوئی اور کوشش بھی کی ہو۔ مولوی صاحب کو لکھا ہے

"آنچہ من در صلۂ نگارش ایں قطعہ (کذا) دست مزدِ خویش می سنجم روشناسی خسرو ست و تشریف قبول و نوید التفات، و عطیہ فتوح اما کشائشِ طلسم ایں مدعا در گرو آنست کہ پایہ و مقام ستائش گر شمردہ شود تا باندازۂ ارزش بخشش ہم تواند کرد"...... پیدائی ایں مراتب باندازۂ گفتار

سبحان علی خاں نہ باشد"

خط ۱۰

بنام مولوی امداد حسین خاں وزیر شاہ اودھ

یہاں بھی وہی باتیں دہرائی جارہی ہیں جو مولوی کرم حسین کو لکھی جاچکی ہیں اس عرض داشت میں دو قطعہ ہائے ستائش کا ذکر ہے جو ہم نورد کرکے بھیجے گئے ہیں۔ لیکن موجودہ متن کے ساتھ یہ قطعے موجود نہیں۔ لکھا ہے:

"...... در گہر سنجی از قصیدہ بہ قطعہ دل بست فراوانی ذوق ستائش را نام رکجگر تشنگی ذوق گزارش باقی ماندہ و قطعۂ دیگر در روانی چوں زلال از رگ کلک تراوش یافت چنانکہ ہر دو قطعہ در نورد ایں عرض داشت از نظری گزرد" اثنائے راہ یا قیام کلکتہ کے دوران لکھا جانا چاہیے۔

خط ۱۱

بنام رائے چھجمل کھتری

خط آغاز سفر کلکتہ سے پیشتر اس وقت لکھا گیا ہے جب غالب فیروز پور میں نواب احمد بخش خاں کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں

"نواب صاحب دریں ہفتہ رونق افزائے فیروز پور خواہند گشت، از کسے شنیدہ در زکسے شنیدہ نمی شود"

اواخر ۱۸۲۵/۱۲۴۰ھ یا اوائل ۱۸۲۶/۱۲۴۱ھ میں تحریر کیا جانا چاہیے۔

خط ۱۲

بتاریخ پنجم ذی قعدہ روا آدینہ ۔ وزیر الحسن عابدی نے اس کے سنین کا تعین جمعہ پنجم ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۲۱ مئی ۱۸۲۷ کیا ہے ۔

خط ۱۳

خط میں معتمد الدولہ آغا میر کے رویہ پر کڑی تنقید کی ہے " ہر چہ دراں بلا واز کرم گستری وفیض رسانی ایں گدا طبع سلطان صورت یعنی معتمد الدولہ آغا میر، شنیدہ می شد، بخدا کہ حال بر عکس است"۔ بتاریخ بست و ششم ذی قعدہ روز جمعہ ازاں ستم آباد بر آمدم بتاریخ بست و نہم بہ کانپور رسیدم" جس کے یہ معنی ہیں کہ ۲۹ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۲ھ مطابق جون سنہ ۱۸۲۷ کو تحریر کیا گیا۔

خط ۱۴

خط میں آمدہ قطعہ کے مصرعہ "گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است" سے معلوم ہوتا ہے کہ بنارس پہنچ کر لکھا گیا ہے ۔ زمانہ تحریر جولائی ۱۸۲۷ مطابق ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ ہے ۔

خط نمبر ۱۵

مرزا نے کلکتہ پہنچنے کے بعد یہ خط لکھا ہے اور رائے صاحب سے کچھ معلومات کی ہیں ۔

"نخستے از اوقاتِ خویش ضائع سازند و حالات سرکار فخر الدولہ بعد وقوع ایں حادثہ بشرح و بسط بنگارند"

مرزا علی بخش کے نام اپنے خط میں بھی غالب نے نواب احمد بخش خاں کے واقعۂ وفات کے بعد وہاں کے حالات کے بارہ میں تشویش کا اظہار کیا ہے ـــــ وزیر الحسن عابدی نے اس کے زمانۂ تحریر کو وسط مارچ ۱۸۲۸ (۱۲۴۳ھ) سے وابستہ کیا ہے ۔

خط ۱۶

اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ غالب نے اپنے مقدمۂ پنشن کے جو کاغذات عدالت صدر گاہ کلکتہ میں پیش کیے تھے ان پر کوئی فیصلہ دینے سے پہلے حسبِ دستور اس ضمن میں ریزیڈینٹ دہلی سے رپورٹ مانگی تھی۔

"بالا دستان کونسل آرائے کار مرا کہ داد خواہ آمدہ ام بفرمان فرما دہی سپردانند"

غالب نے اس بارۂ خاص میں پیروی کے لیے لالہ ہیرالال کو اپنا وکیل مقرر کیا اور نواب علی اکبر خاں متولی امام باڑہ ہگلی سے منشی التفات حسین کے نام سفارشی خط لکھوایا اسی کے ساتھ کرنل ہنری املاک سے، صاحب ریزیڈینٹ دہلی کے لیے سفارش نامہ حاصل کیا سید اکبر علی ترمذی نے اسے ۲۰ جون ۱۸۲۸ کا واقعہ قرار دیا ہے

جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خط ۲۰ جون ۱۸۲۸ کے کچھ بعد لکھا گیا (وزیر الحسن عابدی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق) یہ خط پنج آہنگ نسخۂ قلمی مکتوبہ ۱۸۳۵ء (۱۲۹۱ھ) میں شامل ہے۔

خط ۱۷

یہ خط بھی حالات سفر سے متعلق ہے۔

خلاصۂ تحریر اینکہ آخر از ستم گردونِ دوں ستوہ آمدہ خود را بدریا انداختہ ام یعنی ہم ازیں مقام کشتی بکرایہ گرفتہ و آدم و متاع وراں گنجیدہ۔ بسم اللہ مجریہا و مرساہا برخواندہ۔ سفینہ در رود جمن راندہ ام توقع اینکہ بالہ آباد رسیدہ توقفے در بنارس می خواہم ہمدریں بقعہ بکنار بندم"

خط ۱۸

"نہفتہ نماناد کہ ناخدایان ناخدا شناس بنارس درباب کشتی مضائقہ کردند بہر کہ برخوردم تا کلکتہ کم از یک صد روپیہ نہ طلبید و تا پٹنہ کم از بست روپیہ"

یہ خط بروز جمعہ نہم تاریخ ماہ جمادی الثانی ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۸ دسمبر ۱۸۲۷ کو بنارس سے تحریر کیا گیا۔

خط ۱۹

اس مکتوب میں اپنے کلکتہ پہنچ جانے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

پارہ از روز برآمدہ در کلکتہ رسید"

سہ شنبہ چہارم شعبان (سنہ ۱۲۴۳) (۲۰ فروری ۱۸۲۸ ء) یہ خط ورود کلکتہ کے بعد کسی قریبی تاریخ میں لکھا گیا ہے۔

خط ۲۰

باندا سے روانگی کے بعد لکھا گیا ہے

"بروز پنج شنبہ در کارواں سرا رسیدہ یک شنبہ بہ آرائش گرائید دو شنبہ کوس رحیل کوفتہ شبے بروستا بسر بردہ سہ شنبہ در چلہ تارا رسید۔

یہ دن ۱۸۲۷ء [۱۲۴۳] سے متعلق ہیں

خط ۲۱

مرزا نے اسٹرلنگ اور سائمن فریزر سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

"سیمیں فریزر اسٹینٹ سکرزرا دریافتم استقبال و متابعت و معانقہ و عطائے عطر و پان بمیان آمد...... امیرے باراؤ و فرہنگ موسود

بہ اندرو اسٹرلنگ درمدح دے قصیدہ مشتمل پنجاہ و پنج بیت انشا کردم و در آخر قصیدہ از حال خویش نگاشتم

یہ ملاقات ۲۰ اپریل ۱۸۲۸ مطابق ۱۲۴۳ھ کا واقعہ ہے اس کے بعد ہی یہ خط لکھا گیا ہوگا۔

خط ۲۲

مذکورہ مکتوب ۱۶ کے بعد زیر نظر خط کو لکھا جانا چاہیے

"ہمدریں روز ہا نامہ از دہلی رسید و کاشف ایں مدعا گردید کہ کاغذہائے فرستادہ من رسید و دست کار فرما آں را پذیرفت"

خط میں یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ مسٹر کال بروک فرماں روائے دہلی اس وقت متعلقہ علاقوں کا دورہ فرما رہے ہیں اس لیے ان کی واپسی تک تو انتظار کرنا ہے۔

خط ۲۳

خط میں درج ہے کہ "ایں عریضہ بروز ششم از ماہ شعبان رقم کردہ شد، بہ توسط میر صفات علی بہ لارکانجی مل فرستاد"

از روئے تقویم یہ ماہ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۸ء سے نسبت رکھتا ہے۔

خط ۲۴

[بنام نواب اکبر علی خاں متولی وقت امام باڑہ ہگلی بندر]

اس میں آموں کی فرمائش ہے، جس کے بارہ میں مرتب "پنج آہنگ" وزیر الحسن عابدی (مرحوم) کا خیال ہے کہ سفر کلکتہ سے واپسی کے بعد کسی موقع پر لکھا گیا ہوگا

لیکن یہاں یہ قیاس آرائی اس اعتبار سے محلِ نظر ہے کہ اس زمانہ میں کلکتہ سے دہلی آموں کا بھیجا جانا اور وہ بھی فصل میں دو تین بار کیا ممکن العمل تھا؟

اسی کے ساتھ اس فرمائش نامہ کا یہ فقرہ بھی توجہ طلب ہے

اہلِ کلکتہ بر آئند ......"

یہ خط مرزا نے کلکتہ میں رہتے ہوئے ہگلی بندر بھیجا ہوگا اور کسی قاصد کے ذریعہ اس کی ترسیل عمل میں آئی ہوگی۔

خط ۲۵

نواب صاحب کے نام یہ دوسرا خط نواب امین الدین خاں پسر نواب احمد بخش خاں مرحوم کے سفر کلکتہ کے سلسلہ میں لکھا گیا جس میں یہ خواہش کی گئی ہے کہ از راہِ کرم اس مہمانِ عزیز کی ہر طرح خاطر و مدارات کی جائے۔

نواب امین الدین خاں کے عزم سفر کلکتہ کی تاریخ ۸ ستمبر ۱۸۳۴ء [مطابق سنہ ۱۲۵۰ھ] ہے یہ خط اس کے کچھ بعد ہی کسی وقت لکھا جانا چاہیئے۔

خط ۲۶

منشی محمد حسن کے فرزند منشی احمد حسن کے جشن کتخدائی کے موقع پر لکھا جانے والا یہ خط وزیر الحسن عابدی کے خیال کے مطابق غالب کی ابتدائی نثری تحریروں میں سے ہے ممکن ہے سفر کلکتہ کے آغاز سے پیشتر لکھا گیا ہو۔

خط ۲۷

دربار اودھ میں پیش کیے جانے والے مدحیہ قصیدے سے متعلق اشارہ موجود ہے جو رائے صاحب رام کے کسی آدمی کے توسط سے بھیجا گیا تھا۔ یہ تذکرہ رائے چھجمل کے خط میں آیا ہے اس لیے زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ یہ قیام کلکتہ کے دوران تحریر

کیا گیا ہو۔ غالب نے یہ قصیدہ صنعت تعطیل میں انشا کیا تھا اکبر علی ترمذی نے اس کی پیش کش کی تاریخ ۱۵ ر اگست (۱۸۲۶) درج کی ہے اور لکھا ہے

پیش ی کے بعد فوری طور پر انھوں نے لکھنو کو چھوڑ دیا ہو یہ قرین قیاس نہیں ہے کچھ دن تو انھوں نے اس امید کے ساتھ ضرور قیام کیا ہو گا کہ دربار اودھ سے انھیں صلہ شایاں عطا کیا جائے گا۔

خط ۲۸

منشی التفات حسین کے نام یہ خط غالب نے کلکتہ سے اس وقت لکھا ہے جب ان کا مرافعہ ریزی ڈینٹ دہلی کی دادگاہ کی طرف واپس لوٹا دیا گیا تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ منشی التفات حسین کی معرفت جو ریزی ڈینسی دہلی میں کام کرتے تھے، افسرانِ متعلقہ سے سعی و سفارش کی کوئی صورت نکل آئے۔

اسے سنہ ۱۸۲۸ء کے نصف آخر میں لکھا جانا چاہیے کل بروک سنہ ۱۸۲۸ء تک دہلی کا ریزی ڈینٹ تھا، فرانس ہاکنس اس کے بعد دہلی کا ریزی ڈینٹ بنایا گیا اور سنہ ۳۰-۱۸۲۹ کے مابین اس عہدے پر فائز رہا

خط ۲۹

بنام مولوی نور الحسن، خط کی یہ عبارت خاص طور پر قابل توجہ ہے۔

درین نزدیکی یکے از برادران سخن ہائے پراگندۂ مرا کہ عبارت از نثر ست گرد آوردہ و صورت سفینہ دادہ۔

غالب کی نثری نگارشات کی جمع آوری اور ان کو ایک سفینہ نثر کی صورت دینے کا زمانہ ۱۸۳۴ء سے تعلق رکھتا ہے یہ خط بھی اسی زمانہ میں لکھا گیا غالب نے کلکتہ کے اپنے قیام کو جن الفاظ میں یاد کیا ہے اس سے بھی کچھ ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ کلکتہ سے واپسی پر

اچھا خاصا وقت بیت گیا ہے
"نشاطِ روزگارِ خاک نشینی کلکتہ بردل تازہ کرد"

خط نمبر ۳۰

(بنام مولوی سراج الدین)

زیر نظر مکتوب میں کلکتہ کے احباب مرزا احمد بیگ، ابوالقاسم خاں وغیرہ کا تذکرہ اور ان سے جدا ہو جانے کے غم کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہے اس سے اس کے زمانہ تحریر پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔
"رسیدن دہلی تلافی اندوہِ ہجراں نہ کردہ"
مرزا غالب ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ کو دہلی واپس آئے تھے یہ خط اس کے بعد ہی کسی قریبی زمانہ میں لکھا گیا ہوگا۔

خط نمبر ۳۱

تاریخ تحریر خط کے متن ہی میں موجود ہے

خط نمبر ۳۲

نواب فتح اللہ بیگ خاں جمنا داس ساہوکار اور شیخ علیم اللہ کے مابین کسی معاملہ سے متعلق ہے وزیر الحسن عابدی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق جس کا تصفیہ ۱۸۳۲ کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔

خط نمبر ۳۳

غالب نے لکھا ہے "مولوی نور الحسن کا مودت نامہ آیا اور گورنر کے لشکر کی روانگی

وقیام کے بارہ میں اطلاع بہم پہنچی" ممکن ہے یہ سنہ ۱۸۳۱ کے اوائل سے تعلق رکھتا ہو کہ اسی زمانہ میں غالب بے چینی کے ساتھ گورنر جنرل کی دہلی میں آمد کا اس خیال سے انتظار کر رہے تھے کہ وہ ایک بار پھر اپنا مرافعہ گورنر جنرل کے سامنے پیش کر کے استدعائے حکم آخر کریں۔

خط ۳۴

مرزا افضل بیگ کے مقرب الدولہ اور خاں بہادر کا خطاب پانے کا ذکر ہے وزیر الحسن عابدی کے بیان کے مطابق یہ مارچ ۱۹۳۱ کا واقعہ ہے خط اس کے کچھ بعد لکھا جانا چاہیے۔

خط ۳۵

داؤد بیگ کی معرفت مرزا غالب کو یہ اطلاع ملی کہ مولوی سراج الدین احمد اپنے وطن لکھنو پہنچنے کے ارادہ سے کلکتہ سے کانپور پہنچ گئے ہیں جس کے لیے غالب نے اس تشویش کا اظہار کیا ہے کہ اب کلکتہ میں ایسا کوئی نہیں رہا جو وہاں کے حالات سے اطلاع دیتا رہے یہ خط اواخر سنہ ۱۸۳۰ میں لکھا جانا چاہئے جب مسٹر اندرو اسٹرلنگ کا انتقال ہو چکا ہے اور مرزا اپنے مقدمہ کی طرف سے فکرمند ہیں۔

خط ۳۶

"مارچ کے سفر میں گورنر جنرل بہادر کی طرف سے اگر مہربانی ہو جانے اور حق بہ حقدار کو پہنچ جائے" غالب کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مکتوب فروری ۱۸۳۰ یا اس کے قریبی زمانہ میں لکھا گیا ہوگا۔

خط ۳۷

غالب کے یہ فقرے توجہ طلب ہیں، اس خلاف آباد کی عدالت گاہ سے اپنے آپ یک سو کر کے نقشِ دیوار بنا بیٹھا ہوں حاکمانِ صدر کی دادگری کی طرف سے میں نے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں۔ ۲۷ر جنوری ۱۸۳۱ سے پہلے کا خط ہے جو غالب کے مقدمے کے فیصلہ کی تاریخ ہے ماہ رجب کی ۲۱، اور جنوری کی ۱۲ تاریخ درج کی گئی جس کو سنہ ۱۸۳۰ء مطابق ۱۲۴۵ سے متعلق ہونا چاہیے "جام جہاں نما" کی معرفت کلکتہ میں شدت سے وبا پھیلنے کی بھی خبر ہے جو ۱۸۳۰ کا واقعہ ہے۔

خط ۳۸

خط میں دادگاہ دہلی سے مقدمہ کی رپورٹ کلکتہ بھیجے جانے کا ذکر ہے جو ۴ر مئی ۱۸۳۰ دہلی سے روانہ کی گئی ۲۱ مئی ۱۸۳۰ کو سٹرلنگ کی وفات ہوئی خط اس تاریخ کے کچھ بعد لکھا جانا چاہیے۔

خط ۳۹

مرزا احمد بیگ سے متعلق لکھا ہے "ہرگز میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی کہ ان کی آزردگی کا باعث ہو" یہ خط ۱۸۳۰ء کے مابین لکھا جانا چاہیے یہی وہ دور ہے جب غالب یہ سوچ رہے ہیں کہ ان کے "مخالف" نے ان کے بارے میں کچھ غلط سلط باتیں کی ہیں اور ان کے کان بھر دیے ہیں۔

خط ۴۰

غالب نے اپنے رپورٹ کے سلسلہ میں یہ اطلاع دی ہے کہ ماہ مئی کی چار اور ماہ ذی الحجہ کی گیارہ تاریخ تھی کہ میرے مقدمہ کی رپورٹ اس دادگاہ سے صدر روانہ ہوئی اس کے مفہوم سے غالب پہلے واقف ہو چکے تھے یہ از روئے تقویم ۱۸۳۰ سے متعلق

تاریخیں ہیں۔

خط ۴۱

نواب امین الدین احمد خاں نے کسی خاندانی مسئلے سے متعلق سرکار کمپنی بہادر سے رجوع کرنے کی نیت سے کلکتہ کا سفر اختیار کیا تھا جو آٹھ ستمبر ۱۸۳۴ کا واقعہ ہے غالب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے مولوی سراج الدین احمد سے یہ خواہش کی ہے کہ ان کی ہر طرح مدارات کی جائے اواخر ۱۸۳۴ میں تحریر ہونا چاہیے۔

خط ۴۲

موکب گورنری کی دہلی میں آمد اور پھر آفتاب کے برج حمل میں داخل ہونے کے وقت کوہستان شملہ کی طرف نکل جانے کا ذکر ہے۔ پریشانی کا سبب یہ خبر ہے کہ اس بار خیام گورنری الہ آباد تک آکر کلکتہ کی طرف مراجعت فرما ہوجائیں گے۔

یہ خط سنہ ۱۸۳۰ء کے اوائل میں لکھا جانا چاہیے جب غالب اپنے مقدمہ کی پیش کش کے سلسلہ میں پریشان تھے۔

خط ۴۳

زیر نظر مکتوب میں اس رپورٹ کا ذکر ہے جو داد گاہ دہلی سے مرزا غالب کے مرافعے کے سلسلہ میں کلکتہ بھیجی گئی ہے اور جس کی ایک نقل خود مرزا کو دہلی ریزیڈینسی کے کسی فرستادہ کے وسیلے مہیا کی گئی ہے۔

یہ نقل غالب کو ۱۲ مئی ۱۸۳۰ء کو بھیجی گئی تھی خط اس تاریخ کے بعد لکھا جانا چاہیے۔

خط ۴۴

مرزا احمد بیگ تپاں کی بیماری اور پھر حکیم احمد علی کے علاج سے افاقہ کی صورت پیدا ہونے کا تذکرہ ہے تپاں نے جون ۱۸۳۸ جہانِ فانی کو خیر باد کہا یہ خط اس سے پہلے ۱۸۳۳ء یا اوائل سنہ ۱۸۳۴ء میں لکھا جانا چاہیے۔

خط ۴۵

مقدمہ کے سلسلہ میں یہ اطلاع موجود ہے۔ میری داد خواہی کا معاملہ ہنوز اس مرحلہ میں ہے۔ لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگ نے میرے مقدمہ کے کاغذات دفتر دہلی سے طلب کیے ہیں یہ ۱۸۳۱ کا واقعہ ہونا چاہیے کلکتہ سے بھی اس موقع پر کاغذات منگا لیے گئے تھے۔

خط ۴۶

مرزا احمد بیگ کے فراق دائمی کی اطلاع ملنے پر لکھا گیا۔ مرحوم کے انتقال کی تاریخ ۱۸۳۴ ہے خط اس کے بعد کسی قریبی زمانہ میں تحریر کیا جانا چاہیے۔

خط ۴۷

لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگ کو خط میں بہت برا بھلا کہا گیا ہے۔ چونکہ ۱۸۳۲ء میں بنٹنگ کا زمانۂ گورنری ختم ہوگیا آنے والے گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ سے ساری توقعات وابستہ کی ہیں مارچ ۱۸۳۲ کے بعد کسی قریبی زمانہ میں لکھا جانا چاہیے۔

خط ۴۸

نواب امین الدین احمد خاں کے سفر کلکتہ کا حوالہ اس خط میں بھی ہے۔ والا قدر نواب امین الدین خاں بہادر نے سفر کلکتہ اختیار کیا میں ان کا ہم سفر بھی نہ بن سکا۔ ستمبر ۱۸۳۴

کے کچھ بعد کے زمانہ میں تحریر کیا گیا۔

خط ۴۹

دادگاہ دہلی سے صدرگاہ کلکتہ بھیجی جانے والی رپورٹ سے متعلق یہ ریمارکس آئے ہیں کیا کہوں وہ کس حد تک امیدوں کو گھٹانے اور غموں کو بڑھانے والی ہے اس میں اندرو اسٹرلنگ کی موت کی طرف بھی بہت ہی غم انگیز اشارے ہیں اب میں کس کی کارسازی پر تکیہ کروں کہ وہ وادی فنا کا سبک خرام تو گزر گیا۔

اسٹرلنگ کی وفات ۱۲ مئی ۱۸۳۰ء کو ہوئی خط۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد ہی کسی وقت لکھا گیا ہوگا۔

خط ۵۰

تاریخ تحریر کی نشان دہی "اکتوبر کی گیارہ اور جمادی الاول کی چار تاریخ" سے ہو جاتی ہے اور جس خط کا یہ جواب ہے وہ بست و نہم ستمبر کا لکھا ہوا مولوی سراج الدین احمد کا والا نامہ تھا۔ آئینۂ سکندر کے اوراق کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خط ۱۸۳۱ء میں لکھا گیا۔ یہ اخبار کلکتہ سے اسی سال کے شروع میں نکلا تھا۔

خط ۵۱

نسخۂ پنج آہنگ کی فراہمی کا وعدہ کیا ہے یہ غالباً کسی قلمی نسخے سے عبارت ہے ایسی صورت میں اس خط کو ۱۸۳۵-۳۶ کی تحریر ہونا چاہیے کوئی مطبوعہ نسخہ ۱۸۴۹ء کے بعد ہی مہیا کیا جانا ممکن تھا۔

خط ۵۲

مکتوب الیہ کی طرف سے غزلیں بھیجنے کی فرمائش کے جواب میں اپنی افسردہ خاطری کا

تذکرہ جس انداز میں کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط ۱۸۲۳ یا ۱۸۲۲ کے دوران لکھا گیا ہے جب غالب مقدمہ میں اپنے خلاف فیصلہ کی وجہ سے بہت شکستہ دلی کے ساتھ وقت گزار رہے تھے۔

خط ۵۳

یہ خط غالب کے افکار اور تہذیبی اقدار کی عیارگیری کے لحاظ سے نہایت اہم ہے پارسیوں کی قدیم نسلی اور زردشتیوں کی دانش پژوہی اور ہنرمندی کی تحسین کے ماسوا اس میں غالب نے تذکرہ آفتاب عالم تاب کے لیے اپنے حالات بھی قلمبند کیے ہیں۔

خط ۵۴

غالب نے اپنے دیوان ریختہ کا ایک نسخہ غلام امام شہید کی معرفت مولوی سراج الدین احمد کو بھیجا ہے اور لکھا ہے ابھی سفینۂ نثر کی تکمیل کے بارہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تو نگاہ والا کی نگاہِ لطف پر منحصر ہے۔ غالب کا اردو دیوان ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا اسی کا کوئی نسخہ غالب نے مولوی صاحب کو بھیجا ہوگا سفینۂ نثر اس سے آٹھ نو سال بعد چھپا۔

خط ۵۵

نواب امین الدین احمد خاں کے لیے ایک بار پھر لکھا ہے کہ ان کی مدارات کا خاص خیال رکھا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ فقرہ بھی موجود ہے کہ مرزا احمد بیگ کے اخلاف کا حال معلوم ہوا اسے ستمبر ۱۸۲۴ء کے اواخر کا خط ہونا چاہیے۔

خط ۵۶

لارڈ ولیم بینٹنگ کے زمانہ غالباً سنہ ۱۸۳۱ء کے دربار دہلی کا تذکرہ کیا ہے ماہ مارچ ۲۶ ویں تاریخ کو اس دیار میں پہنچے۔ شروع میں آدینہ روز اور ماہ اپریل کی ۱۳ تاریخ کا۔

تذکرہ ہے۔ مولوی فضل حق خیر آبادی نے عہدہ سررشتہ داری دہلی سے استعفیٰ دے دیا ہے غالب نے یہ خواہش کی ہے کہ اسے بطور خاص نمایاں کرکے آئینہ سکندر میں شائع کیا جائے۔

خط ۵۷

غالب نے اپنے مقدمہ پنشن کے سلسلہ میں صدرگاہ کلکتہ میں اپیل کی ہے ان کی عرض داشت کا انگریزی میں ترجمہ کرایا گیا ہے اس کو آگے بڑھانے کی دل وجان سے کوشش کرو اس خط کا زمانۂ تحریر ۳۲-۱۸۳۲ کے مابین ہونا چاہیے۔

خط ۵۸

کا ذکر ہے جس کے اوراق کی دید بقول غالب آنکھیں روشن ہوئیں حسام الدین حیدر خاں اور نواب امین الدین احمد خاں نے اس کا خریدار بننا پسند نہ کیا۔
یہ اخبار جنوری ۱۸۳۱ء میں نکلا تھا اس کے کچھ بعد ہی غالب نے اس کی توسیع اشاعت کی بات مولوی صاحب کی فرمائش پر سوچی اور اس کے لیے کوشش کی ہوگی۔

خط ۵۹

(بنام حکیم احسن اللہ خاں)

غالب نے لکھا ہے کہ دیباچہ "دیوان ریختہ" اور دیباچہ "گل رعنا"
"دیباچگی دیوان ریختہ گل رعنا می فرستم"
اول الذکر کا دیباچہ بست و چہارم ماہ ذی قعدہ، سنہ ۱۲۴۸ مطابق ۱۶ ماہ اپریل سنہ ۱۸۳۳ء کو مکمل ہوا گل رعنا کا دیباچہ قیام کلکتہ کے دوران ہی لکھا جا چکا تھا اسی صورت میں اس خط ماہ اپریل ۱۸۳۳ء کے بعد ہی کسی وقت لکھا جانا چاہیے۔

خط ۶۰

(بنام امیر الله سرور)

غالب نے اپنے مقدمہ کے بارہ میں لکھا ہے۔

چہار سال می گزرد کہ مقدمۂ من باجلاس کونسل در پیش است حالیا برآں سرم کہ چوں جزو اعظم کونسل لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگ بہادر دریں دیار در آید بدامنش در آویزم و استدعائے حکم آخر کنم۔

استدعائے حکم آخر کا کلمہ زیادہ اہم ہے اس لیے کہ غالب کے مقدمہ کا فیصلہ ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ کو ہو چکا تھا۔ بینٹنگ کا زمانہ ۱۸۳۲ء میں ختم ہوتا ہے یہی وہ سنہ ہے جب صدر گاہ دہلی میں غالب کے مقدمہ کو پیش ہوئے چار سال گزر رہے تھے

خط ۶۱

ولیم فریزر ریزیڈینٹ دہلی کے واقعہ قتل ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ کے بعد لکھا جانے والا خط ہے جس سے اس واقعہ کی نسبت سے بعض اہم امور پر روشنی پڑتی ہے۔

"والی فیروز پور مجرم قرار یافت و بحکم سرکار باتنے چند از خاصان خود اسیر شد، دوشنبہ ہم بمقدم صفر، حاکمے از حکام الہ آباد بدیں دیار رسید .....کہ خلاصۂ تحقیقات حکام دہلی یا معاون نظر بنگرد، بعد ثبوت جرم تعزیر پایہ بپایہ قرار دادہ کاربک عمو کند این ہنگامہ را فزوں تر از یک ماہ نکشید" ـــــ جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ اگست اور ستمبر ۱۸۳۵ کے مابین لکھا جانے والا خط ہے۔

خط ۶۲

(بنام شیخ امام بخش ناسخ) مرزا غالب نے لکھا ہے

"بتاریخ دوم اگست منتخب دیوان ریختہ درموئیں جامہ پیچیدہ بہ سبیل ڈاک انگریزی به خدمت فرستادہ شد تا امروز که بست و ششم جمادی الاول ست و ندانم چندم ماہ انگریزی ست"

از روئے تقدیم ۲۶ جمادی الاول (سنہ ۱۲۴۹) ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۳۳ء کے مطابق ہوتی ہے جو خط کی تاریخ تحریر ہے۔

خط نمبر ۶۳

نواب شمس الدین احمد خاں کے پھانسی پا جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

"مرزبان میوات با کریم خان سرہنگ خویش بحلقوم آویختہ شد جاگیر وے و ہر چہ بجاگیر پیوند داشت بحق سرکار ضبط گردید"

نواب شمس الدین احمد خاں کو ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا تھا خط اس کے کچھ بعد لکھا گیا ہے۔

خط نمبر ۶۴

ناسخ نے میر موسیٰ جان کے ہاتھ اپنا دیوان بھیجا ہے جس کے لیے غالب نے لکھا ہے۔

"ید بیضا عبارت از دیوان فروطانی عنوان دانست) نیز اسے دومین نقش قرار دیا ہے۔ ناسخ کے دیوان کی اشاعت اول سنہ ۱۲۵۴ مطابق ۱۸۳۸ء کی یادگار جو دیوان دوئم کے حاشیہ پر شائع ہوا ہے یا پھر اس سے کوئی قلمی نسخہ مراد ہے جو ناسخ نے سنہ ۳۸-۱۸۲۸ء کی مابین کسی وقت پر موسیٰ جان کے ہاتھ بھیجا ہوگا۔

پروفیسر وزیر الحسن عابدی نے اس غزل کے حوالے سے جو ناسخ کو بھیجی گئی ہے لکھا ہے۔

"خط میں جو غزل درج ہے وہ غالب نے ستمبر ۱۸۳۷ (۱۲۵۳ھ) اور جنوری ۱۸۳۸ء سے پہلے کہی تھی" اور اس کا زمانہ تحریر ۱۸۳۷ء قرار

دیا ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کی بھی نشاندہی کی ہے کہ یہ خط ۱۸۳۵ء کے مکتوبہ میں شامل ہے ایسی صورت میں اس کے زمانۂ تحریر کو ۱۸۳۷ء سے کیسے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔

خط ۶۵

(بنام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ)

زیر نظر مکتوب کے مشتملات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے اپنے تذکرہ "گلشن بیخار" کا مسودہ غالب کو بھیجا ہے۔ یہ تذکرہ ۵۰-۱۲۴۸ ہجری میں ترتیب و تعویذ کی منزل سے گزرا ہے ممکن ہے مکمل مسودہ اس کے کچھ بعد بھیجا گیا ہو خط میں مرزا احمد بیگ کے انتقال کو چار سال پیشتر کا واقعہ قرار دیا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ ۱۸۳۸ کے قریبی زمانہ میں لکھا جانے والا خط ہے۔

خط ۶۶

تذکرہ گلشن بے خار ۵۰-۱۲۴۸ھ (مطابق ۳۴-۱۸۳۳) میں زیر ترتیب تھا اسی زمانہ میں یا تکمیل روایت کے بعد نظر ثانی کے وقت اس کا مکمل مسودہ یا اجزائے مسودہ غالب کو بھی ادبی مشورے یا نگارش تقریظ کے ــــ خیال سے بھیجے گئے ہوں گے مفتی صدرالدین آزردہ اور میر امداد علی آشوب کا ترجمۂ اشعار اس میں شامل نہ کئے جانے پر مخلصانہ احتجاج کیا ہے۔

خط کی تحریر کا بھی یہی زمانہ ہونا چاہیے۔

خط ۶۷

شیفتہ سے مرزا غالب کے تعلقات اس خط کی تحریر کے زمانہ میں شگفتہ نظر نہیں آتے۔ غالب نے لکھا ہے کہ اہلِ وطن سے آپ کس قدر کبیدہ خاطر تھے کہ دہلی کو چھوڑ کر

جہانگیر آباد پہنچ گئے اور پھر لکھنو کا رخ کر لیا خدا کرے کہ وہاں یارانِ پری چہرہ کا دیدار اور جادو نگار شعرا کی بزمِ سخن رنجِ راہِ سفر کی تلافی کر دے"۔ اسی کے ساتھ یہ رباعی لکھا ہے کس را نبود رشے..... وزیر الحسن عابدی نے اس نگارش سے متعلق لکھا ہے

خط ۶۸

خط کی تحریر کے زمانہ میں غالبؔ اور شیفتہؔ کے تعلقات شگفتہ نہیں جس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ آپ نے رسم نامہ و پیام اٹھا دی اس شکر رنجی کا زمانہ وہی ہونا چاہئے جو شیفتہ کے سفرِ حج کا زمانہ ہے حج کی مبارکباد جس خط میں دی گئی ہے وہ بھی اسی ذہنی ماحول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خط ۶۹

ترسم بکعبۂ اسلامیاں دہند،

اس خط میں حج بیت اللہ سے واپسی کا ذکر ہے۔ شیفتہؔ ۲۳ ذی الحجہ سنہ ۱۲۵۲ھ ۱۸۴۱ء میں سفرِ حج بیت اللہ سے واپس آئے تھے تحریرِ خط کا زمانہ بھی اس خط کے کچھ بعد ہونا چاہئے۔

خط ۷۰

شیفتہ کی طرف سے جو آم بھجوائے گئے ان کی تعریف میں ہے مگر زیرِ نگارش خط کے زمانہ پر اس سے کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

خط ۷۱

غالباً مذکورہ خط کے بعد لکھا گیا جس کی طرف اس فقرہ میں اشارہ موجود ہے آموں کی ثمر افشانیاں ختم نہیں ہوئیں کہ میرے شکوہ سنجی کا کوئی موقع ہو۔

خط ۲

شہریالال قلعہ کے ایک مشاعرے کا ذکر ہے۔ جس میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا صہبائی نے بھی شرکت کی تھی۔ اور غالب نے جس میں ایک تازہ غزل "رودادِ اثر بستانم" پڑھی تھی۔ تاریخ تحریر بست وسوم ماہ مارچ اور وقت ہنگام نمازِ عصر یہ مشاعرہ ۱۸۴۳ء میں ہوا تھا خط اس کے بعد کسی وقت تحریر ہوا۔

خط ۳

شادم کہ رسیدن نامہ

یہ خط بھی گویا ایک مشاعرے کی مختصر روداد ہے جس میں غالب نے فلک نخواست وملک نخواست زمین میں غزل پڑھی تھی اور غزل طرح گریانم نمی آید زمیں میں سنائی نواب ضیاالدین احمد خاں نے "صد سال می تواں بہ تمنا گریستن" آئندہ ہونے والے مشاعرے کے لئے بطور مصرع طرح تجویز کیا۔

غالب نے کوئی تاریخ نگارش درج نہیں کی وزیرالحسن عابدی نے ۲۳ر تاریخ بروز جمعہ ۲۴ر مارچ ۱۸۴۳ء اس کی تاریخ متعین کی ہے

خط ۴

اس خط میں شکر رنجی وشکوہ سنجی کا اندازہ ملتا ہے اور زمانۂ بدگمان غالب وہی ہے جو اس سے پیشتر ان خطوط کا ہے جو شیفتہ کو ان کے سفرِ حج کے قریبی زمانے میں لکھے گئے

خط ۵

یہ خط بھی مشاعرے سے متعلق ہے اس میں میر نظام مجنوں اور مولوی امام بخش صہبائی نے بسبب علالت شرکت نہیں کی تھی۔ سحابی نامی شاعر نے جو فارسی گو ہے "بہ تمنا گریستن" زمین سخن میں غزل پڑھی ہے وزیرالحسن عابدی نے اس کی تاریخ

۲۱ مارچ سنہ ۱۸۴۳ مطابق سنہ ۱۲۶۰ قرار دی ہے خط اس کے کچھ بعد لکھا گیا ہے۔

خط ۷۶

(در خصت یکرنگی زبان یعنی پارسی بے آمیزش عربی)

بے تو گزلیستہ ام.....

یہ خط ذکر بہار کی رعنائیوں سے آراستہ ہے اور زمانۂ تحریر کے بارہ میں اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " دریں روزگار باندازۂ رفتار ستارۂ روز بزبان ترسایاں بست و دوم از اپریل تواں گفت " لیکن موجودہ صورت میں سال اور سن کا تعین دشوار ہے قلمی نسخے مکتوبہ ۱۸۳۵ء میں شامل ہے۔

خط ۷۷ (الف)

رشکِ طالب و فخرِ غالب

غالب نے شیفتہ کی غزل کی تعریف کی ہے اور اپنے قصیدہ میں " بہ زمین گریستن " کے لئے لکھا ہے

" باآنکہ از دلم بہ زبان رسیدہ واز زبان بدر تراویدہ "

آگے چل کر لکھا ہے

" دریں مشاعرہ کہ گزشت خاک زمین گیر من غبار چشم ریختہ گویاں نگشت غزل خود پیش از یک ہفتہ روز غزل خوانی بخدمت حضرت آزردہ فرستادہ ام "

اس مشاعرے سے متعلق وزیر الحسن عابدی نے لکھا ہے غالب نے اپنی جس غزل کا خط میں ذکر کیا ہے وہ اپریل ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹) کے مشاعرے کے لئے کہی تھی اور ۳۱ مارچ یا پھر یکم اپریل ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹) کو آزردہ کو بھیجی تھی یہ خط شنبہ ۸ اپریل یا اس کے چند دن بعد کا ہو سکتا ہے۔

خط ۷۷ (ب)

ہاں خواجہ بے پروا ــــ وزیر الحسن عابدی نے لکھا ہے یہ منظوم خط دراصل نثر مرجز میں ہے نظامی گنجوی کے "نثر مرجز" کے نمونے پر لکھا گیا ہے۔ تاریخ نگارش کی طرف کوئی خاص اشارہ نہیں۔

خط ۷۸ ایضاً

تاریخ نگارش کا تعین نہ ہو سکا۔

خط ۷۹

(بنام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ)

مردم بہ فرط ذوق۔ الخ۔ غالب نے یہ خط جس شعر سے شروع کیا ہے وزیر الحسن عابدی کا بیان ہے کہ وہ ۱۸۳۸ (۱۲۵۴ھ) پیشتر کی تحریر ہے

خط ۸۰ ایضاً

غالب نے نواب شیفتہ کے نام اپنے زیر نظر مکتوب میں یہ فقرہ بھی قلمبند کیا ہے

قبلہ مزد چہل سالہ جگر کاوی آنست کہ فراہم آوردم اکنوں آبم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست۔

اگر یہ مانا جائے کہ غالب نے مشق سخن اپنی پندرہ برس کی عمر میں شروع کی تھی تو اس تحریر و نگارش کے وقت ان کی صاف عمر کو پچپن برس ہونا چاہیے خط کا زمانۂ تحریر از روئے قیاس ۱۸۵۲ء ہے لیکن وزیر الحسن عابدی کی روایت میں یہ ۱۸۲۵ء کے مکتوبہ نسخہ میں شامل ہے اس کی کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے؟ اس وقت تو ان کی عمر بھی چالیس برس نہیں

خط ۸۱

بنام مولوی فضلِ حق خیر آبادی

لالہ ہیرالال کی زبانی مولوی صاحب کے ہم سائے میں آگ لگنے کی خبر سن کر سانحہ کی تفصیلات اور دریافت خیر و عافیت مزاج کے لئے یہ خط بھیجا گیا ہے۔
تاریخ تحریر پنج شنبہ ربیع الاول درج ہے وزیر الحسن عابدی نے از روئے تقویم نگارش کی تاریخ کا تعین ۲۶ ربیع الاول ۱۲۵۱ھ مطابق ۲۱ جولائی سنہ ۱۸۳۵ کیا ہے۔
قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۸۳۵ء میں یہ خط شامل ہے۔

خط ۸۲

غالب نے عرفی شیرازی کے قصیدہ کی زمین میں (درجہاں انداختہ) قصیدہ لکھا ہے اور اس پر مولانا سے داد چاہی ہے۔
یہ قصیدہ دیوانِ غالب فارسی کتابت جولائی ۱۸۳۸ء میں شامل نہیں ۱۸۴۱ میں موجود ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ قصیدہ ۱۸۳۸-۴۱ء کے مابین کہا گیا اور اسی زمانہ میں اس کے اشعار یا مکمل قصیدہ مولانا فضلِ حق کو بھیجا گیا۔

خط ۸۳

خط بنام میر اعظم علی مدرس مدرسہ اکبر آباد۔

غالب نے اس خط میں یہ فقرہ بھی لکھا ہے " درازی زمان فراق بگمان مخدوم شانزدہ سال است و بدانست نامہ نگار کم از بیست سال نیست "۔
اگر اکبر آباد سے رخصت کو غالب کی پندرہ برس کا واقعہ تصور کیا جائے تو یہ خط اپنے

زمانۂ نگارش کے لحاظ سے سنہ ۱۸۳۵ء (۱۲۵۱ھ) سے تعلق رکھتا ہے۔

غالب نے یہ بھی لکھا ہے اکنوں شش‌شیں سال است کہ خانماں بباد دادہ و دل بر مرگ نہادہ بکنجے نشستہ ام اگر اس سے مراد صدر گاہ کا فیصلہ ہے تو پھر اس کی تحریر کا زمانہ ۱۸۳۶ (۱۲۵۲) ہونا چاہئے۔ وزیر الحسن عابدی نے ۱۸۳۴ء کو اس لئے صحیح خیال کیا ہے کہ وہ کلکتہ سے غالب کی واپسی کو بنیاد مان کر چلے ہیں جو غالباً صحیح نہیں۔

خط ۸۴

نواب حسام الدین حیدر خاں کی جانب سے یہ عرض داشت اور اسی کا ادبی عکس پیش کرنے والی ایک دوسری تحسینی تحریر کی پیش کش کے زمانہ کا کوئی تعین نہ ہو سکا۔ ممکن ہے ابتداءً نواب غازی الدین حیدر کی لقب شاہی کے ساتھ اورنگ نشینی کے موقع پر یہ خوبصورت تحریر پیش کی گئی ہو۔ اور بعد ازاں نواب نصیر الدین حیدر کی سریر آرائی کے موقع پر اسے نئے سرے سے نذر گزارنے کی کوشش عمل میں آئی ہو۔

خط ۸۵

شاہِ اودھ نے کوئی خواب دیکھا ہے اور اس ضمن میں نواب حسام الدین حیدر نے غالب سے فرمائش کی ہے کہ اس موقع پر اظہار تہنیت کے لئے کچھ لکھیں۔ غالب نے بطور معذرت کچھ جملے تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"چہار رباعی در مدح خوابیکہ شاہِ والا نظر دیدہ است بنظر می گزرانم"

مگر اس سے ان رباعیوں کے زمانۂ تحریر پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ ڈاکٹر آصفہ زمانی سے معلوم ہوا کہ یہ خواب امجد علی شاہ نے دیکھا ایسی صورت میں ان رباعیات کی تحریر کا زمانہ ۱۸۵۰ء کے آس پاس ہونا چاہیے۔

خط ۸۶ ایضاً

جن غزلوں کے اشعار غالب کے اس مکتوب میں موجود ہیں وہ قلمی دیوانِ فارسی کتابت ۱۸۳۸ء میں شامل ہیں مشمولۂ پنج آہنگ ۱۸۴۹ء

خط ۸۷

مکتوب نگار نے نواب صاحب سے اس خط میں یہ خواہش کی ہے کہ وہ لالہ سرلال کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ انھیں ایک ہزار روپیہ قرض دے دیں۔

"گیرند و یکہزار روپیہ دیگر بکارش آئند"

یہ خط پنج آہنگ مطبوعہ سنہ ۱۸۵۲ (۱۲۷۰) کے اضافات میں موجود ہے۔

خط ۸۸

مرزا کسی انگریز افسر سے ملنے کے لیے جانا چاہتے تھے گرمی کی شدت کے باعث انھوں نے نواب صاحب سے پینس بھیجنے کی فرمائش کی ہے۔ پنج آہنگ مطبوعہ ۱۸۵۲ کے اضافات میں سے ہے۔

خط ۸۹ ایضاً

موجودہ معلومات کی روشنی میں اس کی تحریر کے زمانہ کا تعین مشکل ہے۔

خط ۹۰ ایضاً

اس خط میں لالہ ہری چند کے کسی کام کے سلسلہ میں اسکز کا نام آیا ہے یہ انگریز حاکم نواب علاء الدین احمد خاں علائی کا دوست تھا اس نے ایک بار غالب کو شراب کا تحفہ بھیجا تھا جس کے ساتھ علائی سے لکھوایا ہوا قطعہ بھی تھا۔ پنج آہنگ مطبوعہ ۱۸۴۹ میں شامل ہے۔

خط ۹۱ ایضاً

عرض داشت

اس سے پیشتر جس عرض داشت کا تذکرہ آیا ہے یہ اسی کی دوسری روایت ہے جسے بعض تبدیلیوں کے ساتھ غالباً دوبارہ پیش کیا گیا تھا۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں زمانہ کا تعین دشوار ہے۔

خط ۹۲

میر ولایت حسین کے نام اس خط میں ان کے عہدۂ قاضی القضاتی پر مبارک باد دی گئی۔ زمانۂ تحریر کا تعین نہ ہو سکا۔

خط ۹۳ ایضاً

خط کے عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلکتہ کے زمانہ قیام میں تحریر کیا گیا جب غالب نے مولوی محمد علی صدر امین باندا سے بطور قرض ایک ہزار روپیہ مانگا تھا۔ [۱۸۲۸ء کے نصف آخر کے دوران تحریر کیا جانا چاہیے۔]

خط ۹۴

مولوی ولایت حسین خاں کے نام اس خط میں ذوالفقار الدولہ کے چند خاص احباب کے دہلی آنے اور غالب سے ملاقات کرنے کا ذکر ہے پرسشِ احوال کے دوران معلوم ہوا کہ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے وارثوں کے مابین تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

زمانہ تحریر کا تعین مولوی صاحب کی تاریخ وفات سے آسانی ہو سکتا ہے جن تک رسائی ممکن نہ ہوئی۔

خط ۹۵

بنام میر سید علی غمگیں عرف حضرت جی
غالب نے اپنے مقدمۂ پنشن کے بارہ میں حضرت جی کو یہ معلومات فراہم کی ہیں۔

> ازیں پیش سالے چند بہ محکمۂ ریزیڈینسی دہلی در کشاکش ماندہ و روزگارے دراز در انجمن فرماں دہان کلکتہ پیچ و تاب خوردہ اکنوں دو سال است کہ آں داوری بہ لندن رفتہ۔

کلکتہ میں ابتدائی فیصلے کے دس سال بعد تک مرزا چارہ جوئی کرتے رہے اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں سنہ ۱۸۴۷ یا اس کے قریبی زمانے تک جاری رہا ادھر سے آخری فیصلہ صادر ہونے پر لندن تک اس مقدمہ کو پہنچایا جس پر اب دو برس بیت رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس خط میں میجر جان جاکوب کی طرف فرمائش کا ذکر ہے۔

> دریں نزدیکی میجر صاحب عنایت فرجان جاکوب بہادر در نامہ بمضمون طلب تاریخ تعمیر دولت کدہ بمن فرستادہ اند، ورقے بجواب ہر دو مکتوب کہ مشتمل قطعہ تاریخ است در دنورد ایں پوزیشن نامہ فرستادہ می شود،

میجر کے نام بھیجے جانے والے قطعہ تاریخ سے خط کی تحریر کا زمانہ ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹) قرار پاتا ہے۔

خط ۹۶

خط میں میجر جان جاکوب کے بنائے ہوئے مکان کا تحسینی انداز میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے۔

> آرام کدہ کہ بگوالیار طرح افگندہ اند، و تاریخ تعمیر آں از نامہ نگار آرزو کردہ ...... سوگند کہ دل بغن تاریخ و معمارانہ نہادہ۔

۶ شعروں پر مشتمل جو قطعہ تاریخ اس موقعہ پر غالب نے لکھا ہے اس کے آخری

مصرع "آسمانی پایہ کاخ دلنشیں" سے تاریخ نکالی ہے جس کے اعداد ۱۲۵۵ ہوتے ہیں
یعنی ۱۸۳۹ء اسی زمانہ میں یہ خط بھی لکھا گیا ہے۔

خط ۹۷

میجر نے مذکورہ مکان میں جو کنواں بنوایا ہے غالب سے اس کی تاریخ کہلوائی ہے
جو تعمیر کے ساتھ اس شعر میں بھی موجود ہے،

خورسند زمیں گفت و دریں زمزمہ دل بست
ویں تعمیہ را خوبتر از گنج گہر یافت

خورشید زمیں مادۂ تاریخ ہے اور دل کے اعداد کا تعمیہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خط بھی
مذکورہ خط کی طرح ۱۲۵۵ کی یادگار ہے۔

خط ۹۸

میجر جان جاکوب کی طرف سے کلام بھیجنے کی فرمائش کے جواب میں مرزا نے یہ خط
تحریر کیا ہے اور اس کا اظہار کیا ہے کہ ان کے پاس اگر کچھ ہے تو وہ ایک بے سر و پا
مسودہ اور ایک ورق ورق تحریر ہے۔ یہ خط دیوانِ ریختہ کی اشاعتِ اول سنہ
۱۸۴۱ء (۱۲۵۷ھ) سے کچھ پہلے تحریر ہونا چاہیے۔

خط ۹۹

یہ خط مرزا نے اپنے دوستوں ریختہ کے انطباع کے قریبی زمانہ میں لکھا ہے
"دیوانِ ریختہ کہ در نا تمامی تمام است عجیب نیست کہ ہم دریں ماہ
بتمامی و آنگاہ بنظرگاہِ سامی رسد۔"
اشاعتِ اوّل نومبر ۱۸۴۱ مطابق رمضان المبارک ۱۲۵۷ ھجر النبوی سے تعلق
رکھتی ہے۔

خط ۱۰۰

میجر مذکور نے دیوانِ حافظ کی تصحیح کی ہے اور اسے شائع کرایا ہے۔ غالباً اس کی تقریظ کی فرمائش کی ہے۔ یہ تقریظ غالب کی نثری تحریروں میں موجود ہے بگمانِ غالب اس کا زمانۂ تحریر بھی ۱۸۴۰ء کے قریب ہے۔

خط ۱۰۱

بنام جیمس طامسن بہادر سکرتر نواب گورنر اکبرآباد

یہ وہ زمانہ ہے جب غالب نے اپنے پنشن کے مقدمہ کو ولایت بھیج رکھا ہے لیکن ہنوز اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

ہنوز شبِ انتظار را سحر نہ دمیدہ و حکم مقدمہ از دادگاہِ ولایت نہ رسیدہ

دادگاہِ ولایت سے مقدمہ کا فیصلہ سنہ ۱۸۴۲ میں ہوا۔ جیمس طامسن ۱۸۴۱-۱۸۴۷ کے مابین حکومت اکبرآباد کا سکریٹری تھا۔ یہ خط ۱۸۴۱-۱۸۴۰ کے درمیان کسی وقت لکھا جانا چاہیے۔

خط ۱۰۲

یہ خط مذکورہ خط کے بعد لکھا جانا چاہیے جب طامسن حکومت ہند کا سکریٹری برائے امورِ خارجہ تھا جس کا زمانہ ۱۸۴۲-۴۳ ہے۔

خط ۱۰۳

طامسن کے صوبہ غرب و شمال کے لفٹیننٹ گورنر بنائے جانے پر مبارکباد کے طور پر یہ خط عرض داشت معرض تحریر میں آیا۔ طامسن دسمبر ۱۸۴۳ء اس عہدے پر فائز ہوا تھا۔

ایضاً خط ۱۰۴

ماہ فروری کی ۲۵ تاریخ اور جمعہ کے دن قلعہ میں ہونے والے ایک مشاعرہ کا ذکر ہے جس میں مرزا حیدر شکوہ اور مرزا انور الدین بہادر نے بھی شرکت کی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہنری لارنس لاہور کا کمشنر ہے۔ یہ سقوط لاہور ۱۸۴۹ کے بعد کی بات ہونی چاہئے۔

یہ خط بگمانِ غالب سنہ ۱۸۵۲ ۱۲۶۹ھ میں لکھا گیا۔

خط ۱۰۵

اس خط کے نگارش کے وقت میر مہدی مجروح جے پور میں ہیں لیکن اس سے خط کے زمانۂ تحریر پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی۔

خط ۱۰۶

منشی نبی بخش حقیر کے نام اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غالب کے واقعۂ اسیری (۱۸۴۳ - ۱۲۵۹) کے قریبی زمانہ سے متعلق تاثرات ہیں۔ اس میں قلعہ کے ایک مشاعرے کا بھی ذکر آیا ہے۔

یکے از شاہزادگان تمر خانیہ بزم سخن آراست و سخن سنجاں را بغزل خوانی خواند مرا کہ بگفتن ریختہ سرے نماندہ روزے کہ شب بداں انجمن باید رفت خاصا ہنگامے کہ سوارہ می بردم بیتے چند بے خواست از دل غم زدہ

یہ تاریخیں جن میں بزم مشاعرہ منعقد ہوئی از روئے تقویم سنہ ۱۸۴۳ (۱۲۵۹) سے تعلق رکھتی ہیں۔

خط ۱۰۷

بنام مولوی رجب علی خاں

اس مکتوب میں کسی ایسے خط کا ذکر کیا گیا ہے جو اس سے ایک سال پیشتر ماہ مارچ ۱۸۵۱ء کو لکھا گیا تھا جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

"یارب آں نیایش نامہ کہ در ماہ مارچ سال یکہزار و ہشت صد و پنجاہ و یک عیسوی رواں داشتہ ام تا مارچ سال رواں ....."

نیز اس میں "مہر نیم روز" کے سلسلۂ نگارش سے متعلق یہ بیان موجود ہے

"از تاریخ تاجداراں ..... جزوے چند بخش بیست حمد ولعت و منقبت ...... از کشور کشایاں تا نصیر الدین سلطان ہمایوں سخن راندہ ام"

یہ بھی خط کے اسی سال تحریر کی طرف اشارہ یعنی ۱۸۵۲ء میں لکھا جانے والا خط ہے۔

خط ۱۰۸

بنام آغا محمد حسین فدائی بزرگ شیرازی وفا

خط برہان قاطع پر لکھی جانے والی تحقیقی تنقید سے متعلق ہے۔ قاطع برہان پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

"نگارش خواجہ دربارہ قاطع برہان نامہ نگار را بشگفت زار افگند جامع برہان قاطع کہ یکے از عوام دکن است"

جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ خط قاطع برہان کی اشاعت کے بعد کسی وقت لکھا گیا۔

خط ۱۰۹

حکیم مومن خاں مومن کے نام زیرِ نظر مکتوب میں غالب نے اپنی ایک رباعی لکھی ہے۔ لیکن اس رباعی کی تخلیق کا زمانہ کیا ہے اس کا تعین نہ ہو سکا، وزیر الحسن عابدی کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق یہ خط ۱۸۳۵ء کے مکتوبہ نسخہ میں شامل ہے۔

خط ۱۱۰

بنام منشی فضل اللہ خاں

زمانۂ تحریر سے متعلق موجودہ معلومات کی روشنی میں کو فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ پنج آہنگ مطبوعہ سنہ ۱۸۴۹ء میں شامل ہے۔

خط ۱۱۱

بنام میر احمد حسین میکش

زمانۂ تحریر سے متعلق موجودہ معلومات کی روشنی میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکت۔

خط ۱۱۲

بنام منشی رحمت اللہ خاں

زمانۂ تحریر سے متعلق موجودہ معلومات کی روشنی میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

خط ۱۱۳

زمانۂ تحریر سے متعلق موجودہ معلومات کی روشنی میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

خط ۱۱۴

بنام مولوی حبیب اللہ ذکاؔ منشی نواب مختار الملک نائب والی حیدرآباد

خط میں کئی اطلاعات قابلِ توجہ ہیں۔"

"منتخب دیوانِ ریختہ کہ تازہ بکالبد انطباع فرو ریختہ اند"

خواہش مجموعۂ فارسی در گرندہ دریں اشارت موجودہ است۔

کہ ایں بکار نیاید بیش کش آں باید آں خود اسلئے ست کہ عشی ندارد

یک نیمہ از "پرتوستان" انجامید "مہر نیم روز" نام یافت "ماہ نیم ماہ"

ہم چوں ماہ شب وہشت شبہ ناپدیدار ہ چوں "پنج آہنگ" "مہر نیم روز"

و "دستنبو" دارند۔ آنچہ اکنوں فرستم ہماں مجموعہ نظم فارسی تواند بود کہ

جامہ گرد آور ہیچ گاہ نداشت"

داخلی شہادتوں اور ان سے اخذ نتائج کے علاوہ تاریخ تحریر بھی درج ہے۔ یازدہم ربیع الاول سنہ ۱۲۷۸ مطابق سنہ ۱۸۶۱ [کلیات نظم فارسی کی اشاعت ثانی ۱۸۶۳ مطابق ۱۳۸۰ میں ہوئی۔

خط ۱۱۵

بنام مظفر حسین خاں

اس خط میں جو بگمان غالب دہلی سے کلکتہ روانہ کیا گیا ہے امیر حسن خاں کا ذکر آیا ہے جن کا مختصر ترجمہ احوال پیش کرتے ہوئے عبد الغفور فساخ نے لکھا ہے۔

بسمل تخلص امیر حسن خاں، خلف عاشق علی خاں سفیر شاہِ اودھ باشندۂ کاکوری کلکتہ میں رہتے تھے، بیشتر فارسی کہتے تھے اور وہیں انتقال ہوگیا۔ فساخ نے سالِ وفات نہیں دیا۔ غالب کے اور خط سے جو خود بسمل کے نام لکھا گیا ہے اور اسی مجموعہ میں شامل ہے اسی ذہنی ماحول پر مزید روشنی پڑتی ہے جس کی طرف زیر نظر خط کے یہ فقرے

اشارہ پنج ہیں۔

روشن دل، مکرمی امیر حسن خاں بسمل را با من آشتی دہند زنگار آئینہ
گراں نشیں نیست کہ کف بزدودن تواں سود، وخوش دلی درمیانہ
ہم روئے نتواند نمود

خط کی تاریخ تحریر بست و دوم جولائی (۱۸۴۴ء) ہے جس کو سنہ ۱۲۶۰ھ کے مطابق ہونا چاہیے یہ خط بھی اسی خط کے سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے۔

خط ۱۱۶

مظفر حسین خاں کے نام اس دوسرے خط میں ایک تحسینی قطعہ بھی زیب نگارش ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی تاریخ نہیں مولانا غلام رسول مہر نے زمانۂ تحریر یا تاریخ سے کوئی بحث نہیں کی از روئے قیاس اس خط کو بھی ۱۸۴۴ کے آس پاس تحریر کیا جانا چاہیے۔

دونوں خطوط پنج آہنگ مطبوعہ ۱۸۴۹ میں شامل ہیں

خط ۱۱۷

بنام مولوی صدر الدین

ایضاً خط نمبر ۱، ا ب [یہ دونوں خط پنج آہنگ مکتوبہ ۱۸۳۵ء میں شامل ہیں]

خط ۱۱۸

بنام منشی ہرگوپال دوس تفتہ۔ تاریخ تحریر ۱۰ فروری ۱۸۴۹ [مطابق سنہ ۱۲۶۵ھ] موجود ہے۔

خط ۱۱۹

بنام ضیاء الدین احمد خاں

گرکسا مے ۱۰ الکنوا صبح

پیری در میدان است مگر شمع و چراغ انجمن فردمردہ" ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے یہ خط چالیس یا پینتالیس برس کی عمر کے بعد لکھا گیا اور غالب کی یہ عمر ۴۲-۱۸۴۷ کے مابین ہے کم و بیش یہی دور اس خط کا زمانۂ تحریر ہونا چاہئے۔

لیکن اگر بڑھاپے کا آغاز پچاس برس کی عمر کو قرار دیا جائے تو زمانۂ تحریر سنہ ۴۷-۱۸۵۰ کے مابین کوئی سال قرار پائے گا۔

خط نمبر ۱۲۰

نواب ضیاءالدین احمد خاں کے سفر اکبر آباد کے زمانہ میں معرض تحریر میں آیا۔ تاریخ تحریر کا تعین موجودہ معلومات کی روشنی میں ممکن نہیں۔ یہ خط اور اس سے بیشتر زیر نگارش آنے والا مکتوب پنج آہنگ، مطبع سلطانی سنہ ۱۸۴۹ میں شریک ہیں۔ وزیر الحسن عابدی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ان کا زمانہ نگارش ۴۹-۱۸۴۵ کے مابین ہے۔

خط نمبر ۱۲۱

بنام نواب محمد علی خاں عرف مرزا حیدر ـــــ اس میں قطب الدولہ کی معرفت واجد علی شاہ فرمانروائے لکھنو کی خدمت میں قصیدہ بمعہ عرض داشت پیش کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

> قطب الدولہ مروی کردہ قصیدہ و عرض داشت بنظر جہاں دار دارا دربان در آورد ـــــ مولانا ضمیر لبفرمان گیتی خدیو آں نظم و نثر را ..... بہ پیش گاہ سریر سپہر نظیر خواندند قطب الدولہ فرماں رفت کہ بہ ہنگام عرض داشت را دوبارہ بنظر گزرا

لیکن اس کی نوعیت نہ آئی اور قطب الدولہ کا ستارۂ اقبال معرض زوال میں آگیا، یہ واقعہ سنہ ۱۸۵۰ء مطابق ۶۷-۱۲۶۶ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد ہی غالب نے کسی وقت یہ خط لکھا ہوگا۔

خط ۱۲۲

بنام مولوی عبدالوہاب لکھنوی

مولوی صاحب کے نام زیر نظر خط میں سلطان العلماء کے فرزند کے سانحۂ وفات سے متعلق ایک قطعۂ تاریخ لکھا ہے تاریخ "داغ جگر گداز ہائے" سے مستفاد اعداد سے برآمد ہوتی ہے جوازروئے تقویم ۱۲۶۶ ھ بمطابق ۱۸۵۰ء ہے تحریر مکتوب کا زمانہ بھی یہی ہونا چاہئے۔

خط ۱۲۳

بنام مجتہد العصر سید محمد صاحب

"گناہ من جز پر فتن فرمان شاہ نیست تا دریں ناخوش و ناروا ہنگامہ دیگر چہ فرماں رود..... دریں مثنوی مضمون از خسرو ست و لفظ از من چنانکہ در رامش زخمہ از مغنی و صدا از تار"

خط کی اس عبارت کا ایک خاص پس منظر ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے سید مسعود حسن رضوی نے لکھا ہے۔

...... علم کے قضیہ کے متعلق مرزا حیدر شکوہ (بن مرزا کام بخش بن مرزا سلیمان شکوہ) کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں وہ کلکتہ میں مقیم تھے بہادر شاہ ظفر بیمار ہوئے اسی بیماری کی حالت میں انھوں نے خواب میں خود کو حضرت عباس کی درگاہ میں علم چڑھاتے ہوئے دیکھا ...... جب بادشاہ کو صحت ہوئی تو انھوں نے سونے کا ایک علم بنوا کر مرزا حیدر شکوہ کے بھائی مرزا نور الدین کے ہاتھ لکھنو بھیجا...... مرزا حیدر شکوہ کی معرفت بہادر شاہ کا خط موصول ہونے پر مجتہد العصر نے چھ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۰ھ (مطابق سنہ ۱۸۵۳ء) کو وہ علم شاہی انتظام اور شاہانہ جلوس کے ساتھ درگاہ حضرت عباس (لکھنو) میں چڑھایا۔

یہ خبر دہلی پہنچی تو علماء و مشائخ (اہل سنت والجماعت) نے بہادر شاہ کو یہ دھمکی دی

کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو جمعہ اور عیدین کے خطبہ سے بادشاہ کا نام نکال دیا جائے گا۔ بادشاہ گھبرائے [مقدمہ متفرقاتِ غالب ۳۰]

اسی قضیے سے متعلق بادشاہ کی فرمائش پر غالب نے یہ مثنوی لکھی اور اس میں مجتہد العصر سے اپنی مجبوری اور بری الذمگی ظاہر کی

خط ۱۲۴

اُسی زمانے کا خط ہے۔

خط ۱۲۵

بنام عابد علی خاں

نگارش خط کی تاریخ موجود ہے نگاشتہ روز پنج شنبہ ہفتم اپریل ۱۸۵۲ء مطابق (۱۲۶۸ھ)

خط ۱۲۶

بنام اسفندیار بیگ خاں

خط کی نگارش کی تاریخ روز شنبہ جمادی الاول ۱۲۶۶ (سنہ ۱۸۵۰) دے دی گئی ہے۔

خط ۱۲۷

بنام امین الدولہ آغا علی خاں۔

پیش نظر مکتوب میں غالب نے لکھا ہے منتخب دیوان ریختہ کو ورقے چند بیش نیست

!ازخاکسار ہدیۂ آں بارگاہ است دیوان فارسی نیز بہ نظرگاہ التفات خواہد رسید۔
اگر اس موقعہ پر دیوانِ فارسی کا کوئی قلمی نسخہ مراد نہیں تو اس مکتوب کو ۱۸۴۵ء کے بعد تحریر ہونا چاہیے جو دیوان فارسی کا سنہ اشاعت ہے۔

خط ۱۲۸

بنام علی بہادر مسند نشیں باندا

یہ خط نواب علی بہادر باندا کی مسند نشینی کے موقع پر یا اس کے کچھ بعد لکھا جانا چاہیے جس کا کچھ اندازہ خط کے ان الفاظ سے بھی ہوتا ہے۔
"چوں وسادۂ سروری را بوجود مسعود خویش رونق افزودہ" اور ان فقرات سے بھی۔
"مردم را سو بسو گماشتم رفتند و جستند و دیوان فارسی و دیوانِ ریختہ فراچنگ نیامد مگر نسخۂ از پنج آہنگ"
پنج آہنگ کی اشاعت اول سنہ ۱۸۴۹ کی یادگار ہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں باندا کی ریاست ختم ہو گئی۔ تاریخ نگارش کا تعین موجودہ صورت میں ممکن نہیں۔

خط ۱۲۹

بنام روح اللہ خاں، زمانۂ نگارش کا کوئی تعین نہ ہو سکا۔
[پنج آہنگ مطبوعہ سنہ ۱۸۵۳ کے اضافات میں شامل ہے]

خط ۱۳۰

نگارش کے زمانے کا تعین نہ ہو سکا

خط ۔ ۱۳۱

بنام امیر حسن خاں تسلی

اس خط کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔

درنگارشِ ایں نامہ باآنکہ فراواں مہربانی فرمودہ اند جرعۂ التفات برغالب تشنہ جگر بداں اندازہ پیمودہ اند ...... کہ الفاظ ہمہ مہر و محبت .....

خط کے زمانۂ تحریر پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اگرچہ بست و دوم جولائی یعنی تاریخ خط میں موجود ہے۔ وزیر الحسن عابدی نے سالِ نگارشِ خط سنہ ۱۸۳۴ء متعین کیا ہے۔

خط ۔ ۱۳۲ ایضاً

امیر حسن خان تسلی کے نام

اس خط کو بھی اسی ذیل میں رکھنا چاہیے۔ یہاں بھی اگر دیکھا جائے تو وہی فضا اور غبارِ خاطر موجود ہے۔

"خاکم بے غبار است و آتشم بے دود......"

خط ۔ ۱۳۳ بنام خلیل الدین خاں

خلیل الدین خاں بہادر کے نام لکھے جانے والے اس خط میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد کے خاتمہ اور لارڈ آکلینڈ کے دور آغاز بلکہ آمد آمد کا ذکر ہے۔

بنٹنگ کا پنج سالہ دور سنہ ۱۸۲۸ سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۳۲ء پر ختم ہوجاتا ہے اور آکلینڈ کا زمانہ ۱۸۲۸-۱۸۳۲ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ خط ۱۸۳۲ء کے اواخر میں لکھا گیا ہے جو ازروئے تقویم ہجری سنہ ۱۲۴۸ھ ہے۔

خط ۱۳۴

نواب حشمت جنگ بہادر کے نام اس مکتوب میں غالب نے اپنی فارسی گوئی کو چالیس سالہ دور محنت و کاوشِ فکر سے وابستہ کیا ہے۔

سرمایۂ چہل سالہ جگر کاوی خویش یعنی مجموعۂ اشعار فارسی بہ آں حضرت می فرستم

غالب کا فارسی کلیات نظم پہلی بار سنہ ۱۸۴۵ء میں اشاعت پزیر ہوا ممکن ہے یہ خط اسی کے قریبی زمانہ میں لکھا گیا ہو۔ نواب کا سالِ وفات سنہ ۱۸۴۶ ہے۔ پنج آہنگ مطبوعہ ۱۸۴۹ء میں شامل ہے۔

خط ۱۳۵

بنام مرزا الف بیگ

مرزا کے بے تکلف دوستوں میں ہیں اور بڑھاپے میں ان کے یہاں فرزند تولد ہوا ہے اگر اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس مانی جائے، تو از روئے قیاس خط کا زمانۂ تحریر ۱۸۵۷ء ۱۲۷۴ھ کے قریب ہونا چاہیے۔

خط ۱۳۶

زمانۂ تحریر کا تعین نہ ہو سکا۔

خط ۱۳۷

گل محمد ناطق مکرانی کے نام اپنے اس مکتوب میں غالب نے اپنے فارسی کلیات کے زیر طبع ہونے کا ذکر کیا ہے۔

ہمدماں نقشے برانگیختہ و مجموعۂ گفتارم را از قصیدہ و غزل و مثنوی بکالبد انطباع ریختہ اند

یہ خط سنہ ۱۸۴۵ مطابق سنہ ۱۲۶۲ھ ہی میں لکھا جانا چاہیے کہ غالب کے فارسی

دیوان کی طباعت پہلی بار ۱۸۴۵ء ہی میں عمل میں آئی تھی

خط ۱۳۸ بنام میاں نوروز علی خاں
مشتمل بہ روانگی پنج آہنگ

مرزا نے لکھا ہے ۔ "مجموعۂ نثر ہا مدا بہ جناب منشی محمد خاں سپردم" پنج آہنگ پہلی مرتبہ ۱۸۴۹ء (۱۲۶۵ھ) میں مطبع سلطانی سے اشاعت پذیر ہوئی دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۸۵۳ء مطابق (۱۲۷۰ھ) میں سامنے آیا اس اعتبار سے یہ خط ۱۸۵۴ء میں تحریر ہوا۔ لیکن قلمی نسخہ کی صورت میں ۱۸۳۵ یا ۱۸۴۰ کے مکتوبہ نسخہ پر مبنی ہونے کے باعث ۱۸۳۵ یا ۱۸۴۱ کے اواخر کی تحریر ہونا چاہیے وزیر الحسن عابدی ۔ دوسرے خط کی تاریخ تحریر ۷ ستمبر ۱۸۴۱ درج ہے اور پہلے خط ۱۸۴۱ کے اواخر کی نگارش قرار دیا ہے ۔

خط ۱۳۹

غالب نے ان کی نگارشات طلب کی گئی تھیں اور اس فرمائش میں خلوص غائبانہ کو دخل تھا جس کے ضمن میں غالب نے لکھا ہے ۔

"یکے از برادراں بخواہش خود نہ بفرمان من ، عمر خود بہ فراہم آوردن نثر من تباہ کردہ و ورقے چند چوں نامۂ کردار من سیاہ کردہ آں را از آں گرامی برادر بہ پسیچ خواستم و صحیح نویسے را بر داشتم کہ زود تر ایں نگارش را بپایاں رساند"

جس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ نسخۂ پنج آہنگ کی اشاعت اول سنہ ۱۸۴۹ سے پیشتر کی تحریر ہے اس لیے کسی صحیح نویس کی خدمات طلب کی گئی ہیں اور اس خواہش و فرمائش کے ساتھ کردہ اس کام کو جلد از جلد نمٹا دے ۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ غالب نے آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ یہ "مزد چہل و چار سال نفس سوختن و سرمایۂ بہا بہ ہیچ فروختن است"

جس کا یہ مطلب ہے کہ غالب کے سنین عمر اٹھاون اور ساٹھ کے قریب ہیں اور یہ تحریر ۱۸۵۸ء کے قریبی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

خط ۱۴۰

شیخ بخش الدین مارہروی کے نام اس خط میں صاحب عالم مارہروی کا تذکرہ آیا ہے "صاحب عالم کہ مارہرہ را خجستگی جود شاں شرفے بخشودہ اند" اپنے کسی مطبوعہ دیوان کا نسخہ غالب نے جستجو کر کے فراہم کیا ہے۔

دیوانے منجملہ دیوانہائے منطبعہ پس از فراواں جستجو بکف آوردہ کارپردازاں فرستادن آں نہ پزیرفتند

غالب کا اردو دیوان پہلی بار سنہ ۱۸۴۱ء میں اشاعت پزیر ہوا، فارسی دیوان سنہ ۱۸۴۵ اور دوبارہ ۱۸۶۳ء میں چھپا اس زمانے تک صاحب عالم مارہروی سے غائبانہ شناسائی ہو چکی ہوگی۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ خط ۱۸۶۳ء کے بعد لکھا گیا

خط ۱۴۱

بنام میر واحد علی بلگرامی

زمانۂ نگارش کا تعین نہ ہو سکا۔ پنج آہنگ مطبوعہ ۱۸۵۳ء کے اضافات میں شامل ہے

خط ۱۴۲

بنام مولانا محمد عباس بھوپالی

غالب نے لکھا ہے کہ میں ایک زمانہ سے فارسی میں خط نہیں لکھتا۔

از دیرباز نوشتن نثر فارسی آئین من نیست نامہ ہا یکسر بہ اردو نوشتہ می شود

خط ۱۴۳

صدر الصدور میرٹھ عبداللہ خاں بہادر کے نام اس خط کی تاریخ کے تعین میں یہ فقرہ کچھ مدد دیتا ہے۔

اگر دانند کہ فلانے باایں ہمہ پریشانی سخن گفتن می تواند در مدح نواب محمد سعید خاں بہادر بالقابہ چرا سخن نہ رانم

نواب محمد سعید خاں کو رامپور کی ریاست ۱۸۴۰ء میں انگریزوں کی طرف سے عطا کی گئی تھی خط میں یہ حوالہ اس کے کچھ بعد ہی آیا ہوگا۔

خط ۱۴۴

بنام منشی جواہر سنگھ پسر راجہ جھجل۔ تاریخ تحریر آدینہ چہارم ماہ محرم الحرام ۱۲۵۱ھ درج ہے جبکہ عیسوی سنہ یکم دسمبر ۱۸۴۸ دیا گیا ہے دونوں سنین میں از راہ تقویم کوئی مناسبت نہیں۔ بہ گمان غالب ۱۸۳۸ ہوگا یا پھر ۱۲۶۵ھ

خط ۱۴۵ ایضاً

غالب نے لکھا ہے سلاطین چغتائیہ کے نام نثر و داد کا مسودہ ہیرا سنگھ کو دیا جا چکا ہے اس سے "مہر نیمروز" مراد ہے تاریخ تحریر یازدہم جون سنہ ۱۸۵۲ء ہے۔

خط ۱۴۶

خط میں بہادر شاہ ظفر کی بیماری کا تذکرہ ہے۔

" از روز عید بلکہ از شب عید خاقان رنجور ست و تا امروز کہ یکشنبہ بست و دوم شوال

بادشاہ کی یہ بیماری سنہ ۱۸۵۲ء مطابق سنہ ۱۲۶۹ کا واقعہ ہے اس سے خط کی نگارش کی تاریخ بھی متعین کی جا سکتی ہے۔

خط ۱۴۷

بنام انور الدولہ شفق

آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

قطعہ اس میں نقل کیا گیا ہے لیکن اس کی تاریخ کا تعین نہ ہوسکا۔ بحوالے عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ ۱۸۵۲ کے معارضۂ سخن یعنی مرزا جواں بخت کے سہرے کے سلسلے میں پیدا ہونے والی شکوہ سنجی و شکر رنجی سے متعلق ہے۔

خط ۱۴۸ ایضاً

(بنام انور الدولہ شفق)

زمانۂ نگارش کا تعین نہ ہوسکا لیکن از روئے قیاس یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سنہ ۱۸۵۲ (۱۲۶۹ھ) کے قریب ہونا چاہیے۔

ایضاً خط ۱۴۹ (بنام انوار الدولہ شفق)

تاریخ رشنبہ، ہفتم محرم ۱۲۷۰ھ یازدہم اکتوبر سنہ ۱۸۵۱ء یہاں سہو کتابت ہے۔ ۱۲۷۰ھ میں سنہ ۱۸۵۲ء میں ہونا چاہیے بہر حال اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ شفق سے خط و کتابت کا زمانہ کیا ہے۔

خط ۱۵۰

ایضاً خط ۱۵۱

غالب نے لکھا ہے

سی سالست کہ خانہ و کاشانہ فروختہ کوبکو می گردم و مقام معین نہ دارم"

اگر یہ فرض کیا جائے کہ سنہ ۱۸۲۶ کے آس پاس غالب نے مستقل رہائش گاہ ترک کرکے کرایے کے مکانوں میں رہنا شروع کیا تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خط ۱۸۵۲ء کے قریبی زمانہ میں تحریر کیا گیا۔

خط ۱۵۲

(عرض داشت شمس الامراء بہ نواب مختار الملک والی حیدرآباد)

مرزا غالب نے نواب کی خدمت میں قصیدہ ارسال کیا ہے اور اس کے جواب کا انتظار ہے۔

"قصیدہ مدحیہ فرستادہ باشم وندانستہ باشم کہ مطبوع طبع اقدس افتادیانہ"

نواب میر تراب علی خاں سر سالار جنگ اول کو یہ قطعہ ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۸ یا اس کے قریبی زمانہ میں بھیجا گیا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب مولوی حبیب اللہ ذکا کے نام مذکورہ مکتوب تحریر ہوا۔

خط ۱۵۳

(بنام منشی نول کشور)

غالب نے لکھا ہے "شصت و پنج سال زیستم و پنجاہ سال بجس گفتم" غالب سنہ ۱۸۶۲

میں پینسٹھ سال کے ہیں لیکن تاریخ تحریر ۱۸ جولائی سنہ ۱۸۶۰ درج کی گئی ہے اس میں تسامح کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔

خط ۱۵۴

بنام دو تن از فرزانگان پنجاب

شنبہ بستم ماہ ذی قعدہ سنہ اس کی تاریخ تحریر دی گئی ہے از روئے تقویم سنہ ۱۸۶۳ء مطابق سنہ ۱۲۸۰ سے تعلق رکھتی ہے۔

خط ۱۵۵

(اعلیٰ حضرت (سلطان محمد بہادر)

زمانۂ تحریر کے تعین کے سلسلہ میں مرزا کا یہ بیان قابل توجہ ہے

"اکنوں کہ عمر گزراں بہفتاد رسید چناں بخاطرِ ناشاد رسید کہ مسودہ ہائے پنجاہ سالہ تحریر فراہم کردم و باوجود عدمِ استطاعتِ مصارف بکالبد انطباع در آمدم"

کلیاتِ فارسی کا سال طباعت سنہ ۱۸۶۳ء ہے یہ خط ۱۸۶۳ء میں یا اس کے قریبی زمانہ میں لکھا جانا چاہئے لیکن غالب کی عمر اس وقت ان کے سال کے مطابق ۷۰ برس ہے اسی رو سے اس کا زمانۂ نگارش سنہ ۱۸۶۷ ہونا چاہیے (اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اس اشاعت کے اخراجات خود برداشت کیے تھے)

خط ۱۵۶

(بنام میر غلام باباخاں صاحب)

۳ - سفتم مئی

سنہ ہفتم مئی سنہ ۱۸۶۴ء دی ہوئی ہے جو از روئے تقدیم سنہ ۱۲۸۱ء کے مطابق ہوتی ہے۔

خط ۱۵۷

بنام شہزادہ بشیر الدین میسوری

اس خط میں غالب نے اپنی تصانیف "پنج آہنگ" "مہر نیم روز" اور "دستنبو" کا ذکر کیا ہے جس کے یہ معنی ہیں دستنبو کی اشاعت کے بعد لکھا گیا ہے۔ از روئے قیاس اس کی تحریر کا زمانہ سنہ ۱۸۵۸ء مطابق سنہ ۱۲۷۴ھ ہونا چاہیے۔

اضافات

غالب نے کلکتہ کا سفر، مرزا نصراللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے ورثا کے لیے مقرر کی جانے والی پنشن کے قضیہ کے سلسلے میں کیا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس کے آغاز و اختتام کی تاریخوں کا تعین کرتے ہوئے لکھا ہے

"مرزا نصراللہ بیگ کے وارثوں کے لیے جن میں مرزا غالب بھی شامل تھے، سرکار کمپنی بہادر نے دس ہزار روپیہ سال وظیفہ مقرر کیا تھا جس کی ادائیگی سرکاری خزانے سے عمل میں آئی تھی لیکن زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں رئیس فیروز پور جھرکہ و لوہارو نے (جو نصراللہ بیگ مرحوم کے برادر نسبتی، اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے برادر والاقدر تھے) اس زمانہ کے انگریز کمانڈر افواج (لارڈ لیک) سے ایک اور معاہدہ کیا جس کی رو سے یہ رقم آدھی ہو گئی اور اس خاندانی رشتے سے وظیفہ پانے والوں کو زر سالانہ یا وظیفہ ماہانہ، ریاست فیروز پور جھرکہ کے خزانے سے ملنے لگا۔"

ابتدائی تصفیہ اور بعد کے معاہدے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور عمل میں آئی تھیں انھیں کے باعث نواب احمد بخش خاں کے آخری زمانۂ حیات (۲۷-۱۸۲۵) غالب کی طرف سے اس چارہ جوئی اور مرافعہ کی نوبت آئی تھی۔ اور انھوں نے پہلے نواب صاحب سے ملاقات اور اتمام حجت کی غرض سے فیروز پور کا سفر اختیار کیا اور ادھر سے مایوسی و محرومی کے باعث (جن کا ذکر علی بخش خاں کے خط میں موجود ہے) وہ کانپور، لکھنؤ، باندا، الٰہ آباد، بنارس اور بعض دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے، کلکتہ پہنچے؛ کلکتہ تک سفر اور دیار شرق

کہ اس نئے شہر کے دورانِ قیام غالبؔ کی ملاقات اس عہد کی بعض نہایت اہم شخصیتوں سے ہوئی جن سے مرزا کے مخلصانہ مراسم اور دوستانہ تعلقات کافی زمانے بعد تک رہے۔ مولوی محمد علی صدر امین باندا، نواب علی اکبر خاں متولی وقف امام باڑہ ہگلی، اور مولوی سراج الدین احمد اسی ذیل میں آتے ہیں۔ حالاتِ سفر کے ضمن میں غالبؔ نے لکھا ہے:

"قبلہ گاہا بخاطر اقدس نہ گزرد کہ غالبؔ از خیرہ سری و پریشاں نظری در بنارس ہم چو کسے بہ عمل فرو ماندہ باشد، حاشا ثم حاشا چوں منِ فلک زدہ را سرو برگِ اقامت کجا و دل و دماغ تماشا کو مگر ضرورت گرد آوردن بعضے دارد یا کہ حاجت بداں اکثر ست، و فراہم کردن پارۂ از رخت سفر کہ زمستاں را در خور ست اتفاق قیام افتاد"

غالبؔ یہاں پانچ روز سرائے نیرنگ آباد میں (جو عرف عام میں نورنگ آباد کہلاتا تھا) قیام پذیر رہے) اس کے بعد اسی محلہ اور اسی سرائے کے عقب میں ایک بہت کم حیثیت مکان میں منتقل ہو گئے جس کے بارہ میں لکھا ہے

"در زاویہ کہ فرود آمدہ ام کلبۂ پیرزنے ست کہ خودش بروغنِ چراغ محتاج است۔ محلۂ نورنگ آباد عقب سرائے نورنگ آباد قریب حویلی گوسئی خان ساماں" (ص ۱۹)

خط (۵ صفحہ ۲۶) میں یہ عبارت ملتی ہے جو آغا میر کی تعریف میں کہے جانے والے قصیدہ کی سرگزشت میں نئی جہت کا اضافہ کرتی ہے

"قصیدہ کہ در مدح آغا میر گفتہ ام خُدا می داند کہ برائے تماندانِ من ظرف داغِ بدنامی ست ولطف اینکہ آں یک صد و دو شعر را از صفحہ حک ساختن نمی توانم، چوں نواب مرشد آباد نیز سید زادہ است، ایں قصیدہ را بہ نام وے شہرت دہم گو بہ ملازمتش نارسیدہ، لیکن مداح بودن ہمایوں جاہ را بر من ناگوار نیست توقع کہ تا زمانیکہ اشعار موضعِ اسم ممدوح را ندیابند) آں قصیدہ را بہ کس نہ نمایند"

ایک اور خط میں غالب نے عرض داشت پیش کرنے کے سلسلے میں جزئیات کو بھی قلمبند کیا ہے

"امروز چہاردہم شوال است ...... دروزِ سہ شنبہ فقیر یارۂ صد رسانیدن نقل کاغذ، عرض داشتے مشتمل بہ ماجرائے بست سالہ و توضیح حاصل تظلم خویش...... دیروز کہ سیزدہم ماہ، روز دوشنبہ بود، و آں روزِ دربارست، چہ مجمع سفرا و وکلا و اہلِ بار درآں روز حاضر شدہ، بہ ملازمت فریزر صاحب می رسند،..... ہر گونہ عرائض کہ می رسد نخست نزد او می رسد، و او عرائض را، بہ زبانِ انگریزی ترجمہ ساختہ، بہ صاحبانِ کونسل می رساند" [ص: ۲۱]

اسی کے ساتھ اس گفتگو کا ماجرا بھی نقل کیا ہے جو ولیم فریزر سے ہوئی

"مجملاً حال خویش شرح دادم چوں نام عم خویش نصر اللہ خاں بردم، فرمودند، آرے می دانیم نصر اللہ بیگ خاں را، تو او را کیستی، گفتم برادر زادہ حقیقی اویم،...... فرمودند، عرضی برائے گورنر (جنرل) آوردۂ من آں قطعہ را از گریبان قبا بر آوردم و گزرانیدم"۔

وقت رخصت عطر دان و پاندان طلبیدہ عطر و پان از دست خود عطا کردند و تمام قد از کرسی برخاستہ سلام فقیر گرفتند"۔ [ص: ۲۲ و ۲۱]

اس کے بعد کے خط میں یہ بات سامنے آئی کہ اس عرض داشت کو پہلے ریزیڈنٹ دہلی کی خدمت میں پیش ہونا چاہئے غالب پہلے ہی سے شاید کسی اطلاع یابی کے زیر اثر یہ سوچ رہے تھے کہ "ارجاع" کا سوال سامنے نہ آئے۔

"اما گفتند کہ ضابطہ اقتضاے آں کہ نخست زمزمۂ تظلم بگوش رزیڈنیٹ دہلی ریختہ شود، عرضہ داشتم کہ سروبرگ سفر، و تاب و توان معاودتم نیست، فرمان دادند کہ خود ایں جا باشد و کاغذ بہ رزیڈنیسی دہلی رجوع آوردہ، بہ دوستے از دوستانِ وطن، کتابتے فرستادم و اعانتے جستم دریں بیکسی

نوازی کرد و خود کار فرما شدہ و وکیلے قرار داد و بہ من نوشت "

غالب نے اس ضمن میں یہ بھی کوشش کی کہ مسٹر کول برک ریذیڈینٹ دہلی کے لیے کوئی سفارشی خط حاصل کریں، اور اسی کے ساتھ مولوی التفات حسین خاں کے لیے مولوی محمد علی خود بھی لکھیں۔

و بہ پامردی امیرے از امرائے کلکتہ تحریر صاحبے از صاحبانِ والا شان بہ نام کول برک صاحب بدست افتاد چنانکہ باد گر کتابتہا بہ دہلی ارسال یافت اما لب تشنۂ آں ماندم کہ دوستے از التفات حسین خاں کہ منشی کول برک صاحب است، دریں دیار نیافتم۔

مکتوبے بہ نام نامش نوشتہ نزدِ بندہ بفرستند بلکہ بہ دہلی پیش مکتوب الیہ رواں سازند، مبنی بریں کہ مقدمۂ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ کہ بتوسط (پنڈت) ہیرا لال وکیل کچہری ریزیڈینسی شاہجہاں آباد رسیدہ است مقدمۂ این جانب است....." [ص: ۳۵]

غالب کے یہاں جہاں تک زیر نظر فارسی مکتوبات کا تعلق ہے، نگارش و گزارش کے جو اسالیب و دل آویز نقوش ملتے ہیں ان کے کچھ نمونے اس سے پیشتر بھی مختلف مباحث و حوالوں کے ضمن میں پیش کر دیے گئے ہیں، مزید کچھ نمونے لطف دید کے لیے یہاں درج کیے جاتے ہیں آموں کی یہ تعریف ملاحظہ ہو جن میں انشا پردازانہ خوش رنگی اور زبان بیان کی خوش لطفی بطور خاص موجود ہے

"رسیدن ہشت سبد انبہ در روضہ ہائے فردوس بر روئے آرزو باز کرد زہے انبہ ہائے پاکیزہ و شیریں از بروں سوئے بشرشتہ واز دوں سوئے بشکر اپناشتہ!...... بہ پاکیزگی گوہر آبروئے خانوادۂ ابر و ہوا و بہ دل آویزی پیکر چشم و چراغ دودمانِ برگ و نوا!...... انگور اگر پیشگی دانستے کہ آب شدن و بادۂ ناگشتن دیگر است، و چاشنیِ خدا آفریدِ ایں شیرۂ پاک دیگر۔ نے شکر از در آغاز کار روا رسیدے کہ بگوناگوں فشار در آمدن و سبعی دیگراں

بصورتِ تنگ شکر برآمدن دیگر است و گوارائی ازل آورد ایں میوۂ نغز دیگر...... آں کہ خامۂ شکرفشاں بداں رفتہ کہ ازیں ثمر ہائے پیش رس یک نیمہ پختہ و نیمۂ دیگر ہنوز خام است...... آنچہ بہ پختگی زرد گردد نہایت شوق است کہ در رنگ دلجوئی روا نداشت...... من بداں خورسندم و خورسندی من فراواں باد......"

(خط بنام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ)

غالب نے اپنے فنکارانہ رجحان کے تحت دوستوں کے لیے بھی قصیدے لکھے ہیں آم ان کا نہایت محبوب و مرغوب پھل ہے اس کے لیے بھی یہ کیسے کہ انھوں نے فارسی نثر میں قصیدہ لکھا ہے۔ آم بھیجنے کی خواہش و فرمائش کا یہ خوبصورت اور بے تکلف انداز بھی ملاحظہ کیجیے:

"نخستے شکم بندہ ام و قدرے ناتواں ہم آرائش: دستر خوان جوئیم و ہم آسائش ہماں، وخرد دراں واقند کہ ایں ہر دو صفت با نبہ اندر است واہلِ کلکتہ برآنند کہ قلم وانبۂ ہگلی بندر است۔ آرے انبہ از ہگلی وگل از گلشن ایثار از جناب و سپاس از من شوق می سگالد کہ ہر آئینہ تا پایان فصل وہر بار بخاطر دلی نعمت خدائیم گزشت و آزمی نالد کہ حیات...... بریں ملیہ خورسند نخواہم شد"

(خط بنام نواب علی اکبر خاں)

گوناگوں تمثیلوں رنگا رنگ تشبیہوں اور عبارات و اشارات کی نیرنگیوں سے آراستہ کچھ خوبصورت مثالیں ان نثر پاروں میں مل سکتی ہیں۔

"من دانم و دل کہ دریں چشم روشنے کہ پیش آوردۂ دولت و ساز کردۂ اقبال ست از اقسام سخن ...... رفتہ ہم در و دیوار روزگار را بسر خویش بہار اندر دلے و ہم گوشہ و کنار گیتی بفروغ نیز بخت چراغاں نمو دنے ــــ تار از طرۂ حور و پود از بالِ پری آوردمی و نو آئین درہم یافتہ بہ آں ہمایوں انجمن گستردمے......"

(خط بنام منشی محمد حسن....)

صاحبِ عالم مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر کے شقہ کے جواب میں ان سے بزبانِ قلم جو گفتگو کی ہے اس کا یہ آرائشی اسلوب ملاحظہ ہو۔

"بہ موقف عرض استادگانِ حضورِ فیض گنجور صاحبِ عالم و عالمیاں شہزادۂ کیوان ایوان، شمعِ فروزندۂ دودمانِ گورگانی، شائستۂ اورنگ سلیمانی دام اقبالہٗ و زاد اجلالہٗ [ان القاب و آداب کے بعد یہ تحریر زیبِ قرطاس ہوتی ہے] "بال افشانیِ ذرہ بہ پیش گاہ مہرِ جہاں آرا و سجدہ ریزیِ قطرہ بہ بساطِ ارادت دریا آئینۂ زدلے ایں نمایش و پردہ کشائے ایں گزارش ہست کہ اگر فیض ورودِ ہمایوں توقیع، جہاں مطاع، جہانیاں مطیع، جانے بہ در کالبد ہوا خواہ نمیدے سپاس ایں ہمہ ذرہ نوازی و دردواں پروری چگونہ گزاردہ شدے......"

سبحان علی خاں کے نام ایک خط میں عرضِ مدعا اور نگارشِ گزارش کا یہ انداز ملاحظہ ہو۔

"شورِ تمنائے صلہ و آشوبِ تقاضائے جائزہ و درخواہ اجرائے عطائے وزیر و توقع حصولِ مرحمت خیر و ہمہ در شستم، درنگہا بہم آمیختہ شگرف نقشے بہ رہگزارِ نظارہ بستم، تا چوں فرزانہ دارد و دانش پیشہ مربی دیدہ ورد بدیں ورق نگرد دریابد......"

اس اندازِ عبارت آرائی و نقش پیرائی کا بہترین نمونہ اس عرض داشت میں نظر فروز ہوتا ہے جو نواب حسام الدین حیدر کی طرف سے شاہِ اودھ کی بارگاہِ سپہر اشتباہ میں پیش کش کے لیے غالب نے سپردِ قرطاس و قلم کی ہے۔

"حضرت قدر قدرت، سلطان سپہر آستان، فرشتہ پاسبان، ستارہ سپاہ، ثریا بارگاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ...... والائی رتبہ اورنگ جہاں بانی کہ نمونۂ سریر سلیمانی است برتر ازاں ست کہ پایۂ آں را بہ آرزوئے بوسہ نگارتواں نست یاد راندیشہ راہ خواہش گرد سر گردیدنی بسراپائے آں گردد

لاجرم بگوشۂ بساط آں فجستہ بارگاہ (کہ یارب پیوستہ مشرق آفتاب سیمائے خسروی و مشتری رادرستور العمل روائی آثار ہمایوں پر توے باد) جانے کہ بفروغ خرد نور الحدقہ بینش گوہر گنجینۂ یزدانی ست بہ سبیلِ نثار می افشاند و بزمزمۂ تہنیتِ جلوس و دعائے دوامِ دولت خود را با جہانیان ہم زبان و جہان را با خویش آمین گوے می گرداند"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام ایک خط میں فارسی نیامیختہ بہ عربی کا خوبصورت نگارش نامہ پیش کیا ہے

"آباد براں شیوائی شیوہ کہ تا زباں بدہن جنبید نخست سپاس توانائی سخن گزارد کہ سرانجام ہر گونہ سپاس گزاری و گرد آنست، کیست کہ ایں حرکت پایہ را بہ بلندی پرستد و بدیں ایزدی بخشش آفریں نہ فرستد —— بنگر ایں ہوائے شگفت آور نیرنگ تمامی را چہ نیرو دادہ اند کہ چوں بفرمان جنبشی کہ نہاد و ست فرزانگاں را از جائے برانگیزد ہم زباں را بگفتار آورد ہم خامہ را برفتار استواری و شگفتہ تر آں کہ زمزم وزیدن ایں باد را آئینے بداں دادہ و اندازہ بداں سازگاری نہادہ کہ دریں دو روش بیگانہ کہ بر زبان و خامہ راست اندیشہ را بپیوند تجا راز ہم نگسلد و آں یک گونہ خواہش از بن ہر دو پردہ پدید آید و ایں خوش رخشانی رنگے ست کہ چوں چشم بر روئے سخن کشایند ناگاہ بہ نخستیں نگاہ ایں را بنگرند......"

اس سے فقروں کی دروبست اور لفظ و معنی کی ساخت و پرداخت کا ایک نیا انداز اُبھرتا ہے۔ نواب صاحب ہی کے نام ایک خط میں فکر و فلسفہ کی پرچھائیوں کو اس طرح نگارش کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

"ہیچ چیزے بے افاضہ وجود مطلق رنگِ ہستی نہ پذیرد، و ہرچہ فروغِ ہستی آں را فرو گیرد، جوہرے گرد فروزندہ و نورانی کہ برق پیدائی از سیمائے وے آشکارا بود و تیرگی نیستی ہیچ گونہ درو راہ نیابد".....

چگونگیست کہ ازیں دو صفت ہیچی و ناتمامی گفتہ شود، نخستیں سر و بن پیدا نیست و دومیں را باندازۂ دستگاہِ کرم از گنجینۂ فیض نمود بہرہ بہا نیست آں را ورق از انگارۂ نمائش سادہ و ایں را از پیدائی جاں نقشِ نیم رخ درکار

و اگر فیض ہستی عدم است و چنانکہ وا نمودہ اند تمام است با "ہیچی" نشاط "ہمگی" بر گرفتے و ناتمامی بہ تمامی نام برآورزی ....."

اس عبارت سے ان کے صوفیانہ افکار تو خیر سامنے آتے ہی ہیں ان کے اسلوب نگارش کی طرفگی اور نئے اندازِ ادا کی اس معنی یابی کا بھی پتہ چلتا ہے جس کے لیے وہ نئے الفاظ سے کام لیتے ہیں اس کی طرف ان کی فکر آفریں ترکیبیں بھی اشارہ کرتی ہیں اور سادہ لفظوں سے اصطلاح سازی کی سعی مشکور بھی غالب کی نثر ان کے اپنے ذہن اور زمانہ زندگی کا "نقشِ نیم رخ" ہی مگر اس میں تخلیق نمو پذیری کی صلاحیت اور حسن آفرینی کی جو مضمر قوت موجود ہے وہ ناتمامی تمام اور ہیچی نشاط ہمگی سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو اپنے طور پر کہتا جاتے ہیں اردو کی طرف آنے سے پہلے وہ اپنے انفرادی اسلوب کی کشش و روش کے رنگ و نیرنگ کو فارسی خطوط کے نثر میں آزما چکے تھے۔ بعض اردو خطوط تو فارسی مکتوبات کا عکس ثانی معلوم ہوتے ہیں۔ بیان کے حسن اور طرزِ ادا کی دل آویزی سے مسرت اندوزی کے پیشِ نظر یہاں ایک نمونہ اور پیش کیا جاتا ہے

"جہاں جہاں شکستگی و عالم عالم خستگی با خود گرفتم و از بیداد روزگار نالاں و سینہ بردم بہ تیغ مالال بہ کلکتہ رسیدم، فرماں دہاں سر بزرگی و کوچک دلی کردند و دل را نیرو بخشیدند، آہم بخشایش کرشاہدہ رفت امید کشایش آورد و ذوق آوارگی و ہولئے بیاباں مرگی کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود بدل نماند

و ہوس آتشکدہ ہائے یزد و میخانہ ہائے شیراز کہ دل را بسوے خود می کشید و مرا بپارس می خواند از ضمیر بدر جبیست و دو سال دراں بقعہ مجاور بودم...... روزگار برگشت و کار ساختہ شدہ صورت

تباہی گرفت اکنوں ششمیں سال است کہ خانماں بہ یاد دادہ و دل بر مرگ ناگاہ نہادہ بکنجے نشستہ ام

(از خط بنام میر اعظم علی)

حواشی

پنج آہنگ مطبوعہ، مطبع سلطانی (شاہی چھاپہ خانہ)

پنج آہنگ کی اشاعت اولیٰ ہے جسے نسبتاً چھوٹی تقطیع پر شائع کیا گیا ہے یہ ۱/۲ ۱۹ x ۱۲ ہے نگارش متن کا حصہ ۱/۲ ۸x۱۳ ہے ہر طرف حاشیہ کی چوڑائی ۱/۲ ۲ ہے اور جز بندی کی سمت کا حاشیہ صرف ۲ سینٹی میٹر کے قریب چھوڑا گیا ہے سرورق مزین و منقش ہے اور قدیم زمانے کی مطبوعات پر جو آرائشی گل کاریاں ملتی ہیں ان کا ایک خوبصورت نمونہ ہے ورق اوّل "ب" پر نصف صفحہ کی آرائشگی یا لوح سازی کا بھی یہی انداز ہے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم سے جس عبارت نگاری کی شروعات ہوتی ہے اس کے تین طرف بھی خوبصورت بیل موجود ہے جبکہ باقی صفحات پر فقط دو باریک خطوں میں کھینچی گئی جدول ہے اور اس کے ماسوا کوئی نقشِ زیبائی نہیں۔

موجودہ صورت میں کہ یہ نسخہ ناقص الآخر ہے صفحات کی تعداد ۴۸۸ ہے اور اس صفحہ کے آخیر میں شروع ہونے والا خط بنام منشی نبی بخش صاحب سر رشتہ دار فوجداری ضلع کا علی گڑھ کول" ڈھائی سطروں کے بقدر ہی اس صفحہ پر ہے پا ورق کی عبارت ترک" از برائے" ہے خطوط کے اس حصہ یا آہنگ پنجم کا آغاز صفحہ ۱۰۳ سے ہوتا ہے کاغذ ہلکا بادامی ہے اور اور اس کی مضبوطی ہنوز قایم ہے سواد خط روشن ہے اور خطوط کے آغاز میں مکتوب الیہم کا نام قدرے جلی قلم سے اور نمایاں کر کے لکھا گیا ہے سرورق کی عبارت حسب ذیل ہے۔

وما توفیقی الا باللہ فھو حسبہ الحمد للہ علی احسانہ، کہ نسخہ متبرکہ تصنیف افصح الفصحا موسوم بہ

پنج آہنگ سنہ ۱۲۶۵ ابلغ البلغا حضرت اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ تخلص مدظلہ العالی در مطبع سلطانی مطبوع شد یہ نسخہ بڑے اہتمام سے چھاپا گیا لیکن غالبؔ اس اشاعت سے مطمئن نہ تھے اور اسے ناقص تصور کرتے تھے جیسا کہ سبط حسن نے (مولانا غلام رسول مہر کے مرتبہ خطوط کے حوالے سے) کیا ہے پنج آہنگ پہلی بار مطبع سلطانی دہلی میں سنہ ۱۸۴۹ ۱۲۶۵ھ میں چھپی یہ وہی نسخہ تھا جسے مرزا علی بخش نے مرتب کیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۸۵۳ (۱۲۶۸) منشی نورالدین کے مطبع (ندا) دارالسلام دہلی میں چھپا لیکن دونوں طباعتیں نہایت ناقص تھیں" (ز)

اس ضمن میں صاحب عالم مارہروی کے نام لکھے جانے والے خط سے یہ عبارت نقل کی ہے۔

"ہاں چھاپے خانے کی پنج آہنگ ابھی بکتی ہیں اور معیوب یہ دو عیب ہیں ایک تو یہ کہ جواز قم تر بعد الطباع   تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں دوسرے کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے اگر کہوں کہ کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے بے مبالغہ یہ کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔" (و)

نورالدین کے اہتمام میں اس مطبع سے اشاعت پزیر ہونے والے نسخۂ پنج آہنگ کے سرورق پر دی گئی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف کی تصحیح سے مزین ہے۔ اس اشاعت کے سرورق کے مندجات یہ ہیں۔

بحسن توفیق ایزد متعال کتاب در علم قواعد فارسی واشتاق تصحیح الفاظ برقم مصنف قبلۂ ارباب جود وکرم، مظہر فیض اتم، شہنشاہِ ممالک علوم عربی وفارسی ملک الشعرائے دوراں جناب فرخندہ خطاب نجم الدولہ دبیر الملک، پنج آہنگ مرزا محمد اسد اللہ خاں نظام دام اقبالہم در مطبع دارالسلام دہلی خاص، ابینہ اقل العباد عنایت حسین بہ التصحیح حضرت مصنف دام برکاتہم باہتمام فوالدین احمد لکھنوی در ماہ

اپریل ۵۲ ۱۸ء اختتام برکشید فقط

اس طباعت کا بھی سرورق مزین ہے مگر شاہی چھاپے خانے جیسی بات نہیں پنج آہنگ مطبوعہ نول کشور (مشمولہ کلیات نثر غالب)

پنج آہنگ کا تیسرا نسخہ جو راقم الحروف کے مطالعہ میں آیا اور ترجمۂ خطوط (فارسی) کے وقت پیش نظر رہا وہ یہی نسخہ تھا۔

کلیات کے ساتھ شائع ہونے والا یہ نسخہ سنہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

اس کے اپنے صفحات کی تعداد ۲۵۴ ہے مسطر ۲۱ سطری ہے۔ تقطیع ۱۲×۲۴ سینٹی میٹر ہے جدول یک سطری ہے سرورق مزین ہے مگر گل کاری و نقش آرائی کا انداز کچھ زیادہ پرکشش نہیں۔ مہر نیم روز اور بعد ازاں دستنبو کا طرز آرائش علی الترتیب کچھ زیادہ جاذب توجہ ہے نشانات شمار کا اندراج مسلسل ہے۔ اور انھیں نشانات کے ذریعہ تینوں تصانیف کو ملا کر کلیات نثر غالب کو مکمل کیا گیا ہے۔

تینوں کتابوں میں سرورق کے بعد آغاز نگارش سے بیشتر نصف سے کچھ زیادہ حصہ تزئین کاری کے جس نمونے سے آراستہ ہے وہی "مہر نیم روز" اور "دستنبو" کے لیے بھی کام میں لایا گیا ہے" کلیات نثر غالب" کے ماسوا پنج آہنگ کے لیے الگ سے کوئی اور سرورق استعمال نہیں کیا گیا ورنہ یہ جداگانہ طور پر شائع ہونے والا ایک نسخہ بن سکتا تھا اسی کے ساتھ کلیات نثر غالب ہر صفحہ کے بائیں کنارے پر موجود ہے۔

آغاز نگارش کے دو صفحوں کو مستثنی کرتے ہوئے باقی صفحہ ۴ سے ۲۵۴ تک ہر صفحہ کے بالائی کنارے پر دائیں جانب "پنج آہنگ" لکھا ہوا ملتا ہے آہنگ پنجم در مکاتبات کا آغاز صفحہ ۲۰۹ سے ہوتا ہے تقطیع ۱۲×۱۸ سینٹی میٹر ہے اور حصہ نگارش ۱۰×۱۵ سینٹی میٹر ہے جدول یک خطی ہے خط نستعلیق ہے مکتوب الیہ کا نام قدرے جلی قلم سے ہے املائی روش میں قدیمانہ طرز نگارش کی بہت سی خصوصیات ملتی ہیں۔ غالب نے اپنے مکتوب میں جن اغلاط کتابت کی موجودگی کا شکوہ کیا ہے وہ گوناگوں ہیں۔ کہیں نقطے

نمائندہ ہیں کہیں رائے ہملہ کو بھی رائے ثقیلہ کی علامت (ڑ) کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ایک صفحہ پر ہلکے سے کتھئی رنگ میں موٹی موٹی الجھی الجھی کھینچی گئی ہیں جس سے یہ دکھلانا مقصد ہے کہ پورا حصہ قلمزد ہے (ملاحظہ ہو اس صفحہ کا عکس) اس کے بعد کے صفحات پر بھی دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے اس کی ذمہ داری کارپردازانِ مطبع پر نہ ہو۔ یہ اس نسخے کی اپنی روداد ہو۔

مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ صفحہ ۳۴۴ تک جاری رہتا ہے۔ اس صفحہ کے خاتمہ پر "تمت بالخیر" اس طرف اشارہ ہے کہ اب فارسی خطوط کی تحریر۔۔ کا سلسلہ تمام ہوتا ہے آخری خط نواب حسام الدین حیدر کے نام ہے۔ مسطر تیرہ سطری ہے اور شروع سے لے کر آخر تک اس کا اہتمام ملتا ہے کل خطوط کی تعداد ۱۴۱ ہے جو مطبوعہ نول کشور سے ۱۲ خطوں کی حد تک کم ہے۔ صفحہ ۲۵۴ کے آخیر میں صفحہ کے بیشتر حصہ کو محیط خاتمۂ پنج آہنگ ہے جس سے اس کے مسودہ کی فراہمی کے بعض مراحل سامنے آتے ہیں۔ اس وقت غالب کی عمر ان کے اپنے بیان کے مطابق شصت و ہشت (۶۸) سال ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ تحریر ۱۸۶۵ء یا اس کے قریبی زمانہ کی یادگار ہے۔ غالب نے لکھا ہے۔

دریں زماں کہ سنین ہمایوں ہجریہ ہے ہزار و صد و ہشتاد در شمار آید ــــ

پہلا مصرعہ غالب کی اپنی عبارت سے اس طور پر بن سکتا ہے) دریں زماں کہ ہمایوں سنین ہجریہ' غالب نے اس خاصے طویل عرصہ عمر کی جزئی تفصیل اس طور پر پیش کی ہے کہ ۱۶ جزو در بازی و کل ۵۰ دو سخن طرازی گزشت روشہا در نظر فرو آمدہ اور اسی عبارت میں آگے چل کر مزید لکھا ہے دریں بھارت از جزو شانزدہ پنجاہ مراد است ہمانا شمار است و چوں دو سال برآں فزوں گردد ہزدہ سال پنجاہ سال بے برگ راہنجار او رامہ (کذا) سرایان پارس نہ نوا دو نوشتہ ام اکنوں آرزش فروگزاشتہ ام" آگے چل کر اس کا اظہار کیا ہے۔

از دو سال بندہ آں بودم کہ نگاشتہ ہائے گزشتہ را در پایاں فراہم آدم و دیگر درخاتمہ فرسائی انداز خود نمائی فرد ہم۔

اسی اثنا میں منشی نول کشور دہلی آئے اور غالب سے ملاقات کی

روشن دل مہروز آرزم گستر منشی نول کشور نام آور را بدیں ویرانۂ شاہجہاں آباد نام گزر افتاد، وازاں جاکہ درویش نوازی خوے اوست بہ کلبۂ احزان من روے آورد شاد ماینہاے دیدارش را بچشم روشنے گفتم مجموعہ نثرہاے پیش کر ایں صحیفہ یکے ازانہاست، از ال برادر..... نواب خجستہ القاب ضیاءالدین احمد خاں بہادر نیسیج (کذا) گرفت و باخود بہ لکھنو برد تا ایں یکدم نامطبوع را بہ پیرایہ طبع آراید۔"

یہاں نامطبوع سے مراد غیر مطبوعہ نہیں ہے بلکہ غیر پسندیدہ ہے جو از راہِ انکسار ہے اس مجموعہ میں خطوط کی تعداد ایک سو تریسٹھ ہے ___ پنج آہنگ کے بعد مہر نیم روز اور دستنبو کو شاملِ اشاعت کیا گیا ہے مہر نیم روز کے خاتمہ کے بعد تین صفحہ کی فرہنگ اور اسی طرح "دستنبو" کے خاتمہ پر تین صفحے فرہنگ نگاری کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ جبکہ پنج آہنگ کے ساتھ کوئی فرہنگ موجود نہیں۔

پنج آہنگ (مرتبہ وزیر الحسن عابدی)

اسے پنجاب یونی ورسٹی لاہور نے اسے "مطبوعات مجلس یادگار غالب" کے سلسلہ سے وابستگی کے ساتھ شائع کیا ہے اس کا نمبر سلسلہ ۸ ہے اس کے طابع سید اظہار الحسن رضوی ہیں اور مطبع عالیہ ۵ ۱۲/ ٹیمپل روڈ لاہور سے اس کی طباعت میں آئی ہے پہلے سرورق کے بعد پھر دوسرا سرورق ان اندراجات کے ساتھ مذکورہ اشارتوں کے ماسوا، پنج آہنگ کے ذیل میں تکمیل تالیف ۱۸۶۸ اس کے بعد میرزا اسداللہ خاں غالب

پس ازاں

تدوین و تصحیح و تحقیق

سید وزیر الحسن عابدی

ان نگارشات کے بعد مجلس یادگار غالب کے مختلف اراکین کے نام دو صفحوں پر آئے ہیں۔ ایک صفحہ اس کے بعد بالکل خالی چھوڑا گیا ہے اس کے آگے آنے والے صفحہ پر "پیش لفظ" ہے جو پروفیسر علاء الدین صدیقی وائس چانسلر جامعہ پنجاب کا نگارش نامہ ہے۔ پھر ایک سادہ لفظ کے بعد تعارف درج ہے جو پروفیسر حمید احمد خاں صدر مجلس یادگار غالب جامعہ پنجاب رامپور کی تحریر ہے جس کے تحت تحریر و مقام تحریر کے طور پر سینٹ ہال، فروری ۱۹۶۹ء مرقوم ہے بعدہٗ پھر ایک صفحہ خالی ہے یہاں ساری صفحہ پر فہرست مندرجات ہے اس ضمن میں ایک ضروری وضاحت یہ سامنے آتی ہے۔

"توضیح۔ ہر آہنگ کے ذیلی مندرجات میں متعلقہ عنوان کے متعلق صفحۂ آغاز کا شمارہ (کذا) درج کیا گیا ہے۔ آہنگ پنجم میں ہر مکتوب الیہ کے نام کے خطوط اور ہر خط کے صفحۂ آغاز کی نشاندہی کے لیے پہلا ہندسہ خط کا ترتیبی شمارہ اور علامت تعین (:) کے بعد کا شمارہ صفحہ آغاز کا ہے ترتیبی شمارہ مکتوب الیہ کے نام کے خطوط کی تعداد کے لحاظ سے جہاں کسی کے نام ایک ہی خط ہے وہاں صرف مکتوب الیہ کے نام کے مقابل صفحۂ آغاز درج کیا گیا ہے"۔ فہرست صفحہ یار تمام ہوتی ہے۔

دیباچہ مرتب

خاصا طویل ہے اور ۲۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے نگارش و گزارش کا یہ حصہ مرتب کے تحقیقی اور تنقیدی طریق و سائل کا نمائندہ ہے اور اس میں بہت سے اہم مباحث موضوع گفتگو ہیں۔

آغازِ نگارش میں پنج آہنگ کے مختلف مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۱) پنج آہنگ (قلمی۔ کتابت سنہ ۱۲۵۱ھ مطابق سنہ ۱۸۲۵ ؁ شیرانی کلیکشن پنجاب یونیورسٹی لاہور میں محفوظ ہے (حاشیہ)

(۲) پنج آہنگ مطبوعہ اگست ۱۸۳۹ء (مطبع سلطانی قلعہ دہلی میں چھپی تھی ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں ہے۔

[راقم الحروف نے اس اشاعت کا نسخہ مخزونہ غالب انسٹیٹیوٹ دہلی کا مطالعہ کیا ہے اور متن سطور بالا میں اس کا مختصر تعارف بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

پنج آہنگ مطبوعہ اپریل سنہ ۱۸۵۲ء (مطبع دارالسلام دہلی میں چھپی تھی ایک نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں ہے)

[راقم الحروف کے سامنے وہ نسخہ رہا ہے جو دہلی یونی ورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور جس کا زیروکس راقم الحروف کے پاس بھی ہے] [سطور بالا میں اس کا تعارف موجود ہے]

پنج آہنگ مندرجہ کلیات نثر فارسی (قلمی) کتابت ۷، رجمادی الثانی سنہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۷۶۸ء۔ یہاں عیسوی سنہ کے مطابق اندراج میں غلطی ہوئی ہے یا اگر عیسوی سنہ کا اندراج صحیح ہے تو ہجری سنہ ۱۲۸۵ ہجری النبوی ہونا چاہئے۔

پنج آہنگ مندرجہ کلیات نثر فارسی مطبوعہ جنوری ۱۹۶۸ء

پنج آہنگ مندرجہ کلیات نثر فارسی مطبوعہ جنوری ۱۸۷۱ء

مختلف نسخوں کی نشان دہی کے ماسوا جو تحقیقی نقطہ نظر سے کی جانے والی باتیں سامنے آئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

پنج آہنگ کی اوّلین تدوین میں آہنگوں کی ترتیب وہ نہ تھی جو مطبوعہ نسخوں میں ہے اوّلین تدوین ہمیں سنہ ۱۸۲۵ اور سنہ ۱۸۴۰ کے قلمی نسخوں میں ملتی ہے۔

۱۔ نثرہائے داخلِ دیوان

۲۔ نثرہائے خارج از دیوان

۳۔ القاب و آداب

۴۔ مصادر و مصطلحات و لغات

۵۔ اشعار مکتوبی

اس ضمن میں آگے چل کر لکھا ہے " تیسرے آہنگ کے سنہ ۱۸۳۵ء سے پہلے مرتب ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ۔ یہ بات بھی اب تک مجہول یا مبہم رہی ہے کہ رنجور کے اس جملے میں "رنگی نثراز دیوان برچیدہ یک جا کنم" رنگی نثر سے کون سی نگارشات مراد ہیں مرتب نے خود اپنے اس سوال کا جواب دینے کی بھی سعی کی ہے۔

دیباچہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے مکتوب الیہم کے لیے سرنامہ لکھنے میں مکتوبات کی جمع آوری کے موقع پر کیا تبدیلیاں کی ہیں منشی نول کشور کے مطبع اشاعت پزیر ہونے والے نسخہ پنج آہنگ کے لیے غالب نے مختصر خاتمہ لکھا تھا ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۳ء کا اشاعتوں میں خاتمہ نہیں ہے ۔

پنج آہنگ کا دیباچہ آخر تک وہی رنجور کا لکھا ہوا رہا غالب نے پوری کتاب کا کوئی دیباچہ نہیں لکھا تھا چند سطروں کی تمہید ضرور غالب کی لکھی ہوئی ہے جو آہنگ اوّل کی تمہید ہے" : (۱۵)

آہنگ دوم بعد میں بلکہ بھرت پور کے بعد فیروز پور میں لکھا گیا ہے بلکہ بھرت پور کی مہم سے واپسی کے لکھا گیا ہوگا۔ : (۱۵)

جہاں تک خطوط کا تعلق ہے اس کے مشمولات سے متعلق فاضل مرتب نے یہ وضاحت کر دی ہے پنج آہنگ میں غالب نے جو خطوط شامل کیے تھے ہم نے وہی رکھے ہیں دو خطوط جو منشی نول کشور نے سنہ ۱۸۷۱ کی اشاعت میں بڑھا دیے تھے ان کو حذف نہیں کیا۔

دیباچہ سے متعلق نگارشات کا سلسلہ صفحہ ۲۶/۱۱ سطروں کے بعد ختم ہو جاتا ہے تاریخ تحریر ۲۰ اگست ۱۹۶۹ء ہے مسطر ۲۰ سطری ہے اور پوری کتاب (شروع کے چند تعارف ناموں کو مستثنٰی کرتے ہوئے ٹائپ میں چھپی ہے لیکن سرورق اور اس کے مندرجات خوبصورت نستعلیق میں ہیں ۔

عبارت آہنگ چہارم صفحہ ۲۰۰ پر تمام ہوتی ہے اس کے بعد کے صفحہ پر حرف آہنگ پنجم لکھا ہے پشت صفحہ کسی طرح کے اندراجات سے خالی ہے مکتوبات کا سلسلہ صفحہ ۲۰۲ سے شروع ہو کر ۴۰۸ تک کے صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔" اشاریہ کا" کا عنوان نگارش ۴۰۹ پر

ہے اس کے بعد والے صفحے کو سادہ چھوڑ کر ۶۱۱ سے اسمار علائم کا اندراج مزید ۱۰ صفحات کو محیط ہے — جغرافیائی وکتب و مجلات و آثار متفرقہ ۶۲۷ صفحے تک درج کئے گئے ہیں۔ بعد کا صفحہ یہاں بھی سادہ چھوٹا ہوا ہے۔

تعلیقات پنج آہنگ میں دراصل آہنگِ پنجم کے مکاتیب کے زمانوں کے تعین یا ادھوری تاریخوں کی تکمیل کی سعی مشکور عمل میں آئی ہے — اس تخمین و ... سے کام لیے بغیر چارہ نہیں تھا' اور اسی نسبت بعض مواقع پر "تسامح" کا بھی ان کی مثالیں بھی ان صفحات میں نظر فروز ہوتی ہیں۔ صفحہ ۱۲۱ پر اس کے اتمام پذیر ہونے کے بعد ایک سادہ صفحہ سے گزرتے ہوئے تتمۂ تعلیقات پہنچتے ہیں۔ ۷۰۶ پر پنج آہنگ کے قلمی نسخوں کے تر جمے نقل کیے گئے ہیں اور اس نسخہ کی قدر و قیمت میں ایک اہم اضافے کا درجہ رکھتے ہیں۔ صفحہ ۱۴۷ کے بعد طباعتی اغلاط کی چند ضروری تصحیحات دو ضمیموں میں آئی ہیں نشانات شمار درج نہیں۔ اضافات کی تیاری میں اس نسخہ اور اس کے حصۂ تعلیقات سے راقم الحروف نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

پنج آہنگ، آہنگ پنجم کے فارسی خطوط کا ترجمہ

از محمد عمر مہاجر۔ ادارۂ یادگار غالب کراچی

پنج آہنگ کے ۱۶۰ فارسی خطوط کا یہ ترجمہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا لیکن مقبول نہ ہوسکا اس لیے کہ ۲۲ سال کے اس عرصہ میں راقم الحروف کے محدود نظر کا سوال ہے، ایسی تحریریں دیکھنے میں نہیں آئیں جن میں اس ترجمہ کا حوالہ یا اس پر کوئی تبصرہ ہو۔ یہ کتاب ۱۸×۲۲ تقطیع پر طباعت و کتابت کے معقول انداز کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

اس کے ناشر مرزا ظفر الحسن معتمد عمومی ادارۂ یادگار غالب (کراچی) — ہیں اور ماہ و سال اشاعت مارچ سنہ ۱۹۶۹ء اور طباعت — ایجوکیشنل پریس کراچی سے عمل میں آئی ہے — پیش لفظ جس کے — صفحات کی نشاندہی حروف ابجد سے عمل میں

ئی ہے ۔۔۔ سبط حسن صاحب کا تحریر فرمودہ ہے جس کے ساتھ کوئی تاریخ درج نہیں۔
صاحب پیش لفظ نے پنج آہنگ میں شامل خطوط کی جمع آوری اور اس کی مختلف اشاعتوں پر بھی مختصر اً گفتگو کی ہے اور اس سلسلے کے بعض امور پر مولانا غلام رسول مہر کے مرتبہ کتب اردو کی روشنی میں تنقیدی نظر ڈالی ہے جس میں کہیں کہیں وہ فکری انداز بھی شامل ہو گیا ہے جسے خوش قیاسی کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً کلیاتِ غالب کے بیان میں " کلام نامطبوع " سے یہ مراد لینا کہ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں سنہ ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد غالب کی تحریر دوبارہ جمع کرنے لگے تھے۔
یا اسی سلسلے میں یہ خوش گمانی کہ منشی نول کشور نے کلیات نثر فارسی کا یہ مسودہ پانچ سال تک نہ چھاپا اس تاخیر کا سبب غالباً یہ خیال تھا کہ غیر مطبوعہ خطوط زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہو جائیں گے تو کتاب کی اہمیت اور بڑھ جائے گی۔ اگر کلیات نثر میں پنج آہنگ کے مشمول مکتوبات ہی شریک ہوتے تو اس خوش قیاسی کی اہمیت کچھ زیادہ ہوتی۔
بہر حال پنج آہنگ کے اس ترجمہ کا قاری، موضوع کی تفہیم و تحسین کے لیے خود کو فاضل مقدمہ نگاری کی اس نگارش کا مرہونِ منت کرتا ہے۔
مترجم محمد عمر مہاجر کی جانب سے کسی موضوع کے حواشی و تعلیقات اس میں موجود نہیں شروع میں خطوط کی فہرست، صفحات میں دی گئی ہے آخر میں ۸ صفحہ کا اشارہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ مثنوی اشتہار پنج کو اس موقع پر شاملِ اشاعت کر دینا مترجم خطوط کی طرف سے ایک اچھا بر محل اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔۔۔ یہ کہیں ظاہر نہیں کہ ایک سو تریسٹھ خطوط کے اس ترجمہ کی بنیاد کس مطبوعہ یا قلمی نسخہ پر ہے ۔۔۔ مترجم نے پنج آہنگ کی عبارت کے ترجمہ کو خط ۱۶۲ کے ذیل میں درج کیا ہے جبکہ یہ عبارت خاتمہ کوئی خط بہر حال نہیں۔ دیباچہ نگار کا یہ کہنا ہے کہ ان خطوط کی تعداد جو پنج آہنگ کے نول کشوری ایڈیشن میں شامل ہیں اندازے کے مطابق ۱۶۰ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ نول کشوری ایڈیشن پیش نگاہ نہیں ورنہ اندازہ کیوں؟ فاضل دیباچہ نگار سے ایک تسامح اور بھی ہوا اور وہ یہ کہ متفرقات غالب مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کو موصوف نے مولانا امتیاز علی خاں

عرشی سے نسبت دے کر گفتگو کی راقم الحروف کو پنج آہنگ کے خطوط کا ترجمہ کرتے وقت ترجمہ سے استفادہ کا موقع نہیں ملا۔

نامہ ہائے فارسی غالب

مرتبہ سید اکبر علی ترمذی، برائے غالب اکیڈمی دہلی نو، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی، کلکتہ، دہلی مدراس لکھنؤ بنگلور لندن نیویارک

(خط کشیدہ شہر، ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں جہاں ایشیا پبلشنگ ہاؤس کی اشاعتی برانچیں ہیں)

اس سرورق کے بعد پشت صفحہ کی بیاض پیشانی گول دائرہ میں ک کا نشان بنا ہوا ہے اور اس کے نیچے غالب اکیڈمی ۱۹۶۹ درج ہے اور تقریباً نصف صفحہ چھوڑ کر پھر غالب اکیڈمی نظام الدین دہلی کو درج کیا گیا ہے چار بند کے ذیل یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۶، پی ایس جیا سنگھی، ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی برائے غالب اکیڈمی دہلی نو درج ہے۔

"نامہ ہائے فارسی غالب" اس کے اگلے صفحہ کے اندراجات میں ہے اور پس بعد ازاں خالی ہے اور پھر وسط صفحہ میں "نامہ ہا" لکھا ہے۔

اس کے بعد کے صفحہ پر ایک عبارت آئی ہے جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

فہرست مشتملات میں دیباچہ انگلیسی مقدمہ انگلیسی (نیز) نامہ ہا بنام محمد علی خاں، بنام مردمان نامعین بنام اکبر خاں طباطبائی، نامہ نگاری کا یہ سلسلہ ۱۰۱ تک پھیلا ہوا ہے آخری نواب علی اکبر خاں طباطبائی کے نام ہے۔ صفحہ ۱۰۲ سے ۱۲۰ تک ضمیمہ جات پھیلے ہوئے ہیں جن کے ساتھ بعض تحریروں کا عکس بھی موجود ہے۔ ضمیمہ ۳ (۱۱۹) میں یہ عبارت بھی سامنے آتی ہے۔

"..... تا فتح پور بہ توقع وعدہ احمد بخش خاں دراں سفر سرگشتہ آمدن و حجت خود بر احمد بخش خاں تمام کردن واز بیم غوغائے قرض خواہاں واندیشۂ آبروبہ شاہجہاں آباد نہ رفتن و رہ گرائے کانپور گشتن و در کانپور بیمار گردیدن مفصل عرض داشت بندگانِ حضور پر نور معروض و مرقوم است"۔ معروضہ بست و ہشتم اپریل ۱۸۲۸ء۔

اس کے بعد کے صفحات بائیں طرف سے شروع ہوتے ہیں چونکہ اس حصّے کے تمام تر اندراجات انگریزی میں ہیں بالکل شروع میں بائیں طرف غالب کی ایک رنگین تصویر دی گئی ہے سرورق کے اندراجات یہ ہیں۔

دوسرے صفحہ پر غالب اکیڈمی کے حقوق طباعت واشاعت سے متعلق بعض اندراج ہیں اس کے بعد صفحۂ انتساب سے متعلق یہ مختصر عبارت ہے

بعد ازاں خالی حصہ اور پھر قاضی عبدالودود کا پیش لفظ ہے جو کل انیس سطروں کو محیط ہے پھر خالی حصّہ چھوڑ کر ہے جس کا سلسلۂ نگارش سوا تین سو صفحوں تک جا کر ختم ہو جاتا ہے اس پر ترمذی صاحب کے دستخط ہیں اور تاریخ نگارش ۱۴ر جنوری ۱۹۶۹ (نئی دہلی) ہے میں صرف انگریزی رشحاتِ قلم کی نشان دہی کی گئی ہے پھر ایک سادہ صفحہ اور اس سے گزر کر یعنی تصاویر کی فہرست دی گئی ہے پھر ایک بے نگارش صفحہ کے بعد مقدمۂ تعارف نامہ ہے جو خاصا طویل ہے اور چھیالیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے "غالب کے زمانۂ قیام کی اہم تاریخوں کی نشاندہی کرنے والی جدول ہے جو ۱۸۲۸-۱۸۲۹ پر آئی ہے۔ کے عنوان سے کی گئی ہے چھ صفحات کا ہے اور اس سے پیشتر ببلوگرافی سے متعلق صفحات ہیں، ان سب صفحات کی نشاندہی، رومی نشانات شمار کے

وسیلہ سے کی گئی ہے وغیرہ۔ متن کو ذیلی حواشی کے ساتھ چھاپا گیا ہے کتاب کو چھپے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا پھر اب ایسے کتب نادرہ میں شمار کیا جانا چاہئے۔

گل محمد ناطق مکرانوی

ایرانی النسل شاعر اور صاحب زبان فارسی ادیب تھے کافی زمانہ تک لکھنؤ میں قیام پزیر رہے انھوں نے غالب کے ایک فارسی مصرع

موگ شد و پنجہ زدن ساز کرد

(مشمولہ مثنوی) پر یہ اعتراض کیا تھا کہ خوک یعنی خنزیر کے پنجے نہیں ہوتے سُم ہوتے ہیں۔ جس کا جواب غالب نے یہ دیا تھا کہ میں نے خرابوں میں اس بدجانور کو پھرتے ہوئے تو دیکھا ہے اس کے پیروں پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ اگر مثنوی کے چھپنے سے پہلے آپ کا یہ خط مل جاتا تو میں یہ مصرع اس طرح بدل دیتا۔

خوک شد و بد نفسی ساز کرد

پروفیسر مسعود حسن رضوی (مرحوم) نے اپنی مرتبہ کتاب متفرقات غالب میں ناطق کا وہ خط بھی نقل کر دیا ہے (ملاحظہ ہو متفرقات: ۴۱)

مرزا ابوالقاسم خاں مرزا غالب کے کلکتہ کے زمانۂ قیام کے دوستوں میں تھے اصلاً دہلی کے رہنے والے تھے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مرزا غالب نے انھیں فارسی میں جو خطوط لکھے ہیں ان میں بگمان غالب زیادہ جو کلکتے کے دور ورود میں انھیں دستی پرچے کے طور پر بھیجے گئے مرزا ان کی رہائش گاہ پر بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے متفرقات میں ان کا غالب کے لیے کہا ہوا قطعہ اور اس کے جواب میں کہے گئے غالب کے دو قطعے اور غالب کی طرف سے ان کو لکھے جانے والے ۲۰ خط موجود ہیں۔

ملاحظہ ہو متفرقات مقدمہ، خطوط بنام مرزا ابوالقاسم (۱۲۵-۱۰۴)

مرزا احمد بیگ طپاں

ہادی بیگ خاں کے بیٹے تھے ۔ غالب نے زنِ مُہین برادر نواب احمد بخش خاں خویش (بھائی) ظاہر کیا ہے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام اپنے ایک خط میں ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے.

"مرزا احمد بیگ خاں ابن ہادی بیگ خاں را بکلکتہ دریافتم کہ ریختہ
می گفت و تپاں تخلص می کرد و آداب سخن پیوندی از مرزا جان طپش
فرا گرفتہ بود۔ ایں گزیدہ مرد....... برادر زنِ مہین برادر نواب احمد بخش
خاں (مرحوم) بود در مہر پیشگی دل بازباں یکے درشت و مراسم یگانگی بجا
می آورد در فن کلام سادہ گوئی بود بکلکتہ جا ہمندانہ می زیست چار سال
است کہ بآغاز جا خرامیدہ ......"

صدر دیوانی کلکتہ میں مختار تھے نساخ نے لکھا ہے دیوان ان کا نظر سے گزرا انھوں نے کلکتہ سے غالب کی واپسی کے وقت اپنا کلام اور غالباً کچھ حالات غالب کے سپرد کیے تھے کہ وہ دہلی پہنچ کر نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور کے سپرد کریں کہ وہ انھیں اپنے تذکرہ میں شامل کرلیں شیاں (طپاں) مرزا جان طپش کے شاگرد تھے ۔ غالب کے سفر کلکتہ کے دوران ان سے تعلقات بڑھے تھے مرزا نے ان کو جو خطوط لکھے تھے ان میں خاندانی پنشن کی رقم اور مقدمہ کی کوائف سے متعلق گفتگو خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ متفرقات غالب میں ان کی تعداد چھ ہے لیکن کافی تفصیل خط میں غالب نے ایک خط میں ان سے یہ پوچھا ہے کہ انھوں نے دہلی کی سکونت ترک کرکے کلکتہ کو اپنی مستقل قیام گاہ کیوں بنالیا ۔ مولوی سراج الدین احمد خاں کے نام متعدد خطوط میں غالب نے ان کا ذکر بہت احترام اور محبت کے ساتھ کیا ہے اور غالب نے اپنے مذکورہ خط میں اسے چار سال پیشتر کا واقعہ قرار دیا ہے ۔

مولوی سراج الدین احمد

لکھنؤ کے رہنے والے تھے "دبدبۂ سکندری" کے اخبار کی ادارت سے بھی ان کا تعلق تھا اثر ورسوخ والے شخص تھے۔ غالب سے قیام کلکتہ کے دوران تعلقات قائم ہوئے اور بہت جلد دونوں کے مابین رشتۂ یگانگت استوار ہوگیا۔

مرزا غالب نے اپنے اردو فارسی کلام کا ایک انتخاب "گلِ رعنا" کے نام سے انھیں کی فرمائش پر تیار کیا تھا۔ کلکتہ سے واپسی پر مرزا ایک زمانہ تک ان کو خط لکھتے رہے جس میں گوناگوں موضوعات پر اظہارِ خیال کی متنوع مثالیں ان خطوط میں ملتی ہیں۔ مرزا نے قاضی محمد اختر کے تذکرہ میں شمولیت کی غرض سے اپنے حالات بھی انھیں ایک خط میں لکھ کر بھیجے تھے۔ مقدمہ کی روئیداد کا ایک بڑا حصہ ان کے نام لکھے جانے والے خطوط میں آگیا ہے۔

نیز مرزا نے اپنی تصنیف دستنبو کی ایک کاپی منشی شیو نرائن سے کہہ کر اس پتہ پر بھجوائی تھی۔" در لکھنؤ بہ احاطۂ خانساماں متصل تکیۂ شیر علی شاہ بہ مکانات مولوی عبدالکریم مرحوم، بخدمت مولوی سراج الدین احمد برسد" جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد تک زندہ رہے لیکن غالب کے انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء سے پہلے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

اشاریہ۔۱

اشخاص و افراد۔

شہر و دیار ۔

اشاریہ (د)

اخبارات و متفرقات

اشاریہ (الف)

دیار و امصار)

اشاریہ (ب)

کتب و رسائل۔